شہاب

قیمت سالانہ

مرتبہ

محمد عبدالرزاق بسمل

جلد (۱۶) اسفندار ۱۳۵۷ف م جنوری ۱۹۳۸ء نمبر (۴)

محمودیہ مشین پریس چھار مینار میں چھپکر دفتر شہاب حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

غزل

اس غزل کے آخری اشعار قطعہ بند ہیں اور مسئلہ تقدیر اس کا موضوع ہے۔ تقدیر کا مفہوم قرآنی آیات میں بالکل صاف ہے اور ایسے مختلف جو عام عقیدہ ہے

جناب خواجہ عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے

کس قیامت کا یہ ہنگامہ ہے دار و گیر کا
زندگی ہے یا ہے سامان حشر کی تعمیر کا

پہلے تو شعلہ تھا جلکر راکھ آخر ہو گیا
نالہ اب کرتا ہے ماتم آہ کی تاثیر کا

گو نہیں ہے طاقت پرواز بال و پر تو ہیں
رنگ روغن اب بھی اڑتا ہے مری تصویر کا

عالم ہستی میں جو دیکھا عدم میں سن لیا
اب فسانہ ہو گیا ہے خواب کی تعبیر کا

ایک وضع پر نیاز عشق ہے او ر ناز حسن
اک سر تسلیم کی صورت ہے خم شمشیر کا

طالب زر کی پریشانی ہے مثل بوئے گل
اک گداز دل میں جوہر جمع ہے اکسیر کا

پہلے ویرانہ عدم تھا اب تو کچھ آباد ہے
میرے آب و گل میں ساماں کافی ہے تعمیر کا

جسکے سر میں شورش سودا ہے وہ آزاد ہے
نالہ پابستہ نہیں ہے حلقہ زنجیر کا

نامۂ اعمال میں جو تھا گنہ بخشا گیا
رہ گیا ناکردہ مری خجلت تقصیر کا

(قطعہ)

چیکارہ جب بیش و کم اندازہ سے ہوتا نہیں
فتویٰ ناطق یہی ہے قاضی تقدیر کا

ہے مگر مضمر اسی اندازہ میں راز حیات
روح پرور اک نفس ہے باد عالمگیر کا

ایک پیمانہ طلب کرتا ہے تشنہ بحر سے
دخل اس میں کچھ مگر ہے کوشش و تدبیر کا

سن چکا ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ
احتیاج زندگی مضمون ہے اس تفسیر کا

کار فرما عالم ایجاد میں تقدیر ہے
رنگ و روغن ہے یہی اس عالم تصویر کا

آشنائے معنی بیگانہ ہے اختر جو ہے
مدعا کیا ہے خط پیشانی کی تحریر کا

درس ماضی و حال

(بسلسلہ گذشتہ)

جناب محمد ابرار حسین صاحب ایم۔ اے

انہیں مکاتب میں "کنڈرگارٹن کلاس" (بچوں کی جماعت) بھی تھی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں کے بچے پڑھتے تھے۔ حروف تہجی کے پہچاننے اور لکھنے میں جب ہندو بچوں کو دشواریاں پیش آئیں تو اکبر اعظم نے آسان تر طریقہ ایجاد کرکے مکاتب میں نافذ کیا۔ چنانچہ آئین اکبری جلد اول دفتر دوم "آئین آموزش" میں علامہ ابوالفضل مرحوم نے لکھا ہے۔

بہ فرمودہ گیتی خداوند حروف ابتث (ا۔ ب۔ ت۔ ث) برنوشتہ دو دیگر پیکر را بد النسان نگارند۔ نخست بصورت و نام آشنا گردند۔۔۔۔ دو روز بر و زبر پیش کنند کہ از نقوش پیوستہ (یعنی مرکب) آگہی برگیرد۔۔۔۔۔ کوشش رود کہ ہر ایک را (نو آموز) خود۔ بشناسد واندکے استاد دستگیری کند"

(ترجمہ) حسب ارشاد خداوندی حروف ابتث (ا۔ ب۔ ت۔ ث) لکھے جائیں اور انہیں کے اعتبار سے تصویریں بنا دی جائیں۔ اول صورت اور نام سے واقف کئے جائیں۔ دو روز کے بعد مرکب نقوش سے آگہی حاصل کریں۔۔۔۔ کوشش یہ ہو کہ ہر ایک بچہ خود پہچانے البتہ استاد کچھ رہنمائی کرتا رہے۔

اس فرمان اکبری میں نہ صرف بچوں کے لئے صحیح نصاب کی تدوین کا حکم دیا گیا بلکہ اساتذہ کو بچوں کے نفسیات کے ابتدائی اصول سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے۔ روشیو (   ) کا یہ قول کہ بچوں کو (۱۲) سال کی عمر تک کچھ نہ پڑھایا جانا چاہیئے۔ یہ نہ صرف مضحکہ خیز ہے بلکہ اس بات کا بھی پتہ دیتا ہے کہ بچوں کے نفسیات سے وہ کس قدر بیگانہ تھا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا

درختے کہ اکنون گرفت است پائے
بہ نیروئے شخصے برآید ز جائے
دگر ہم چنان روزگارے برہمی
بہ گردونش از بیخ نگسلی

بچون کی حمایت کے لئے یہ طریقہ اسقدر کامیاب ہوا کہ بقول ابوالفضل مرحوم اس طریق سے بچہ جو کچھ برسوں میں سیکھتا وہ مہینوں اور دنوں میں سیکھ جاتا تھا اور اس سے مدرسوں اور مکتبوں کی زونق دوبالا ہو گئی اور روز افزوں ترقی ہوئی فارسی کے درسیات علامہ ابوالفضل مرحوم نے "آئین آموزش" ہی مین درسیات سے بھی باعتبار فنون کے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ حسب ذیل علوم و فنون درسیات مین داخل تھے۔

اخلاق - حساب - سیاق - فلاحت - مساحت - ہندسہ - انجینیری نجوم - رمل - تدبیر - منزل - سیاست مدن - طب - منطق - طبیعی - ریاضی - الہیات - تاریخ - مرتبہ مرتبہ اندوزد - واز ہندی علوم دیاکرن - نیائے - ویدانت - پاتنجل - برخواند -"

اس اجمالی نصاب سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ اس مین ملکی ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا - حتیٰ کہ کاشتکاری کے فن کو بھی داخل نصاب کیا گیا تھا جس کا نام "فلاحت" رکھا اسکے علاوہ ہندوستان کے ان قدیم علوم کو بھی داخل کیا گیا تھا جو ضروری تھے یہ نصاب اکبری عہد کے تعلیم اور درسیات کا پتہ دیتا ہے اس کے بعد وقتاً فوقتاً تبدیلیاں عمل مین آئین جن کے متعلق تاریخ خاموش ہے - قدیم درسیات مین ایک خامی کا عام طور پر پتہ چلتا ہے اور وہ فن تاریخ کا داخل نصاب نہ ہونا فن تاریخ کا نہ تو فارسی درسیات مین کہین کچھ ذکر ہے اور نہ عربی درسیات مین - جس سے سب سے بڑی خرابی ہندوستان کی قومیت مین یہ پیدا ہوئی کہ یہاں کے لوگ اپنی تاریخ سے نابلد رہے اور اسکی وجہ سے جو سمز وریان اون مین پیدا ہوئین وہ مثل روز روشن عیان ہین - یہ عجیب لطف ہے کہ اسلامی تصانیف مین قطع نظر علوم فقہ و حدیث و منطق وغیرہ فن تاریخ پر مکمل

ذخیرہ مورخین نے چھوڑا ۔ مگر لصاب کے تدوین کرنیوالوں نے معلوم اس فن سے کیوں چشم پوشی کی اسیطرح سے ہندوستان کے تاریخ پر بھی یہاں کے مورخین نے بہت کچھ لکھا لیکن نصاب فارسی و عربی میں یہاں بھی وہ معدوم ہے ۔ کشمیر کے علم پرور بادشاہ سلطان زین العابدین نے جس نے کم وبیش (۵۰) سال تک کشمیر پر سلطنت کی اور جس کی توجہات سے کشمیر مرکز صنعت و حرفت و علوم بنا ۔ کشمیر کی مفصل تاریخ پنڈت "کلہانا" سے لکھوائی جس کا نام " راج ترنگنی " رکھا گیا اور جس کا انگریزی میں ترجمہ کئی مجلدات میں کیا گیا ہے ۔ بہرحال یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے تاریخیں یا وقعات مختلفہ نہیں لکھی گئیں بلکہ اسکے برعکس اس میں کافی ذخیرہ موجود تھا اور ہے جو بالعموم فارسی میں ہے اور مستند ہے لیکن تعجب ہے کہ درسیات میں اسکو داخل نہیں کیا گیا ۔ اسکے علاوہ اس زمانہ کے مورخین نے باوجود انتہائی محنت اور کاوش کے ایسی تاریخیں ہمارے لیئے نہیں چھوڑیں جس سے ہم اس زمانہ کے درسی تنظیم کا پتہ چلا سکیں ۔ البتہ جستہ جستہ تذکروں یا مختلف ذریعوں سے اجمالی طور اکبری عہد کے بعد کے درسیات کا پتہ چلتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ درسیات سے فنون گم ہوتے گئے ۔ البتہ ۔ انشاء ۔ ادب اور اخلاقیات کی حیثیتہ کتابیں درس میں نہ صرف رہتے دیکھی گئیں بلکہ ان میں اضافہ بھی کر دیا گیا تھا چنانچہ حسب ذیل نصاب بالعموم رائج تھا

نثر میں ۔

دستور الصبیان ۔ انشاء مادھورام ۔ رسالہ عبدالواسع ۔
انشاء خلیفہ ۔ رقعات عالمگیری ۔ گلستان ۔ ابوالفضل ۔
بہار دانش ۔ انوار سہیلی ۔ سہ نثر ظہوری ۔ وقائع نعمت خان عالی
چہار مقالہ وغیرہ وغیرہ ۔

نظم میں ۔

کریما ۔ مامقیمان ۔ خالق باری ۔ بوستان ۔ زلیخا ۔
سکندر نامہ ۔ قصائد عرفی ۔ بدر چاچ وغیرہ وغیرہ ۔

ان کتابوں سے انشاء و ادب بھی آجاتا تھا اور اخلاق کا بھی سبق ملتا تھا بعض ایسی بھی

سکتا ہیں تھیں جو ادبیت کے ساتھ فنون کی بھی تعلیم دیتی تھیں۔ اسکے ساتھ ہی وہ بچے جو آیندہ عربی پڑھنی چاہتے تھے اون کو قواعد عربی اور منطق کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جو فارسی کے لباس میں تھیں۔ جہانتک فارسی کا تعلق تھا یہ مکاتب اور اون کے مدارس اپنے شاگردوں کو فارسی میں کامل کرنے تھے سند دینے کا رواج مکاتب میں قطعاً نہیں تھا۔ البتہ بعض مدارس میں اس حدتک تھا کہ استاد کامل اوس طالبعلم کو جو جملہ درسیات مقررہ ختم کر لیتا تھا۔ سند اجازت دیدیتا تھا جس میں نہ صرف یہ لکھا ہوتا تھا کہ "تم کو تدریس اور تبلیغ علم کی اجازت دیجاتی ہے کیونکہ تم اسکے اہل ہو" بلکہ استاد اپنے سلسلہ سند میں بھی اسطرح سے ظاہر کرتا تھا کہ وہ گویا "اسنادی شجرہ" ہوتا تھا۔ یہ دونو قسم کے شاگرد بخلاف موجودہ زمانہ کے اپنے تعلیم کے نسبت استاد کی طرف کیا کرتے تھے نہ کہ مدرسہ کی طرف۔ یعنے یہ کہ فلاں اوستاد سے اس نے استفادہ کیا۔ استاد کی شہرت شاگردوں کی اہلیت اور قابلیت کا معیار ہوتی تھی

مدارس عربی۔ مکاتب کی کسی خاص تنظیم کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ ممکن ہے کہ غیر معمولی تجسس سے اس کا بھی کچھ پتہ چل جائے۔ جسکے لئے میں بشرط فرصت کوشش کرونگا البتہ مدارس عربی کے تنظیم کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ یوں تو تعلیم و تعلم کا سلسلہ زمانہ ما قبل التاریخ سے چلا آرہا ہے۔ اور جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا علوم وفنون نے حسب ضرورت ترقی کی۔ چنانچہ بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں ہم جسقدر تصانیف پاتے ہیں اون سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ علوم کا کسقدر چرچہ تھا۔ ممکن ہے کہ مدارس کی یہ تنظیم یہ ہو۔ جو بعد میں ہوئی۔ لیکن مدارس کا وجود ضرور تھا۔ البتہ صحیح معنوں میں جہانتک تاریخ سے پتہ چلتا ہے تنظیم مدارس کی بنیاد جس کا نقش ثانی موجودہ زمانہ کے کالج اور اسکول میں بقول علامہ جلال الدین سیوطی رح پانچویں صدی ہجری کے آخر میں نظام الملک طوسی وزیر دولت سلجوقیہ ترکیہ نے ڈالی چنانچہ علامہ موصوف رح نے اپنے محاضرات میں لکھا ہے۔

یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے طالبعلموں کیلئے مدارس کی بنیاد ڈالکر رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام کیا وہ نظام الملک طوسی تھا۔ یعنے سب سے پہلے اس نے عراق (بغداد) میں اسکی بنا ڈالی۔

شہاب
نظام الملک طوسی وزیر کبیر اور فخر دولت سلجوقیہ ترکیہ تھا۔ جس نے بغداد میں ۴۵۹ھ
میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا جو زمانہ قدیم کے مسلمانوں کا زبردست کالج یا یونیورسٹی تھا
عرب ممالک کے لئے یہ جامع اور مکمل تنظیم رہنما ثابت ہوئی۔ اور نہ صرف عراق میں
اسکی تقلید کی گئی بلکہ جملہ ممالک اسلامی میں تنظیم کا یہ بہتر علمی و تعلیمی طریقہ اختیار کیا گیا
چنانچہ دمشق میں صلاح الدین اور نور الدین شہید کے عہدوں میں مدارس کی تنظیم بقول
مورخین اپنے عروج پر تھی۔ اور مدرسین اور متعلمین دونوں دوران تعلیم و تعلم میں ذریعہ
معاش سے بے نیاز رہتے تھے۔ کیونکہ حکومت یا افراد کی طرف سے انکی معاش کا
پورا پورا انتظام ہوتا تھا۔ اس تنظیم میں آئندہ جبکہ یہ ترمیم کی گئی کہ ہر فن کے مدارس
علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ جس کو موجودہ زمانہ میں (پوسٹ گریجویٹ سسٹم) کہتے ہیں۔
چنانچہ صرف دمشق میں سات مدارس تعلیم قرآن کے لئے تھے۔ جس میں قرآن
تجوید اور تفسیر کا درس ہوا کرتا تھا۔ (۱۸) مدارس حدیث کے تھے۔ جس میں حدیث کا
درس ہوا کرتا تھا۔ اور (۵۷) مدارس فقہ کے تھے جن میں فقہ شافعی پڑھائی جاتی تھی
اسکے علاوہ مدارس فقہ حنفی۔ مدارس فقہ مالکی۔ مدارس فقہ حنبلی مدارس طب بھی تھے
علوم ریاضی فلسفہ اور طبیعات وغیرہ کا انتظام ان مدارس میں نہیں تھا۔ بلکہ اسکے لئے علیحدہ علیحدہ
انتظام تھا جو طالب علم ان علوم کو بھی پڑھنا چاہتے تھے وہ وہاں جا کر استفادہ کیا کرتے تھے
یہ جملہ مدارس صرف حکومت ہی کی طرف سے نہیں تھے بلکہ بیشتر مدارس ہمدرد ذی حیثیت افراد کے
قائم کردہ تھے اور سب میں تعلیم عام اور مفت تھی۔ یہاں تک کہ رہنے سہنے اور کھانے
پینے کا انتظام بھی بانئ مدرسہ کی طرف سے ہوتا تھا خواہ وہ حکومت یا افراد ہوں تفصیل کا
محل نہیں ورنہ ہر ایک مدرسہ کا نام۔ تاریخ بنا اور بانی کا نام بھی لکھ دیا جاتا۔ یہ مشتے
نمونہ صرف ایک خطہ کے تدریسی تنظیم کا اجمالاً حال بیان کیا گیا ہے۔ مصر و تونس۔ الجزائر
مراکو اور زوال یافتہ اسپین قریب قریب اس تنظیم کے حامل تھے۔ مراکو کی بربری حکومتیں
موحدین کی حکومت ترویج علوم اور تنظیم مدارس میں پیش پیش تھی بخارا اور غزنی
اپنے عروج کے زمانہ میں مرکز العلوم تھے۔ جن کے فیوض سے گرد و پیش کے ممالک
جس میں ہندوستان بھی داخل ہے فیضیاب ہوئے۔

مدارس ہندوستانی | چونکہ ہمیں ہندوستان کے قدیم طرز تدریس و تعلیم کو بیان کرنا ہے اسلئے دوسرے ممالک کی تعلیمی تنظیم پر تمہیداً اجمالی تبصرہ کیا۔

یہ میں ابتداً عرض کر چکا ہوں کہ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ورنہ فی الحقیقت یہ وہ موضوع ہے کہ جسکی جزیات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالنی چاہیئے۔ لہذا ہندوستان کے اسلامی درسگاہوں پر بھی اجمالی طور پر جو نسبتاً تفصیلی ہوگا تبصرہ کرونگا ۔

یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ درسیات کی کوئی اور قدیم مکمل تاریخ ہماری نظر سے نہیں گزری جس سے کم از کم ہندوستان کے مشہور اور بڑے بڑے مدارس کے متعلق تفصیلی طور پر معلومات بہم پہنچ سکے ۔ البتہ زمانہ حال کے علماء میں سے بعض حضرات نے اس کا تجسس کیا اور جو مواد فراہم ہو سکا اس سے درسیات ۔ طریق تعلیم اور تنظیم تدریس کا پتہ چلایا ۔ مولانا حکیم سید عبدالحئی لکھنوی مرحوم نے بھی اس موضوع پر کچھ لکھا لیکن اس سے زیادہ محنت اور کاوش بہ عنوان " ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں " مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم نے ایک سلسلۂ مضامین لکھا جسکو کتاب کی شکل میں حال ہی میں دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شائع کیا ہے لیکن باوجود انتہائی کاوش کے موضوع کچھ بھی تشنہ رہا اور رہنا چاہیئے بھی تھا کیونکہ جس حد تک مرحوم کو مواد مل سکا اونہوں نے انتہائی مفید چیز ہمارے سامنے پیش کر دی ۔ اب ہمارا فریضہ ہے کہ اسکی رہنمائی میں ہم مزید تجسس کر کے مکمل چیز دنیا کے سامنے پیش کریں ۔

ہندوستان کا کوئی شہر حتیٰ کہ بعض صوبوں کا کوئی ایسا قصبہ نہیں تھا جہاں مدارس موجود نہیں تھے اور جس میں باکمال اوستاد درس نہیں دیتے تھے ۔ اگر ان مدارس اور مدرسین کی فہرست لکھی جائے تو اسکے لیئے صفحہ کے صفحہ درکار ہونگے بہر خال ہر درسگاہ بذات خود اپنے مشہور اساتذہ کی وجہ سے یونیورسٹی کا مرتبہ رکھتی تھی ۔ جہاں طلباء کی نہ صرف باقاعدہ تعلیم کا انتظام تھا بلکہ قیام و طعام کا بھی انتظام تھا ۔ اسلیئے کہ ہر مدرسہ میں مقامی طلباء کے علاوہ بکثرت بیرونی طلباء دور و دراز مقامات سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے علم کے ذوق میں آکر شریک درس ہوتے تھے اور زمانہ درس کو ختم کر کے جو ایک حد تک طویل ہوتا تھا کامیاب اور کامران واپس جاتے تھے ۔ دہلی سے بعد جو صحیح معنوں میں مرکز العلوم تھا ۔ خطہ اودھ کو بالخصوص علمی تفوق حاصل تھا ۔ جس کے بیشتر قصبات علماء کے ملجا و ماویٰ تھے ۔ اور جہاں درس و تدریس کی گرم بازاری تھی

جس میں خصوصیت سے قصبات سہالی ۔ خیرآباد ۔ گوپامو ۔ دیوا ۔ جائس
سندیلہ ۔ بلگرام قابل ذکر ہیں ۔ دہلی میں اون مدارس کے اب بھی آثار موجود ہیں
جو ہر حیثیت سے مکمل تھے ۔ چنانچہ جس عمارت میں آج کل عربک کالج ہے
وہ قدیم مدرسہ ہے ۔ جسکی بنیاد محمد شاہ مرحوم کے عہد میں امیر غازی الدین
خان فیروز جنگ بہادر مرحوم نے ڈالی تھی جو نواب آصف جاہ بہادر اول مرحوم کے
والد بزرگوار تھے ۔ اس مدرسہ کا طرز تعمیر اب بھی اس کا پتہ دیتا ہے کہ وہ ہر
حیثیت سے مکمل مدرسہ تھا ۔ جس میں طلباء کے قیام و طعام کا انتظام بدرجہ اتم تھا
ممالک محروسہ سرکار عالی میں بیدر کے مدارس بالخصوص مدرسہ محمود گاوان مرحوم
وہ مشہور اور منظم مدرسہ تھا جسکی مثال نہیں ملتی ہے ۔ اسکے علاوہ مدارس گلبرگہ ۔ قندہار
دولت آباد اور مدرسہ چہار مینار حیدرآباد بھی اپنی فیض رسانی کا ڈنکا بجا چکے ہیں
مدراس میں نواب والا جاہ بہادر مرحوم نے جو اس مردم خیز قصبہ گوپامو (اودھ) کے
علم پرور خاندان کے فرد تھے ۔ جس گھرانے میں صدیوں علم نے ثروت کی اور ثروت نے
علم کی پاسبانی کی ۔ مدرسہ قایم کیا تھا جس میں ملا بحر العلوم جیسے یگانہ روزگار
درس دیا کرتے تھے ۔

ان مدارس کے علاوہ جو حکومت کی سرپرستی میں تھے بیشتر مدارس وہ تھے
جنکی یا تو امراء سلطنت سرپرستی کرتے تھے یا اور مشہور علماء خود سرپرست ہوتے تھے
اور حکومت اون کو اس حد تک معاش سے بے نیاز کر دیا کرتی تھی کہ وہ مدرسہ کے جملہ اخراجات
سے خود ہی کفیل ہوتے تھے ۔ صنعت و حرفت کے اگرچہ اوس قسم کے منظم مدارس نہیں تھے
لیکن کاریگروں اور صناعوں میں بھی استادی اور شاگردی کی وہی پابندیاں تھیں
جو مدارس میں تھیں ۔ حکومت ان کاریگروں اور صناعوں کی بھی سرپرستی کرتی تھی ۔
اور ان کے پاس بھی شاگردوں کا مجمع رہتا تھا اور وہ اپنے استادوں کی رہنمائی میں
کامل بنتے تھے ۔

ہندوستان کی کاریگری کے لیے مثال کی ضرورت نہیں ہے ۔ کیونکہ عیاں را چہ بیان
بے شک وہ لوگ کتابی علمیت سے بے بہرہ ہوتے تھے ۔ لیکن عملیات میں وہ استاد کامیاب
ہوتے تھے ۔ جس کی ضرورت تھی ۔

درسیات قدیم | قدیم نصاب تعلیم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں جملہ فنون اور ادب کی اصولی کتابیں رکھی جاتی تھیں ۔ درس نظامی کی تدوین سے قبل جو آجکل بھی مدارس عربیہ میں جاری ہے ۔ حسب ذیل علوم و فنون میں درس ہوا کرتا تھا ۔

۱ ۔ نحو ۔ کافیہ ۔ لب الالباب ۔
۲ ۔ فقہ و اصول فقہ ۔ ہدایت ۔ منار ۔
۳ ۔ تفسیر ۔ مدارک ۔ بیضاوی ۔ کشاف ۔
۴ ۔ حدیث ۔ مشارق الانوار ۔ اور مشکات مصابیح ۔
۵ ۔ تصوف ۔ عوارف ۔ فصوص الحکم ۔
۶ ۔ ادب ۔ مقامات حریری ۔
۷ ۔ منطق ۔ شرح شمسیہ ۔
۸ ۔ کلام ۔ شرح صحائف ۔

اس نصاب میں وقتاً فوقتاً ضروریات کے اعتبار سے نہ صرف کتابوں کا اضافہ ہوتا گیا ۔ بلکہ فنون کا بھی اضافہ ہوا ۔ اقلیدس بھی پڑھائی گئی ۔ اور فلسفہ کو بھی داخل کیا گیا ۔ ان تمام فنون کی وہ کتابیں رکھی جنکے پڑھنے سے طالب علم میں نہ صرف قوت مطالعہ پیدا ہو جاتی تھی بلکہ حقیقتاً بعد فراغت علوم جس وقت وہ میدان عمل میں آتا تھا تو وہ ان علوم کا مالک ہوتا تھا ۔ اس میں وہ استعداد ہوتی تھی کہ وہ علوم و فنون میں جدت طرازیاں کر کے نئی نئی تصانیف دنیا کے سامنے پیش کیا کرتا تھا ۔ درس نظامی جو ملا نظام الدین علی فرنگی محلی مرحوم کا ترتیب دیا ہوا ہے وہ قدیم درسیات کا نقش ثانی ہے ۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ درسیات قدیم میں فن تاریخ کو مطلقاً جگہ نہیں دی گئی ممکن ہے کہ اس فن کو مطالعہ کے لئے رہنے دیا گیا ہو ۔ اور اسوجہ سے اسکو درسیات میں داخل نہ کیا گیا ہو ۔ بہر حال کچھ ہو درسیات قدیم میں فن تاریخ کا داخل نہ کیا جانا تعجب خیز اور افسوسناک ضرور ہے ورنہ تاریخ سے قطع نظر کر کے نصاب کے کامل ہونے میں شبہ نہیں ہے یہی وہ نصاب ہے جس نے منتخب ہمارا اس سرزمین پر

پیدا کئے ۔ اور جنکی فاضلانہ تصانیف نے آج تک اون کو زندہ جاوید کر رکھا ہے
میں اس موقع پر یہ ضرور عرض کرونگا کہ جس طرح سے زمانہ سلف میں نصاب میں ترمیمات
ہوتی رہیں اور بہ مقتضاء ضرورت اس میں اضافہ کیا گیا ۔ اسطرح سے موجودہ زمانہ میں
بھی اس عربی نصاب میں بہ مقتضاء وقت ترمیم اور اضافہ کی ضرورت ہے ۔ یہی سبب
ہے کہ اب ایسے افراد عالم بتجر نہیں نکل رہے ہیں ۔ جن کی زمانہ حال کو ضرورت ہے
طریق تدریس قدیم | زمانہ قدیم میں تدریس کا جو طریق اختیار کیا گیا تہا اوس سے
طالب علم میں استعداد پیدا ہوتی تھی ۔ اور وہ یہ تھا کہ ہر طالب علم کے لئے لازم تھا
جو وقت درس کے لئے آئے تو پورا تیار ہو کر آئے ۔ یعنے اپنی آیندہ سبق کا مکمل طور سے
مطالعہ کر کے ۔ مطالعہ کرنے کا معیار یہ تھا کہ اوستاد موجودہ زمانہ کی طرح سے کتاب کو خود
پڑھکر لکچر نہیں دیا کرتا تھا ۔ بلکہ جس طالب کو اوستاد حکم دیتا تھا وہ کتاب پڑھتا تھا
جسکو عرف عام میں قرءت کہتے تھے ۔ اور ہیں ۔ اور اوستاد ترجمہ نہیں بلکہ تقریر
کر دیا کرتا تھا اس سے دو فائدے تھے ایک یہ کہ طالب علم میں مطالعہ کی قوت
بڑھتی تھی جو اوسکے استعداد میں اضافہ کرتی تھی ۔ دوسرے یہ کہ جو استاد تقریر کرتا تھا
اوس پر شاگرد استفادتاً رد و قدح کر کے مفہوم کو اچھی طرح سے سمجھتا تھا ۔ اسکے
علاوہ طلباء میں مطالعہ کی عادت ہو جاتی تھی ۔ جو آگے چل کر اون کو صحیح معنوں میں
عالم بناتی تھیں ۔ اور ان کے دماغ اور حافظہ کو روشن اور قوی کرتی تھی ۔ اگر
کوئی طالب علم مطالعہ نہیں کرتا تھا اور اتفاقاً اس کو قرءت کرنی پڑتی تھی تو عبارت
ہی میں غلطیاں کیا کرتا تھا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اسکو تنبیہ و ہدایت کیجاتی تھی
دوسرے طالب علم سے قرءت کرائی جاتی تھی ۔ موجودہ زمانہ میں یہ طریقہ مسدود ہے
بلکہ استاد اپنے سامنے اگر ادبیات کا سبق ہے کتاب رکھہ لیتا ہے اور پڑھکر اوس پر
لکچر دیتا ہے ۔ اگر فنون کا سبق ہے تو نوٹ لکھا دیتا ہے یہ امتحان میں کامیاب
کرا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے ۔ استعداد سے کچھ بحث نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ
باوجود امتحان کامیاب کرنے کے طلباء میں صحیح معنوں میں استعداد نہیں ہوتی ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصاب کی خامی سے طالب علم میں خامی ہونا ضروری نہیں ہے
بلکہ طریقہ تدریس سے اس میں خامی پیدا ہوتی ہے ۔

مدرس و متعلم قدیم | زمانہ سلف مین استاد و شاگرد مین باپ اور بیٹے کا صحیح معنون مین تعلق ہوا کرتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ استاد محبت و محنت سے اوسکو درس دیا کرتا تھا۔ اور شاگرد بیٹے کیطرح استاد کی اطاعت و خدمت کیا کرتا تھا۔ جس شاگرد نے استاد کی اطاعت سے ذرا بھی انحراف کیا جسکی مثالین شاذ ملتی ہین تو وہ استاد کے فیض سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اگرچہ شاگردون کی تعداد زمانہ سلف مین بھی کچھ کم نہ ہوتی تھی۔ بلکہ بہ اک وقت پچاس طالب علم درس لیا کرتے تھے۔ لیکن ہر شاگرد استاد کو اپنا باپ اور ہر استاد ان تمام شاگردون کو اپنی اولاد کی طرح سے سمجھتا تھا۔ اور اسی قسم کا برتاؤ کرتا تھا۔ آداب کا اس قدر لحاظ کیا جاتا تھا کہ استاد کے مواجہ مین بڑا سا بڑا شاگرد بھی ناقابل توجہ بے ادبی نہین کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ استاد کی شفقت شاگردون کو پدرانہ شفقت سے بے نیاز کر دیا کرتی تھی۔ ادھر شاگرد کی اطاعت استاد کو اولاد کی فرمان برداری بھلا دیتی تھی۔ یہہ ایسی چیز نہین ہے جو محض کتابون مین منقول ہو بلکہ اب بھی ایسے افراد باقی ہین جو اس قسم کی شاگردی اور استاد کی زندہ مثال ہین یہہ اطاعت اور یہ محبت حصول علم مین معاون ہوتی تھی۔ بخلاف زمانہ موجودہ کے اگر ایک طرف شاگرد مین اطاعت مفقود تو استاد مین محبت کا فقدان۔

شاگرد فیس دیکر پڑھتا ہے لہذا استاد کا پدرانہ حق مسلوب۔ استاد مقررہ وقت کا معاوضہ پاتا ہے جسکے لئے وہ پڑھانے پر مجبور رکھنے لہذا فرض ادا اور پدرانہ حق مفقود۔ غرض کہ نہ استاد کے استادی کی کچھ وقعت ہے اور نہ شاگرد کے شاگردی کی کچھ اہمیت۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود عمومی تعلیم کے جس مین اخلاقیات اور مذہبیات بھی داخل ہین اخلاق اور محبت کا کوسون پتہ نہین چلتا اسکی ذمہ داری بیشتر اساتذہ پر اس سے کم لڑکون کے ورثا پر اور اوس سے کم شاگردون پر۔

مین یہ پہلے عرض کر چکا ہون کہ موضوع بہت طویل ہے جو وقت اور محنت چاہتا ہے لہذا مین آئندہ مختصر کر کے اپنے موضوع کو ختم کرتا ہون لیکن زندہ حیات اور موقع اس پر شرح وبسط سے لکھکر آپ حضرات کے سامنے پیش کرونگا

ــــ: دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہیگی: ــــ

جناب سلطان عادل خان صاحب

وہ شہر کا مشہور غنڈہ شریف ماں باپ کا رذیل بیٹا ۔ دل کے بیٹ کا شیطان اور نہ جانے کن کن خصوصیات کا حامل تھا اون کے والد جنکو مرے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا خدا ترس آدمی اور بڑے پکے نمازی تہے ۔ ان کا شنا ید ایسا دن جاتا ہوگا جس دن اونہوں نے پانچ وقتہ نماز کے علاوہ ہزاروں نفلیں نہ پڑھیں ہوں بڑے پرہیزگار آدمی تھے ۔ ساری دنیا کو تعجب تھا کہ یعقوب ایسے اچھے گہرانے کا کیسے پیدا وار ہو سکتا ہے ۔ دوسری طرف یعقوب کا چھوٹا بھائی ذکی بہت نیک اور متین تھا اور اپنے بھائی کا بالکل ضد ایک آگ تھا تو دوسرا پانی ۔ ایک اندھیرا تھا دوسرا اجالا ۔ ایک کالا تھا تو دوسرا سفید اون میں کچھ بھی تو مشترک نہ تھا ۔ سگے بھائیوں میں تو کچھ نہ کچھ شباہت ہوتی ہی ہے ۔ لیکن ان دونوں میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی جو یہ ظاہر کرتی کہ وہ دونوں بھائی بھائی ہیں ۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ دونو ایک دوسرے کے عزیز تھے ۔ ان دونوں میں برادرانہ محبت انتہائی درجہ پر تھی رہا یعقوب کے کردار کا مسئلہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یعقوب پیدائش کے وقت بجائے دوسری جگہ تولد ہونے کے بھٹک کر حاجی اللہ بخش مرحوم کے مکان میں تولد ہو گیا ۔ خود فرشتے اس پر انگشت بہ دندان تھے کہ دیکھیں یعقوب دنیا کے اسٹیج پر کس قسم کے کردار کا حامل ثابت ہوتا ہے اور ایسی غلط امتزاج میں اللہ میاں کی کیا مصلحت ہو ۔ حاجی اللہ بخش کی وفات کے بعد ان دونوں بچوں کی تربیت کا بار اونکی والدہ پر پڑا ۔ حاجی صاحب چونکہ غریب آدمی تھے اسوجہ یعقوب کی والدہ نے بچوں کو جلد جلد نوکر ہونے میں لگا دیا ۔ یعقوب ایک کارخانہ میں مزدور ہو گیا لیکن ذکی کی قسمت اچھی تھی وہ ایک دفتر میں کلرک تھا ۔ یعقوب چین سے کام کر لیتا تو اپنی عاقبت بھی اچھی کر لیتا اور دنیا بھی ۔ لیکن آوارگی نے اوسے چین سے بیٹھنے نہ دیا جیا کچہ وہ

کارخانہ سے ساڑھے تین سو روپیہ کی تھیلی اڑاکر فرار ہو گیا۔ لیکن قبل اسکے کہ وہ اوس میں سے کچھ خرچ کرے گرفتار ہو گیا۔ جرم سنگین تھا لیکن چونکہ اوس نے کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا تھا اسلئے اوسے نوکری سے برطرف کرنے ہی پر اکتفا کیا گیا

اب بعقیرہ بیکار ہو گیا اوسے اپنے تعیشات پورا کرنیکے لئے روپیہ چاہئے تھا۔ لیکن وہ روپیہ کہاں سے لاتا لاچار ہو کر اوس نے غنڈہ گردی شروع کردی۔ وہ ہر ایسے جھگڑے کو شہ دیتا۔ جس میں اوسے اپنے فائدے کی امید ہوتی وہ چوری کرنا قتل کرنا اور پیسہ کے معاملہ میں ہر چیز کو جائز سمجھتا تھا۔ حتی کہ جب فرقہ واری فسادات کی مذموم آگ ہندوستان میں پھیلنے لگی تو اوس نے اسے بھی اپنی منفعت کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ وہ آگ لگانے لگا۔ چھرے گھونپنے لگا لیکن کس لیے صرف پیسہ کی خاطر اپنے نفس کو تسکین دینے کے خاطر اسے اس بات کی کوئی فکر نہ تھی کہ جسے وہ قتل کر رہا ہے وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اوسے پیسے سے کام تھا ذات سے نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اگر شہر میں امن نہ ہو جاتا تو بھی وہ جان توڑ کوشش کرتا کہ کسیطرح اس ٹھنڈی ہونے والی آگ کو بھڑکا دے تازہ کردے اور اپنا پو بارہ کر دے۔

عموماً ہوتا بھی ایسا ہے کہ لوگ اپنے فائدہ کی خاطر شہر کے چند غنڈوں کو اکساکر فساد کروا دیتے ہیں۔ لیکن وہ روسیاہ اور بدبخت اتنا نہیں سمجھتے کہ جو کچھ یہ ہو رہا ہے اوس میں بیگناہ بیکس اور مجبور لوگوں کی جان و مال کو نقصان پہونچتا ہے۔ اون لوگوں کی جان و مال جن کی آہ و فغان اور نالہ و شیون سے عرش تک کنگرے تک تھر تھرا اٹھتے ہیں لیکن ان انسان نما شدیدوں پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کسی کا نقصان ہو رہا ہے ان کی بلا سے کسی کی جان جا رہی ہے اسکی جوتی سے وہ تو صرف اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اونہیں اپنی آسودگی مقصود ہوتی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اللہ تعالی نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا ہے کہ اوس نے ان لوگوں کے دلوں آنکھوں اور کانوں پر مہریں لگا دی ہیں اور وہ اونہیں مہلت دیئے جا رہا ہے کہ وہ جتنے گناہ کر سکتے ہیں کرلیں لیکن اوسکی گرفت سخت ہے

کوئی ایسے گناہ کرنے والا اسکے چنگل سے نہ نکل سکے گا۔

اسیطرح یعقوب بھی اپنے فائدہ کے خاطر فساد کرانے کی آئے دن کوشش کرتا۔ اسکے لئے وہ طرح طرح کی افواہیں پھیلاتا۔ اور لوگوں کو اکساتا کہ کیطرح وہ آپس میں لڑیں اور یہ خود مزے اڑائے۔ اون کی جھونپڑیوں میں آگ لگاکر خود آگ تاپے۔ اور لوگ بھی بے وقوف اوسکی باتوں میں آجاتے۔ اپنی بیویوں کو خود ہی بیوہ اور اپنے بچوں کو خود ہی یتیم کر دیتے۔ نادان ہی جو ٹھہرے شہر میں کوئی جھگڑا ہوتا یعقوب وہاں موجود۔ دیہات میں کوئی جھگڑا ہوتا یعقوب وہاں حاضر۔ اوسکی منزل مقصود قتل کی آماجگاہ۔ فساد کا مخزن مار پیٹ کا مرکز ہوتی۔

آخر ایک دن اوسکی کوشش بار آور ہوئی اور شہر میں فساد پھوٹ پڑا۔ یعقوب نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ ایسے موقع سے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریگا۔ قسمت اسکے اس خیال پر زیر لب مسکرا رہی تھی۔ یعقوب نے کئی دوکانوں کو آگ لگائی اور لوٹا۔ کئی آدمیوں کے چھرے گھونپے اور وہ سب کچھ کیا جو انسانیت سوز ہو اور جن افعال کے خیال سے انسان (اگر وہ واقعی انسان ہے) شرم سے پانی پانی ہو جائے اور گردن نیچی کرلے اور اسکے جیب میں ہمیشہ ایک آٹھ انچ پھل والا چھرا رہنے لگا جسے وہ استعمال کرنے سے ذرا نہ ہچکچاتا اور ہمیشہ موقعہ کی تاک میں رہتا کہ کوئی ملے تو وہ اوس پر وار کرے اور ایک بیکس و بیگناہ کی چند چمکتے ہوئے سکوں کے خاطر جان لے۔

اپنی فسادات کی ایک اندھیری رات تھی عروس شب کی زلفیں پوری طرح بکھر چکی تھیں یہ اون کا شورو وحشت خیز تھا۔ درخت سہمے سہمے سے تھے ساری کائنات سو رہی تھی۔ لیکن یعقوب کسی غریب کے انتظار میں ہاتھ میں وہی چھرا لئے ہوئے چھپا کھڑا تھا ستارے اپنی آنکھیں ٹمٹما رہے تھے کہ دیکھیں قدرت اونہیں کونسا خونی منظر دکھاتی ہے۔ چاند نے تو شرم کے مارے اپنے چہرے پر پوری طرح سے نقاب اوڑھ لی تھی۔ اسوقت یعقوب کی خوشی کی حالت میں تھی اور رہ رہ کر چاقو دبوچ رہا تھا۔ اتنے میں دور سے قدموں کی چاپ کی مدھم سی آوازیں آنے لگیں۔ ٹھپ۔ ٹھپ۔ ٹھپ

کوئی اپنے مقتل کی طرف نہایت ہی خوش مزاجی سے قدم اٹھا رہا تھا ۔ کیونکہ وہ کچھ گنگنا بھی رہا تھا دوسری طرف یعقوب کے دل کی دھڑکن بڑھتی گئی دھک ۔ دھک ۔ دھک لیکن وہ چوکنا کھڑا ہو گیا اوس نے الفظوں سے چہرے کی ہار کو محسوس کیا ۔ آنے والا اور قریب آ گیا ۔ حتیٰ کہ اوس کا سفید کرتا نظر آنے لگا یعقوب کا سانس پھولتا گیا یہانتک کہ وہ اس بری طرح ہانپنے لگا جیسے وہ ایک میل کی دوڑ ختم کر کے ابھی واپس آیا ہے ۔ آنے والا گا رہا تھا " دنیا ہی دنیا ہے تو کیا یاد رہیگی " جب وہ یعقوب کے بازو سے گزرا تو اوس نے اچھل کر اپنا چھرا اوس کے سینہ میں قبضہ تک اتار دیا ۔ بدنصیب ایک آہ کے ساتھ زمین پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا ۔ یعقوب اپنی کامیابی پر خوش خوش لاش پر پہونچا ۔ کسی نامعلوم خوف کی وجہہ سے وہ کانپنے لگا ۔ اوس نے دیا سلائی جلائی ۔ جیبوں کا جائزہ لیا جائے اور دفعتاً چیخ مار کر وہ پیچھے ہٹا ۔ اف یہ کیا ۔ اوس کے منہ سے بے اختیار نکلا ۔ یہ ذکی کی لاش تھی ۔ اوس کے چہیتے اور عزیز بھائی کی لاش ۔ اس خیال کے آتے ہی بیدکی طرح کانپنے لگا ۔ کہ وہ اپنے سگے بھائی کا قاتل ہے ۔ ذکی موت کی میٹھی نیند سو رہا تھا اور ان ساری دنیا وی جھنجھٹوں سے آزاد اور بالاتر ہو گیا تھا ۔ لیکن یعقوب کس روحانی اذیت میں گرفتار تھا ۔ یہ نہ پوچھو وہ رو رہا تھا ۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا ۔ اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ میں اپنے بھائی کا قاتل ہوں ۔ مجھے گرفتار کر لو پکڑ لو ۔

شکاری خود ہو گیا شکار ۔ قدرت نے وہ سبق اوسے سکھایا جو اوس کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ کافی تھا ۔ اب اوس کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ پشیمان تھا ع "ہائے اوس زود پشیماں کا پشیماں ہونا " اوس کی آنکھیں اب کھلیں اوسے اب معلوم ہوا کہ جن جن لوگوں کو اوس نے قتل کیا ۔ لوٹا ۔ ستایا وہ سب گویا اوس کے بھائی ہی تھے مگر اب یہ سب کچھ بعد از وقت تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا مگر بعد کی پشیمانی سے فائدہ ۔ یہ تھا فساد کا انجام ۔ تکلیف دہ انجام دنیا میں روزانہ ہزاروں ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں ۔ مگر کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا ۔ کسی کی آنکھیں نہیں کھلتیں ۔ مرنے والے کی زبان پر مرتے وقت جو گانا تھا وہ بہت صحیح اور سچا تھا ع "دنیا ہی دنیا ہے تو کیا یاد رہیگی "

جناب فخرالدین احمد صاحب سعید بی، اے (عثمانیہ)

گھورتے ہو کیوں مجھے روشن جبینانِ فلک
کہکشاں کے اس طرف رہنے کا ارمان دل میں ہے
جھلملاتے، کانپتے ہو پر نہیں کچھ بولتے
آسماں پر آپ سب خاموش ہیں ہمراز ہیں
ٹمٹماتے، آنکھ جھپکاتے ہو اس انداز سے
جگمگاتی بستیوں کی اپنی کچھ تو دو خبر
آپکی پرنور دنیا میں ہے امن و آشتی؟
مذہبی تفریق پر کیا واں بھی کھنچتا ہے کٹھار
خوں فشاں دہلی کی کیا ہے کہکشاں بھی ہمنوا
کیا ستارو نہیں کہا! ایسا نہیں اس جا ہوا
اے ستارو! ادعا سے آپکے ہے اتفاق
آپکی دنیا ہے سنجیدہ، روادار و متیں

کس طرح آؤں زمیں سے آسماں پر آپ تک
چپکے چپکے تم سے کچھ کہنے کا ارمان دل میں ہے
لب پہ ہے ذوقِ تکلم کیوں نہیں منہ کھولتے
آپکی محفل کے سارے ساز بے آواز ہیں
رات کی محفل میں ہیں جس طرح بچے اونگھتے
خیر کا ہے دور دورہ یا وہاں رہتا ہے شر
یا وہاں بھی ہے بپا خونریزی و غارتگری
کیا وہاں بھی ہیں نواکھالی و پنجاب و بہار
سرخیٔ مریخ کیا خوں ہے بنات النعش[۵] کا
یا بہایا کب سے اک تارے نے ایک تارے کا خوں
آپکی دنیا میں ہوتا ہی نہیں بغض و نفاق
میری دنیا پر تعصب، فتنہ زا، اندوہگیں

شرم سی آتی ہے کیا تم سے کہوں احوالِ شر
کاٹتا ہے اس جگہ انساں، انسانوں کے سر

---

۵ شمالی قطب کے قریب سات ستارے ہیں جن میں تین بنات اور چار نعش کہلاتے ہیں۔

مُقابلہ

(افسانہ)

جناب شمیم اختر صاحب صدیقی

بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں سوائے عرفان بھیا کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ چچامیاں کو بھی دو لڑکیاں تھیں۔ ثروت اور سلوت۔ ثروت میرے ساتھ فسٹ ایر میں پڑھتی تھی۔ ان دنوں چچامیاں کا تبادلہ حیدرآباد ہوگیا تھا اور ہم اپنے بڑے مکان میں ایک ہی جگہ رہا کرتے تھے۔ ثروت کے آنے سے میرا بڑی دل بہلائی ہوگئی تھی۔ میں تنہائی کی ماری اس تنہائی سے اس قدر بیزار آگئی تھی کہ ثروت کا آنا میرے لئے باعث نعمت ہوگیا۔ گوکہ ثروت کی تعلیم تربیت بالکل مغربی طریقہ سے ہوئی تھی۔ وہ باتیں بنانے اور ہنسی مذاق میں بڑی طرار تھی۔ چچامیاں ہی نے اسے آزاد کردیا تھا۔ وہ تو یہ کہئے کہ میں نے ہی زبردستی کرکے اسکاد اخلہ اپنے ہمراہ زنانہ کالج میں کرالیا تھا۔ مگر وہ اس پر خوش نہ تھی۔ کہتی تھی کہ یہاں بڑی قید ہے۔ میں تو باز آئی ایسے کالج سے۔ نہ گومیں اور دن کی طرح چہار دیواری میں قید نہ تھی۔ مجھے بھی ثروت کی طرح ہر قسم کی آزادی میسر تھی۔ مگر ایک تو میری خاموشی شرمیلی فطرت اور کچھ امی کی مذہبی رنگ کی گھریلو تعلیم اور تربیت نے مجھے اس قسم کی تباہ کن آزادی سے بہت دور رکھا تھا۔ اسی لئے اکثر ثروت مجھے وحشی کے نام سے مخاطب کرتی۔ کیونکہ وہ مغرب زدہ فیشن پرست تھی۔ مگر پھر بھی ہم میں بیحد محبت تھی۔ اللہ رکھے عرفان بھیا کے ہوتے ہوئے مجھے تنہائی کا احساس بھی نہ ہوتا۔ لیکن وہ بھی لغرض تعلیم علیگڈھ گئے ہوئے تھے اور تعطیلات میں جب آجاتے تو دن میرے عید سے کم نہ ہوتے —! ہمارا مکان ایک بہت بڑے باغ میں تھا اور باغ کے اس سرے پر ہماری پھوپھی جان کا مکان تھا۔ پھوپی جان بیوہ ہونے کے بعد اپنی اکلوتی لڑکی شام کے ساتھ اسی مکان میں رہا کرتی تھیں۔ یوں میں جاہتی تو دن میں پچیس ۲۵ بار پھوپھی جان کے گھر جاسکتی تھی۔ مگر پھوپھی جان سے اور ہمارے ابامیاں سے کچھ ان بن ہوگئی تھی اس لئے آنا جانا برائے نام تھا۔ شام بڑی پیاری لڑکی

تھی اور میری ہم جماعت۔ کالج میں ہم ایک کلاس میں ہوتے ہوئے بالکل دور
تھے بس معمولی سی مزاج پرستی ہو جایا کرتی تھی کبھی کبھی ـــ ہاں تو آج عرفان
بھیا کی آمد پر میں تو کیا سارا گھر ہی خوش تھا۔ چچی جان امی سے کہہ رہی تھیں
ارے عرفان کو تو مجھے دیکھے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ چچا میاں اپنی نوکری
کی وجہ سے اضلاع پر رہا کرتے تھے۔ امی مسکرا کر بولیں۔ اب تو ماشاءاللہ سے
خوب بڑا ہو گیا ہے۔ دلہن تم اکیلے میں دیکھ پاؤ تو پہچانو نہیں۔ چچی جان نے
امی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ " اے بھابھی۔ اب تو وہ تعلیم ختم کر کے
آرہا ہے۔ جلد کر دو اسکی شادی" اور انکی نظر فوراً اپنی بیٹی ثروت پر جا پڑی۔
امی نے کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ بات کو ٹالتے ہوئے کہا " ہاں ـــ ! آنے دو
ـــ بھئی نیا زمانہ ہے میں کیسے اپنی پسند سے اس کی شادی کر دوں اس کی پسند
لینا بھی تو ضروری ہے" چچی جان اپنے مطلب کا جواب نہ پا کر اپنے کمرے میں چلی
آئیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ چچی جان ثروت سے نہ معلوم آہستہ آہستہ کیا کہہ رہی ہیں۔
تھوڑی ہی دیر بعد ثروت معمول سے زیادہ بن ٹھن کر میرے پاس آئی اور بولی "
اری تسنیم چلے گی نہیں عرفان بھیا کو لانے " میں نے ہنستے ہوئے کہا " آج تو
بڑے ٹھاٹ ہیں۔ میں تو حضور ہی کے انتظار میں بیٹھی ہوں " وہ مسکرا دی ہم دونوں
موٹر میں بیٹھ کر بھیا کو لانے اسٹیشن کی جانب چل پڑے۔ ہمیں زیادہ انتظار
نہ کرنا پڑا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر آ رکی اور ہم دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ بھیا
کو ڈبوں میں تلاش کر رہے تھے " ارے تسنیم " کسی کی آواز نے مجھے اپنی
جانب متوجہ کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بھیا کھڑے تھے۔ " بھیا " ! میں
مارے خوشی کے بھیا سے لپٹ گئی " آپ نے تو ہمیں پریشان کر دیا میں کہنے
لگی۔ سارے ڈبے چھان مارے " اور بھیا جملہ پورا کرتے ہوئے بولے۔
بھیا کہیں نہ ملا۔ ملتا بھی کیسے آپکے پیچھے ہی تو کھڑا تھا۔ ہم دونوں بھائی بہن ہنس
پڑے۔ ثروت اب تک اجنبی بنی کھڑی تھی۔ میں نے اسکی طرف کہا " اوہ میں کیسی
پاگل ہوں۔ بھیا یہ ہماری ثروت ہیں " بھیا ثروت کی جانب دیکھتے ہوئے بولے "
اچھا یہی ثروت ہیں۔ اب تو پہچانی بھی نہیں جاتیں " ثروت شوخی سے مسکرا پڑی

آن کی آن میں موٹر نے ہمیں اپنے گھر پہنچا دیا۔ وہاں سارا گھر بھیا کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ امی ابا نے بھیا کو سینے سے لگاتے ہوئے سیکڑوں دعاؤں کی بارش کردی۔ چچی جان اور چچا جان نے دعائیں دیں اور دست شفقت پھیرا۔ اور میں بھیا کی خاطر میں ادھر سے ادھر پھرنے لگی۔ کبھی باورچی خانے میں جاتی کبھی کھانے کے کمرے میں ـــــ خوشی سے میری حالت دیوانی ہوتی جا رہی تھی۔

(۲)

مجھے یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ ثروت اب پہلے سے زیادہ شوخ ہو گئی ہے اور سنگھار میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ جب وہ بھیا سے مٹک مٹک کر باتیں کرتی تو میں بعض وقت بے اختیار ہنس پڑتی۔ افوہ! میں خوب سمجھی ـــــ! میں اتنی نادان نہ تھی کہ اسکی نگاہوں اور الفاظ کے ہیر پھیر کو نہ سمجھ سکتی۔ ایک دن اتفاقاً میرے منہ سے یہ جملہ نکل پڑا۔ افوہ! ہونے کے تو خوب گر یاد ہیں ـــــ! بے شرم ثروت بجائے شرمانے کے بڑی زور سے ہنس پڑی اور بولی "تم بھی سیکھ جاؤ نا"۔ میں تو کٹ ہی گئی اور اپنے آپ پر ملامت کرنے لگی کہ میں نے اسے ایسا کیوں کہا۔

بھیا کی کامیابی کی خوشی میں انکے آنے کے چوتھے دن ہمارے یہاں دعوت ہو رہی تھی۔ میں خوشی خوشی گھر سجانے میں معروف پھر رہی تھی۔ کئی بار ثروت کو آوازیں دیں کہ "آؤ ذرا ہاتھ بٹاؤ نا" پہلے تو وہ سہیلی سے گپ بازیاں کرتی رہی پھر اپنے کمرے میں سنگھار کرنے چلی گئی۔ آخر کو میں نے سطوت کو بلا لیا اور ہم نے اپنا کام پورا کر لیا۔ شام کو سب مہمان آ گئے۔ چچی جان کی بہن سعیدہ کانپور میں رہتی تھیں۔ وہ بھی آج کل یہاں آئی ہوئی تھیں۔ ہم نے انہیں اور انکی لڑکی حسنیٰ کو مدعو کیا تھا۔ حسنیٰ بڑی شوخ طرار لڑکی تھی اور نمائش میں ڈوبی ہوتی۔ آزاد قسم کی ـــــ! ہماری پھوپھی جان بھی بڑے اصرار کے بعد شام کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ لیکن سچ کہتی ہوں اتنی بہت سی لڑکیوں میں آج شام مجھے سب سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ ہلکے آسمانی شانور کا غرارہ اور پنجابی قمیص اور آسمانی ڈوپٹہ جس پر کامدانی جگمگا رہی تھی۔ یہ لباس اسے آسمانی حور بنائے ہوئے تھا۔ نرم شیریں زبان خوبصورت جھکی ہوئی نگاہیں۔ ہائے وہ تو [illegible]

میں نے دیکھا ثروت اور حسنیٰ شام سے ملکر کچھ خوش نہ ہوئیں۔ کیسے خوش ہوتیں
ان سے بڑھا ہوا حسن تھا نا ——— یکبارگی دل میں یہ شوق پیدا ہوا۔ کاش شام
میری بھابھی ——— اگر پھر وہی گھر بلو جھگڑے کا نقشہ سامنے آ گیا۔ جسکی وجہ
سے ہمارے یہاں سے ان بن ہو گئی تھی۔ اور میں اپنے شوق کو دبا کر ایک ٹھنڈی سی
آہ بھر کر رہ گئی بھابھی پھوپھی جان سے ملکر بے حد مسرور نظر آ رہے تھے۔ میں انکی
خوشی جان گئی ——— چلتے ہوئے پھوپھی جان نے بھیا سے کہا بیٹا تم بھی کبھی ہمارے
یہاں نہیں آتے۔ نہیں اگر چار روز ہوئے ہیں۔ مگر تم نے صورت تک نہ دکھائی۔ ارے
کونسا بڑا دور ہے گھر" ——— ؟ بھیا نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ مگر وہ کیا کرتے
مجبور تھے اور وعدہ کیا کہ ضرور آیا کریں گے۔ ہم دونوں پھوپھی جان کو چھوڑنے باغ
تک آئے۔ پھوپھی جان اور شام جب تک نظر سے اوجھل نہ ہوئے۔ بھیا برابر
انہیں تکا کیے۔ میں انکی یہ حرکت دیکھ رہی تھی۔ آخر میں نے بڑے زور
کی چٹکی انکے بازو میں لی۔ بھیا اب چونک پڑے "یہ کیا حرکت ہے" ؟
میں نے کہا "کب تک نقش قدم کو دیکھتے رہیں گے" ؟ بھیا کے چہرے پر
باوجود ضبط کے مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ میرے سر پہ ہلکی سی چپت رسید کرتے
ہوئے بولے۔ "شریر کہیں کی"۔ ہم جب واپس آئے تو ثروت اور حسنیٰ
اپنی ہی قسم کی لڑکیوں میں شوخی سے باتیں کرتی نظر آئیں۔ بھیا کے آتے ہی دونوں
کی زبانیں اور تیز قینچی کی طرح چلنے لگیں۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کو گرانے
کی فکر میں ہو گئیں۔ غالباً بھیا اس بے تکلفی سے گھبرا کر جلد ہی کمرے سے باہر
نکل آئے۔ مجھے بھی انکے چھچھورے پن پر بے حد غصہ آیا۔ آج ثروت اور حسنیٰ
کی اصلیت اور غلط تعلیم تربیت بری طرح انکا مذاق اڑا رہی تھی۔

(۳)

حسنیٰ کی آمد و رفت ہمارے ہاں سے خوب بڑھ گئی تھی۔ انکا مکان ہمارے
یہاں سے کچھ دور نہ تھا۔ وہ صبح شام ہمارے یہاں ضرور آتی۔ روز نیا لباس نئی وضع
نئی قطع ——— ثروت کو اسکا آنا جانا ذرا نہ بھاتا۔ اور وہ حسنیٰ کو فیشن میں کم دکھانے

شباب
کی خاطر اس سے قیمتی کپڑے پہنتی۔ اس سے بڑھا چڑھا فیشن کرتی۔ میں ان دونوں
کے مقابلہ کو بڑی دلچسپی کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ دیکھوں
کون اس مقابلہ میں بازی لے جاتا ہے۔ چچی جان کی بہن سعیدہ تو بس ہمارے
بھیا پر لٹو ہو رہی تھیں۔ ان کے سامنے بھیا کی تعریف کرتے کرتے انکی زبان خشک
ہو جاتی اور ساتھ ساتھ حسنیٰ کو بھی لے اڑاتیں اسکی بھی تعریف میں زمین آسمان کے
قلابے ملا دینا چاہتی تھیں۔ چچی جان نے جو یہ رنگ دیکھا کہ کہیں شکار سعیدہ کے
جال میں نہ پھنستے تو انہوں نے بھی اپنی بہن کو ہرانے کی ٹھانی —! سعیدہ تو امی ہی
سے بھیا کی تعریف کرتیں۔ چچی جان نے تو امی ابا میاں کے سامنے تعریف کے ساتھ
بھیا کی خاطر مدارت میں بھی اضافہ کر دیا۔ خود نفیس نفیس میٹھے تیار کرتیں اور بھیا سے
کہتیں کہ لو ثروت نے تمہارے لئے اپنے ہاتھوں سے یہ میٹھا تیار کیا ہے۔ میں یہ تماشہ
حیران ہو کر دیکھا کرتی۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ ابا میاں تو چاہتے
تھے کہ ثروت سے بھیا کی شادی ہو جائے مگر امی اسکی رفتار گفتار کو دیکھکر خاموش
تھیں۔ اور میں —؟ میں کیا کہہ سکتی تھی —؟ جو امی اور ابا میاں کی مرضی —!!
جب حسنیٰ اور ثروت یکجا ہوتیں تو بھیا اکثر پھوپھی جان کے یہاں چلے جاتے۔ وہ
ایک مرتبہ امی نے ٹوکا بھی کہ وہ کیوں جاتے ہو بیٹے۔؟ کہیں تمہاری پھوپھی کو یہ بھی ناگوار
نہ گذرے" بھیا نے کچھ نہ کہا۔ حالانکہ ہماری پھوپھی جان بڑی شائستہ عورت تھیں
مگر شامو کے ابا بڑے اکھڑ اور بدمزاج آدمی تھے۔ اسی سبب سے ابا میاں میں اور
انمیں جھگڑا ہو گیا تھا شوہر کی طرف سے ہو کر یہ بھی بری ہو گئیں!
ایکدن سعیدہ ہمارے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ بات پر بات نکلی دادی اماں سے کہنے
لگیں "بہو لانے کا کب تک ارادہ ہے"؟ امی ان باتوں سے بڑی گھبراتی ہیں۔ بولیں
ہاں جلد ہی لاؤں گی "سعیدہ نے کہا وہ لڑکی بھی دیکھی ہے۔؟ کیسی ہے پسند آئی ہے؟
رات میں بھیا کی شادی کی بات ہو چکی تھی۔ چچا میاں نے صاف طور پر اپنی طرف سے
ثروت کا پیغام بھیا سے دیدیا تھا اور ابا میاں نے بھی منظور ہی کر لیا تھا کہ امی نے یہ
کہکر کہ "عرفان سے پوچھ کر کہوں گی" ابھی جلدی کا ہے کی ہے" بات پختہ نہ ہونے
دی۔ چچی جان کو اس بات کی پوری امید تھی کہ عرفان بھیا ثروت کو ضرور پسند کرینگے

اس لئے وہ اسوقت بڑھ کر بولیں "ہاں پسند کیوں نہ آئے۔ سب سے بڑھکر اپنا خون۔ سعیدہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ امی اماں کو کچھ بتانے کے لئے اٹھکر ادھر گئیں تو سعیدہ نے چچی جان سے آہستہ سے پوچھا "کون بہو آیا؟" "وہ بھی ہماری ثروت اجی چچا زاد بہن سے بڑھکر آرام دینے والی مزاج شناس اور کون ہوگی؟" چچی جان فتح مندانہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔ سعیدہ کو بڑی شکست ہوئی تھی۔ وہ زیادہ دیر ہمارے یہاں نہ ٹھیر سکیں۔

(۴)

شام کو بھیا اپنے کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ میں چپکے سے انکے کمرے میں داخل ہوئی۔ آج ناشتہ بعد امی نے انہیں اپنے کمرے میں بلا کر بڑی دیر تک ان سے انکی شادی کے متعلق گفتگو کی اور یہ بھی پوچھا کہ ثروت تمہیں پسند ہے یا نہیں؟ بھیا نے جواب دیا "اچھا پھر جواب دونگا" اور چلے آئے۔ امی زمانہ دیکھے ہوئے تھیں بات کو تاڑ گئیں۔ مگر جواب کے انتظار کو لازمی سمجھا۔ میں تو یہی سوچکر آئی تھی کہ آج بھیا کو خوب چھیڑونگی اور مرضی معلوم کرونگی۔ گو مجھے دل سے بھیا کے لئے شام پسند تھی مگر میں دم نہ مار سکتی تھی مجھے دیکھکر بولے "کون تسنیم؟" میں نے جواب دیا "ہاں بھیا اتنے خاموش کیوں ہیں آپ؟ آج تو مسرور ہونا چاہیئے آپکو" بھیا مصنوعی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لاتے ہوئے بولے۔ "نہیں تو! خاموش تو نہیں۔ ذرا طبیعت کسلمند ہے" "تو چلئے باغ کی سیر کو چلیں" میں نے کہا۔ وہ گھبرا کر بولے "نہیں بھئی۔ اسوقت نہیں" "کیوں بھیا" میں مجسم سوال بنگئی۔ بولے۔ "یونہی تم چاہو تو اکیلی جا سکتی ہو" میں نے مچل کر کہا۔ "آخر وجہ؟" بھیا اٹھ بیٹھے کہنے لگے چلو بھئی۔ مگر کسی اور کو ساتھ نہ لینا۔ تمہاری ساتھیوں سے بے حد وحشت ہوتی ہے" "ارے نہیں بھیا! ذرا ثروت کو لیلوں" "میں شرارت پر آمادہ ہوئی۔" "دیکھو تسنیم۔ اب مجھے نہ چھیڑو اگر تم ثروت کو ساتھ لیجانا چاہتی ہو تو شوق سے لیجاؤ مگر میں انکے ہمراہ نہ جاؤنگا" وہ کمرے میں واپس جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ "تو بھیا وہ چچی جان ہی کے گھر ہوآئیں" میں نے بات ٹالتے ہوئے بھیا کو کمرے میں واپس جانے سے روکنے کیلئے

کہا۔ "پھوپھی جان کے نام سے وہ کھل گئے۔ بولے۔ "اچھا چلو" ہم دونوں پھوپھی جان
کے گھر پہنچ گئے۔ بھیا کے ساتھ خلافِ توقع مجھے دیکھکر پھوپھی جان نے بڑی حیرت
ظاہر کی اور بہت خوش ہوئیں۔ شام میری آمد پر بڑی خوش تھی اس نے اپنی پیاری
آواز میں کہا "باجی آپکے آنے سے مجھے بے حد خوشی ہوئی" میں نے یونہی بے خیالی
میں کہا "اور بھیا کے آنے سے نہیں"؟ وہ شرم سے سرخ ہو گئی اور بھیا بھی زمین
کی طرف دیکھنے لگے —! جب ہم دونوں گھر واپس آ رہے تھے تو میں نے بھیا سے
کہا "کتنی اچھی ہے شام" —! بھیا نہ معلوم کس خیال میں تھے بولے "لاکھوں میں ایک ہے"
میں حیرت اور خوشی سے انکی طرف دیکھنے لگی۔ "تو کیوں بھیا ہی سے"—؟ ارے
بھیا! تم سمجھتی نہیں وہ ذرا گھبرا کر بولے "ہاں خوب سمجھی آپ کو ثروت پسند
نہیں تو آپ کیوں نہیں ناپسندی کا اظہار کر دیتے اور یہ بھی کہہ دیجئے مجھے شام پسند
ہے" بھیا کے چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر غائب ہو گئی انہوں نے
افسردہ لہجہ میں کہا "نگار یہ آپس کی رنجش —؟" میں گویا سوتے سے چونک پڑی
ارے ہاں! میرے منہ سے نکلا۔ مجھے تو اس کا خیال ہی نہ تھا مگر فوراً بھیا کی
تسلی کیلئے کہا "میں امی سے کہکر دیکھونگی بھیا" بھیا افسردگی سے مسکراتے ہوئے
بولے "خدا تمہیں کامیاب کرے" میں ہنس پڑی۔ "اور جو میں کامیاب ہو گئی تو —؟" "بہت
اچھا انعام دونگا کہ خوش ہو جاؤ" وہ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے
دالان سے گذر رہی تھی کہ امی نے پکارا۔ "کہاں تھیں نگی —؟" "ذرا پھوپھی جان کے
یہاں چلی گئی تھی امی" — میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔ امی نے کہا "کہلا جاتیں" میں
امی کے قریب بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ اس ؟ کو کس طرح چھیڑا جائے۔ میں نے
کہا "امی! اب تو بھیا کی شادی کر دیجئے۔ آخر کب تک انتظار کروں بھابھی کا —؟"
امی بولیں "ہاں بیٹی میں بھی تو اسی فکر میں ہوں" اب مجھے موقع ملا۔ میں بولی "وہ
اور ہوں —! فکر کی کیا بات ہے! شام تو اتنی اچھی لڑکی ہے کہ میں تو مرجاؤں
اسیر ہے۔ آپ کیوں نہیں بھیا کی شادی کر دیتیں اس سے"؟ "ہاں اب میں خوش
ہو کر اپنی بھابھی بناؤں گی —!" امی مجھے گھورتے ہوئے بولیں "معلوم ہوتا ہے
کہ پھوپھی جان نے تمہیں سکھا پڑھا کر بھیجا ہے" میں ڈر کر جھٹ "قسم لو امی بھیجی —"

اللہ قسم ـــ! نہیں امی یہ تو میرے جی کی بات تھی اور بات یہ ہے کہ امی بھیا اس بات کا شکوہ ہیں " کیا ـــ؟ بھیا ـــ! میں گھبرا کر بولی " نہیں امی ثروت بھیا کو پسند نہیں ہے ! امی نے آہستہ گڑگڑا کر کہا " تو شام پسند ہے۔ کیا بکتا ہے !" میں سہم گئی اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا " ہاں۔ شام بھیا کو پسند ہے۔ کہتے ہیں لاکھوں میں ایک ہے۔ میں باغ کی سیر کو جاتے وقت ثروت کو بلانے لگی تو بولے اگر ثروت جائے گی تو میں نہ جاؤنگا۔ ہاں امی ثروت سے بھی بڑی آزاد " مگر فوراً " رُک کر چپ ہو گئی۔ اور آنسوؤں کے قطرے میرے گالوں پر آ لڑھکے۔ امی نے انہیں دیکھ لیا۔ جھٹ قریب آکر مجھے سینے سے لگا لیا اور محبت بھری آواز میں بولیں۔ چل پگلی۔ رونے لگی۔ ؟ میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور سسکیاں لیتی ہوئی بولی " امی بھیا کو شام بہت پسند ہے۔ اگر آپ لوگوں نے بھیا کی شادی ثروت سے کر دی تو وہ کر لیں گے۔ مگر کہیں شام کے غم میں گھل کر ختم نہ ہو جائیں۔ امی بھیا کو یوں نہ مرنے دیجیے۔ آخر شام میں کیا خرابی ہے ـــ؟ اللہ امی۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ آج بھیا کا چہرہ کتنا سوکھا ہوا ہے۔ بولیئے ! امی بھیا کی شادی شام سے کر دیجیے۔ اگر آپ نہیں تو میں بھیا سے یہ بات کہونگی میں گڑگڑاتے ہوئے امی کی جانب دیکھنے لگی۔ امی کچھ دیر بعد میری پیشانی چومتے ہوئے بولیں " اچھا تمھارے ابا میاں سے کہکر دیکھونگی۔ دعا کرو کہ وہ راضی ہو جائیں۔ میں اپنے خداوند پاک سے بعد عجز و نیاز دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ اے میرے مالک امی کی ! نہ ابا سن لیں۔

رات کے کھانے کے بعد امی اور ابا میاں میں اس بات کی بحث ہوتی رہی ' وہ تو خیر ہوئی کہ چچی جان اور ثروت حسنیٰ کے گھر گئی ہوئی تھیں اور چچا میاں بھی کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میں اور بھیا فیصلہ سننے کی خاطر نانی کے کمرے میں ایک دروازہ تھا جو اس کمرے میں کھلتا تھا جہاں یہ بحث ہو رہی تھی۔ اسی دروازہ کے پاس کان لگا کر بات سننے لگی۔ امی کہہ رہی تھیں " اسے اب غصہ تھوک دے۔ آخر تمہاری بہن ہی تو ہیں " ابا میاں گرج کر بولے " نہیں ـــ! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ نعیمہ نے اپنے شوہر کی خاطر میری عزت کا کوئی خیال نہیں کیا " امی عاجزی سے بولیں " بھلا وہ

شہاب

اس بات کو۔ بیچارے تو اب ہیں بھی نہیں اس دنیا میں " ابا میاں ذرا دھیمے
ہو کر بولے " میں کیا کروں جب اسوقت کی بات سوچتا ہوں تو آگ لگ جاتی ہے تن بدن
میں " امی نے کہا۔ اسے جانے دو۔ میرے اولاد پر رحم کرو۔ وہ ثروت سے شادی
کر کے خوش نہیں رہ سکتا " ابا میاں نے زور سے کڑک کر کہا " تو کیا شام پسند ہے
اسے " امی نے سہم کر کہا " ہاں " ابا میاں نے اسی طرح غصہ میں کہا " اللہ تیری قدرت
ہے۔ تم دونوں ماں بیٹے مجھے گرانے کی فکر میں ہو " امی نے آہستگی سے سمجھا کر کہا "
اپنی ذلت کی کونسی بات ہے۔ تمہارا ہی خون ہے دیکھو ایسی باتیں نہ کرو۔ شاید کہیں خدا
کو بری نہ معلوم ہو " اور بہت دیر بعد امی نے فتح پائی۔ اور یہ طے پایا کہ امی صبح میں چچی
جان کے یہاں بھیا کا پیغام لے جائیں۔ میں نے بھیا کی طرف دیکھکر ایک سکون کی سانس
لی اور قریب تھا کہ زور سے ہنس پڑوں۔ بھیا بھی شگفتہ پھول کی طرح مسکرا دیئے۔

(۵)

صبح ہو گئی چچا میاں اور چچی جان کو جو معلوم ہوا کہ شام انکی بچی کے مقابلہ میں بازی
لیجا چکی ہے تو انہیں بہت رنج ہوا۔ بہت کوشش کی کہ بھیا کی شادی شام سے کسی
طرح نہ ہو اور کہا بھی کہ اس گھر میں ہرگز ہرگز شادی نہ کرو جہاں سے لڑائی ہو۔ مگر ابا میاں
اور امی نے انہیں معقول جواب دیکر خاموش کر دیا۔ بھیا کی شادی شام سے طے
ہو گئی۔ حسنیٰ کی امی نے جب یہ بات سنی تو خوش ہوئیں اسلئے کہ جسطرح انکی بیٹی کی شادی
بھیا سے نہ ہو سکی۔ ثروت بھی اس عزت سے محروم ہو گئی اور میں خوش تھی کہ مجھے شام
جیسی شام جان بھاوج ملی۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ حسنیٰ اور ثروت مقابلہ
کیلئے کھڑی ہوئی تھیں اور شام تو یہ خیال بھی نہ کر سکتی تھی ـــ! دونوں اس مقابلہ میں
بری طرح ہار گئیں شام کے مقابلہ میں جو کسی صورت سے ان کے مقابلہ کے لئے تیار نہ
تھی ـــ!

بھیا کی شادی کا دن میرے لئے بڑا مسرور کن دن تھا۔ شام کو میں شام کو ہدیہ
کیلئے اپنا تیار لائی ــ دوسرے دن بھیا میرے کمرے میں آئے جبکہ میں اور شام بیٹھے
ہوئے تھے۔ بھیا بولے " تسنیم ـــ! اپنے انعام کے بارے میں کچھ یاد آیا؟

میں بولی "اتنی اچھی بھابی کو پاکر میں تو اپنا انعام بھول ہی گئی ۔۔۔ ! ہاں تو کیا دینگے آپ ۔۔۔؟ بھیا چھت کیطرف دیکھتے ہوئے بولے "انعام بڑا لاجواب ہے ہے۔ کیوں شام؟ شام نے مسکراتے ہوئے کہا "جی ہاں" تو تم وحید و تسنیم کو ہماری طرف سے "اور کمرے سے چلتے ہوئے کہا "آیندہ ماہ ! تسنیم تمہاری شادی میرے عزیز دوست نصرت سے ہو رہی ہے ۔۔۔! کہو تمہیں ہمارا انعام پسند ہے ۔ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی ۔ شام نے میرے دونوں بازوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔ ارے کہو منظور ہے ۔۔۔ !!

بقیہ سلسلہ صفحہ (۲۴)

یہ معاملہ یا واقعہ کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے اب سلیم ہی کو دیکھئے بیوی کو ایک حد تک چاہتے بھی ہیں اور ہر طرح کا خیال بھی رکھتے ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ انکی فطرت دوست نواز واقع ہوئی ہے دوستوں کی حد تک ہی نہیں، چونکہ جدید تہذیب یا بیہودگی کی حامی ہے اسلئے دوستوں کی بیویوں اور منہ بولی بہنوں کی تعریف و توصیف میں بھی اکثر رطب اللسان اور یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں کیونکہ جدید تہذیب میں مردوں کی عورتوں سے دوستی بالکل جائز ہے ۔ لیکن یہی صرف بات انکی بیوی کو کھٹکتی ہے اسطرح ان میں بظاہر اخلاص و محبت نظر آنے کے بھی ایک ایسی دیوار حائل ہے جو دونکے دلوں کو ایک نہیں ہونے دیتی۔ ہاں تو میں شاید عنوان سے بھٹک سی گئی ہوں کیا نام ہے اسکا دکھ درد کے ساتھی ہو تو کہتا یہ تھا کہ یہ جیون ساتھی محض ہنسی اور خوشی کے وقت ہی کے ہوتے ہیں کیا؟ زندگی سے دکھ اور بیماری دور نہیں ہو سکتی ۔ دکھ اور سکھ کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور پھر جب خود بیمار ہوتے ہیں تو خواہش ہوتی ہے کہ بیوی پل بھر کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جب بیوی بیمار پڑے تو اس سے کوسوں دور بھاگتے ہیں یہ نہیں کہ علاج معالجے میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھیں گے مگر انسان اور بھی بیمار انسان، دوا سے زیادہ ہمدردی کا بھوکا ہوتا ہے ۔

بقیہ: خانہ داری صفحہ (۱۴۲)

جواب استفسار

جناب عطارد صاحب

کچھ دنوں سے یہ مسئلہ زیر غور چلا آرہا ہے کہ انگریزی لفظ ٹرافک کا ترجمہ آمد و رفت صحیح ہے یا آمد و شد۔ میں نے کہا آمد و رفتن اور آمد و شد ہم معنے ہیں لیکن ٹرافک کیلئے صحیح ترجمہ آمد و رفت ہی مناسب ہے کیونکہ اردو میں بھی لفظ خاص و عام کی زبان پر ہے۔

رسالہ شباب بابتہ ماہ دی ۱۳۵۵ف میں مولوی ابرار حسین صاحب نے جو رائے ظاہر فرمائی اسکو پڑھ کر مجھے تعجب ہوا فرماتے ہیں "آمد و رفت یقیناً اہل زبان کیلئے پہلے بھی غلط تھا اور اب بھی غلط ہے" اور اس دعوے کی تائید میں حافظ علیہ الرحمہ کا یہ شعر پیش فرمایا گیا ہے ؎

حافظ خلوت نشین دوش بہ میخانہ شد ٭ از سر پیمان برفت با سر پیمانہ شد

کہا جاتا ہے "رفتن اور شدن کے معنے قریب قریب ایک ہی ہیں مگر محل استعمال میں دونوں کے اسطرح فرق ہے جیطرح اردو میں چلے جانے اور جانے کے استعمال میں ہے گویا رفتن کے معنے جانے کے ہوں گے اور شدن کے معنے چلے جانے کے" اگر یہ صحیح بھی ہے تو اس سے آمد و رفت کا استعمال کیسے غلط ہو سکتا ہے حافظ کے جس شعر پر استناد ہے اوس کو زیر نظر مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ از سر پیمان رفتن اور با سر پیمانہ شدن فارسی کے خاص محاورات ہیں پہلے کے معنی عہد شکنی اور دوسرے کے معنے خواہش یا رغبت سے نوشی ہیں مصادر کے لفظی معنوں سے یہاں بحث درست نہیں اس سلسلہ میں مجھے امیر خسرو کا شعر یاد آگیا ؎

دانستم چوں سر واز آزادگی امیدہا ٭ من چہ دانستم چنین سر در ہوا خواہم شدن

اس شعر میں خواہم شدن کا ترجمہ کرنا صحیح نہیں سر در ہوا شدن محاورہ ہے جسکے معنے ہیں متکبر یا آشفتہ دماغ ہونا۔ دیکھئے حافظ نے بھی آمد و رفت کا استعمال فرمایا ہے ؎

مستم کن آنچناں کہ ندانم ز بیخودی ٭ در عرصہ خیال کہ آمد کدام رفت

فارسی میں کہ آمد کدام شد کتنا خلاف محاورہ ہوگا۔ صاف بات یہ ہے کہ رفتن کے معنے جانا اور شدن کے معنے جانا اور ہونا ہی صحیح ہے ترجمہ میں زبان اردو کے محاورے یا حسن کلام کے لحاظ سے شدن اور رفتن کا ترجمہ جانا کے عوض ایک امدادی سابقہ کا اضافہ کرکے چلا جانا فرمائی تو کوئی ہرج نہیں مگر یہ ارشاد کہ " آمد ورفت اہل زبان کیلئے پہلے ہی غلط تھا اور اب بھی غلط ہے " ہرگز قابل تسلیم نہیں ہوسکتا میں اپنے اس دعوے کی تائید میں بطور تائید فرید سابق شہنشاہ ایران ناصرالدین شاہ قاچار کے سیاحت دوم کے سفر نامہ کی ایک عبارت نقل کرتا ہوں جس کے ملاحظہ کے بعد یقین ہے کہ تمام شبہات رفع ہو جائیں گے اور کسی کو اعتراض کا موقعہ نہ ملیگا۔ سلطنت روس میں حدود دیپرشما کے ایک حادثہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے ؎

تمام اہل شہر از زن و مرد و بزرگان و اعیان و اشراف و سفرائے خارجہ ہمہ روزہ دستہ دستہ بطرف عمارت اعلیحضرت امیر الطوار۔ مثل مور و ملخ مردم جمع شدہ می آمدند و می رفتند و نوشتن BULLETIN (احوال امیر الطوار یعنے راعت باعث تفصیل و شرح حال) فوراً جراح و حکما چاپ کردہ بمردم میدادند ومردم جوقہ جوقہ در کوچہا میخواندند آن این آمد ورفت ، ہجوم مردم دخال دمقال بردال ہیچ بے نظمی واقعہ نشد و صدائے بود ۔

اگر اب بھی کسی کو آمدورفت کے متعلق اہل زبان کا محاورہ ہونے سے انکار ہے تو مجھکو یہ کہکے خاموش ہو جانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے ۔ ع
این سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی ۔

نوٹ :۔ پرچہ نہایت احتیاط سے ڈاک کیا جاتاہے تاہم ڈاکخانہ کی غلطی سے کوئی پرچہ اندرون (۱۵) یوم نہ ملے تو مکرر طلب کریں اسکے بعد قطعی تعمیل نہو سکے گی چندہ وقت پر ادا کرنے میں تامل نہونا چاہیئے ۔
تبدیل پتہ سے دفتر کو فوراً مطلع کیجئے ۔ ورنہ شکایت کے ہم ذمہ دار نہیں ۔ فقط

پولیس اور عوام

(افسوس کہ کتابت کی غلطی سے مکمل مضمون شائع نہ ہو سکا۔)

جناب محمد یحییٰ صاحب

انسان فطرتاً انتقام پسند واقع ہوا ہے جب اسے کوئی نقصان یا دکھ پہنچتا ہے تو وہ انتقام لیکر یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے نقصان یا دکھ کی تلافی ہو گی۔ جبکہ انسان ابھی غیر مہذب تھا وہ اپنا انتقام خود لے لیتا تھا۔ نقصان اٹھا کر خاموش ہو جاتا یا انتقام کیلئے دوسرے سے امداد لینا بے عزتی اور بزدلی سمجھتا تھا۔ لیکن مہذب انسان نے یہ فرض حکومت کے ذمہ کر دیا یا بالفاظ دیگر مہذب حکومتوں نے افراد کو اس حق سے محروم کر کے انتقام لینے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ حکومت کا منشا نہ صرف افراد کے جذبہ انتقام کی تشفی کرنا تھا بلکہ امن و امان قائم رکھنا اور ایسے افعال کی روک تھام کرنا تھا۔ جو حکومت کے مفاد کے خلاف ہیں۔

حکومت نے قانون بنایا اور جن افعال کو قانون نے روکا اور جنکے ارتکاب پر سزا دیجانے لگی۔ وہ افعال جرم کہلائے۔ قانون نے خواہ وہ مذہبی ہو۔ سماجی ہو۔ یا ملکی اگر کسی فعل کے ارتکاب سے روکا تو اسکے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ وہ فعل لازماً برا تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہر ملک ہر زمانہ اور ہر جماعت کے حالات کے لحاظ سے نہ تو بھلے برے کے جداگانہ اختیارات ہوتے اور نہ نئے نئے قوانین بنانے کی ضرورت پڑتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مذہب۔ ہر ملک اور ہر جماعت کا بھلے برے کا نظریہ جداگانہ ہے اور ہر ملک کے قوانین جدا۔ قوانین بھی ہمیشہ حالات کے لحاظ سے بنتے اور منسوخ ہوتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے بلا لحاظ اس کے کہ کوئی فعل اچھا ہے یا برا۔ اگر قانون نے اسکو روکنا چاہا جرم قرار دیدیا اور ان کے مرتکب کو مجرم قرار دیا۔

مجرم کو سزا دیکر ایک طرف تو حکومت مظلوم کے جذبہ انتقام کی تشفی کرتی ہے دوسری طرف خود مجرم کو بھی آیندہ کیلئے سبق دیتی ہے اور ساتھ ہی دوسروں کیلئے عبرت کا سامان بھی خود فراہم کر دیتی ہے۔

اگر تمام انسانوں کی دماغی صلاحیتیں یکساں ہوتیں سب کا ماحول ایک ہوتا ۔
حالات میں کوئی اختلاف نہ ہوتا تو صرف قانون بناکر حکومتیں جرائم کا انسداد کرسکتیں ہر
شخص سمجھتا ہے کہ فلاں فعل سے حکومت نے روکا ہے اور اس کے ارتکاب پر
سزا دیجائیگی لہذا اس سے احتراز کرنا چاہیئے اور یوں کوئی جرم کا مرتکب نہ ہوتا
لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ دو آدمیوں کی دماغی صلاحیتیں ایک دوسرے سے
بالکل مختلف ہوتی ہیں ۔ مختلف جماعتوں کے ماحول مختلف ہیں دوسرے ہر طبقہ کے حالات
زندگی جداگانہ ہوتے ہیں جسکا اثر افراد پر ضرور پڑتا ہے اس لئے جایا یہ توقع
کرنا ہے کہ صرف قانون بنا دینا انسداد جرائم کیلئے کافی ہے کسی صورت میں درست
نہیں ہوسکتا ۔

کچھ لوگ ماحول سے متاثر ہوکر ۔ کچھ حالات سے مجبور ہوکر اور کچھ اپنی فطری
کمزوریوں کی بنا پر ارتکاب جرم پر مجبور ہوجاتے ہیں ۔ لہذا ایک ایسے ادارے
کا قیام ضروری تھا جو جرائم کا انسداد کرے اور ارتکاب کی صورت میں مجرم کا
پتہ چلاکر اسے سزا دلوائے ۔ محکمہ پولیس یہی فرائض انجام دیتا ہے پولیس کے
بغیر کیا حالت ہوسکتی ہے اس کا اندازہ آپکو اس سے ہوسکیگا کہ ریاست حیدرآباد
میں جہاں ۱۲۷۵ف تک اضلاع میں پولیس کا کوئی انتظام نہیں تھا ۔ مسلح ڈاکوؤں
کی مختلف ٹکڑیاں اضلاع میں لوٹ مچاتے ہوئے تھیں ۔ کسی شخص کی جائداد محفوظ
تھی نہ مال ۔ ہر طرف ایک عام ہراسانی پھیلی ہوئی تھی ۔ عہدہ داران مال روہیلوں
سکھوں اور عربوں کی بے قاعدہ فوج کی مدد سے مسلح ڈاکوؤں کے انسداد کی
کوشش کرتے تھے ۔ دوسرے جرائم نظرانداز کردئے جاتے تھے ۱۲۷۵ف میں محکمہ
پولیس کا قیام عمل میں آیا ۔ مگر کوئی تنظیم نہ تھی ۱۲۹۳ف میں کچھ اصلاحات عمل میں آئیں
اور کام شروع ہوا ۔

۱۲۷۵ف سے ۱۲۹۳ف تک کے حالات کا آج کل کے حالات سے مقابلہ
کیجئے تو آپکو معلوم ہوگا کہ پولیس نے کیا کام کیا ہے ۔

مسلح ڈاکوؤں کا تو اب نام بھی نہیں سنتے ۔ ایسی ٹکڑیاں جو دھاوے مارتی ہوئی
ایک جگہ سے دوسری جگہ چلی جائے ۔ برسوں میں ایک آدھ نکلتی ہو تو نکلتی ہو ۔ اس

پر بھی فوراً ہی قابو پالیا جاتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے جرم کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ملزم کو سزا دلوائی جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ پولیس والے عوام کے عدم تعاون کے باوجود کر رہے ہیں۔

۱ف۔ آپ شاید اسے مبالغہ سمجھیں لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عوام پولیس والوں کی امداد کرنا تو کجا انکی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اگر جاہل دیہاتی ایسا کریں تو ایک حد تک قابل معافی ہیں۔ مگر تعلیم یافتہ حضرات جو خود کو شہری کہتے ہیں۔ جو شہری کے فرائض سے واقف ہیں۔ یہی عمل کرتے ہیں۔

۲ف۔ پولیس والوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ عوام عزت کا غلط نظریہ ہے عوام تھانہ جانے میں اپنی سبکی محسوس کرتے ہیں۔ گواہ کی حیثیت سے تو وہ جانا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ اکثر لوگ دیکھیں گے کہ ایک شخص دوسرے کو قتل کر رہا ہے بعد آہستہ سے کھسک جائیں گے محض اس لئے کہ کہیں گواہی نہ دینا پڑے کون بلا وجہ دوڑتا پھرے شاکی کی حیثیت سے بھی لوگ اس وقت تک نہیں جاتے جبتک کثیر نقصان نہ ہو اور نہ دس پانچ کیلئے کون دوڑ دھوپ کرے۔ یہ سب سچ ہے لیکن عوام دوسرے نتیجہ کو بالکل نظر انداز کئے دیتے رہے ہیں۔ محض اپنے نا اہلی کی وجہ سے۔ صرف اپنے غلط نظریہ عزت کے تحت وہ ایسے جرائم پال رہے ہیں اپنی مصیبتوں کو پروان چڑھا رہے ہیں جو کل سوسائٹی کیلئے عذاب بن جانے والے ہیں۔

۳ف۔ دوسری رکاوٹ گاؤں کا مہاجن ہے۔ پورا گاؤں کا گاؤں اسکی مٹھی میں ہوتا ہے وہ مقامی طور پر فریقین سے مصالحت کر کے جرم کو چھپا دیتا ہے اور مظلوم کو پولس والوں تک پہنچنے ہی نہیں دیتا اگر یہ دونوں رکاوٹیں نہ ہوں تو پھر ملزم کے اثرات کام کرنے لگتے ہیں۔ آپ اس لئے اس کے خلاف کچھ کہنے سے گریز کرتے ہیں کہ کیوں اسے پیشانی۔ غیر اسلئے کچھ نہیں کہتے کہ کیوں دوسرے لڑکے پیچھے میں پاؤں دیکر خواہ مخواہ بُرائی مول لیں۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ خود شاکی بعض وجوہ کی بنا پر صحیح واقعات بتانے سے گریز کرتا ہے کبھی تو اسکے بیان کردہ واقعات میں تسلسل نہیں ہوتا اور کبھی اتنا توڑ مروڑ کر بیان کرتا ہے کہ کوئی نتیجہ اخذ کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ (باقی دارد)

آسیبی گھر

اقبال

صبح صبح کا وقت تھا۔ موسم بڑا ہی خوشگوار تھا۔ میں برآمدے میں آ کھڑی ہوئی۔ صحن کا منظر دیکھکر بے اختیار ہنسی آگئی۔ شرفو جیسے ہی اپنی کوٹھری سے آنکھیں ملتا ہوا نکلا سیدھا کوبیٹ کے درخت کی طرف لپکا اور جلدی جلدی رات کے گرے ہوئے کوبیٹ سمیٹنے شروع کئے۔ جاوید کیلئے یہ منظر بڑا ہی حیرتناک تھا اس کو کوبیٹ بہت پسند تھے مگر امی نے شرفو کو سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ علی الصباح قبل اس کے کہ بچے جاگیں سارے کوبیٹ سمیٹ کر باہر پھینک آیا کرے کیونکہ یونہی سردی میں بچوں کو کھانسی ہو جایا کرتی ہے اور پھر ان کوبیٹوں میں اکثر سوراخ نکلا بھی کرتے تھے۔ جاوید کی رونی صورت دیکھکر مجھے ہنسی آگئی۔ بہت جھنجھلایا۔

جی ہاں آپا! آپکو تو ضرور ہنسی آئے گی۔ جناب کی کوئی پسند کی چیزیں پھینک دی جاتی تو! جاوید نے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

مجھے کیوں پسند آنے لگیں ایسی الم غلم چیزیں۔ میں نے اسے چڑھاتے ہوئے کہا۔ بس رہنے دیجئے! وہ بیر جو آپ سیروں ہضم کر جاتی ہیں بڑی نفیس چیز ہے نا۔ جاوید نے چڑ کر کہا۔

پھر بھی تمہارے ان کرٹیلے کوبیٹوں سے تو بہتر ہی ہیں میں نے جواب دیا۔ پھر وہی کوبیٹوں کے قصے ہو رہے ہیں۔ امی نے برآمدے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میں تو اس درخت ہی کو کٹوانے کی سوچ رہی ہوں۔ جاوید کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔ آگے کچھ اور سننے کی اس میں تاب کہاں آئی۔ جیسے ہی مڑیں وہ اندر چلا گیا۔

ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھی ایک دلچسپ ناول پڑھ رہی تھی کہ بھائی جان نے باہر سے زور سے چلائے۔ سلمٰی! سلمٰی کہاں ہو بیٹھی! مجھے بھائی جان کی دخل اندازی بہت بری لگی۔ انکی تو عادت ہی ہے جب بھی کوئی کام کرتی ہوں یا کوئی کتاب پڑھنے بیٹھتی ہوں آدھمکتے ہیں اور پھر کوئی کام کی بات بھی ہوتی آدمی صبر کرے۔ قبل اسکے

کر میں جواب دیتی یہ حضرت دندناتے کمرے میں داخل ہوئے۔
خدا سمجھے تم کو۔ اکب سے چیخ رہا ہوں اور تم ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ بھائی جان نے ابتدار کی اور میں بھی تو دیکھوں کیا تیر مار رہی ہو تم۔ او ہ سبھا کتاب پڑھ رہی ہیں آپ۔
آپ۔ بھائی جان یہاں کیسے جا رہے ہو۔
جی ہاں۔ اور آپ خواہ مخواہ سرچ کرنے ٹپک پڑے۔ میں نے روکھائی سے کہا۔
یا وحشت۔ میری سمجھ میں خاک نہیں آتا کہ یہ لڑکیاں اسقدر پڑھتی ہیں کتابیں چاٹ جاتی ہیں اور پھر نتیجہ صفر۔ ارے میں کہتا ہوں تم لوگوں کے دماغ میں بھی بیٹھتا ہے کچھ۔ بھائی جان کی زبان قینچی کیطرح چل رہی تھی۔ نا صاحب ہم تو فیل ہو جائیں مگر یوں مفت میں اپنا دماغ خراب نہ کریں۔ آخر حد ہوتی ہے رٹنے کی بھائی جان ایک ہی سانس میں سب کچھ کہے جا رہے تھے۔
تو جناب! آپکی بلا سے ہو جائے ہمارا دماغ خراب۔ آپ تو بڑے صحیح الدماغ ہیں نا۔ جب ہی تو دوسروں کا دماغ چاٹا کرتے ہیں۔ میں نے چڑھ کر کہا۔
افوہ! بھائی جان نے کھینچتے ہوئے کہا۔ تم تو گرم ہو گئیں۔ جب ہی تو میں کہتا ہوں، لڑکیوں کی بھی عجیب فطرت ہوتی ہے۔ بات بات پر بگڑ بیٹھنا تو بس تم ہی لوگوں کا کام ہے۔ میں پوچھتا ہوں میں نے ایسے کیا کہہ دیا جو یل پڑیں مجھ پر بھائی جان نے مجھے جلانے کے لئے اور اضافہ کیا۔
جی! دنیا بھر کی بے تکی باتیں کر جائیں آپ پھر یوں معصوم بن کر پوچھئے کہ کیا کہہ دیا آپ نے مجھے بے حد غصہ آ رہا ہے۔
اب تم شریفوں کی طرح بات کرو گی یا نہیں پہلے ہی بتلا دو ورنہ تمہارا مزاج درست کرنے کی کوئی دوسری تدبیر سوچتا ہوں۔ بھائی جان نے میری باتوں کا کوئی اثر نہ لیتے ہوئے کہا مجھے اپنی جان چھڑانی مشکل ہو گئی تھی اسی منظر کو جلد سے جلد ختم کرنے کے لئے میں نے کہا۔ تو پھر خدا کے لئے کہہ ڈالیے کیا کہنے آئے تھے آپ۔ یوں تمہید پر تمہید باندھ کر میرا اور اپنا وقت خراب نہ کیجئے۔
پھر وہی وحشت! انسانوں کی طرح بات تو کرو۔ بھائی جان نے تیوریوں پہ بل

ڈانٹتے ہوئے کہا۔

ارے بھئی کہہ تو رہی ہوں کہ بتا دیجیئے کیا کہنے آئے ہیں آپ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

تو سنو! بھائی جان نے کہنا شروع کیا یہ جو تمہارے کمرے کے سامنے کوئیٹ کا درخت ہے نا اس پہ آسیب ہے۔ چڑیل رہتی ہے اسی پر بھائی جان نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ مگر یونہی بات بنھانے مصنوعی بہادری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ یونہہ! تو ہوا کرے چڑیل۔ میں تو سرے سے ان آسیبوں کی قائل نہیں۔ مذاق نہیں سلمیٰ! سچ کہتا ہوں صبح ہی پڑوس والے مولانا بیان کر رہے تھے کہ واقعی اس درخت پہ عرصے سے ایک چڑیل کا بسیرا ہے اور سارے گھر کا تو خیر ذکر چھوڑو یہ مقابل والا یعنی تمہارا کمرہ راست اس کی زد میں ہے اور سنا ہے اکثر پونم کی رات اس میں دکھائی بھی دیتی ہے بھائی جان نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

بس بس۔ ختم کیجیے لیکچر اپنا۔ مجھے ڈرانے کی کوشش نہ فرمایئے۔ سچ کہتی ہوں مجھے ذرا ڈر نہیں لگتا ان بھوتوں چڑیلوں سے اور اگر واقعی اس چڑیل کو میرا ہی کمرہ پسند ہے۔ اور وہ اکثر اس میں جلوہ افروز بھی ہوتی ہیں تو اللہ کی قسم! ہو جائے ایک دن مڈبھیڑ۔ وہ مزہ چکھاؤں کہ یاد ہی تو کرتی رہیں چڑیل صاحبہ! میں نے انتہائی بہادری ظاہر کرتے ہوئے یہ جملے ادا کر دیئے۔

شیخ چلی کی سی اڑاتی ہے! سچ کہتا ہوں اگر ہیں کہیں کوئی سایہ ہی نظر آجائے تو دم ہی نکل جائے حضرت کا! بڑی چلیں وہاں سے چڑیل کا مقابلہ کرنے بھائی جان نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

اچھا خیر میرا ذکر چھوڑیئے یہ آپ کیسے قائل ہو گئے اور بھوتوں اور چڑیلوں کے موضوع کا رخ بدلتے ہوئے کہا کہ پھر گئی خواب کی روشنی خیالی۔

ارے ہمارا کیا ذکر! کس بیوقوف نے کہا ہم قائل ہیں۔ ارے صاحب ہماری تو وہ ہستی ہے کہ شیطان مار بھگا سکتے ہیں بھائی جان نے بڑائی کرتے ہوئے کہا۔ میں نے

ویسے ہی تم سے کہہ دیا ویسے ہی تم بے حد ڈرتی ہو اگر کہو تو اپنے کمرے سے بدل لوں تمہارا کمرہ!

سخت شیئے! مجھے ضرورت نہیں آپکے کمرے کی اور نہ میں کسی چیز سے ڈرتی ہوں آپکی ہمدردی کا بے حد شکریہ اور اب آپ مہربانی فرما کر اپنی تشریف لے جائیے یہاں سے بکومت سلمی! بھائی جان نے قدرے غصے سے کہا۔ بڑی آئی ہے مجھے سبق دینے اب جو تم بلانا مجھے ہسٹری کے پوئنٹس بتانے خوشامد کرتے کرتے مر جاؤ تو بندہ ایک لفظ بتلانے والا نہیں یاد رکھو لو۔ میں نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ امی نے انھیں آواز دی اور یہ میرے جواب کا انتظار کیئے بغیر چلے گئے۔

اب میں نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا۔ ویسے ہی میں ان معاملوں میں بے حد ڈرپوک ہوں۔ بھائی جان کی باتوں سے دم نکلا جا رہا تھا۔ لیکن بات رکھنے اور اپنی کمزوری چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ مجھے سب کچھ گوارا ہے مگر ان بھائیوں کے آگے شکست کسی قیمت پر کھانے تیار نہیں ہوں۔ جب بھی موقع پڑتا ہے آخر تک بحث کئے جاتی ہوں۔ اکثر دن میں کئی بار بھائی جان اور جاوید سے چیخ چیخ ہو جاتی اور بعض وقت تو نوبت یہاں تک پہنچتی کہ صرف امی کی ڈانٹ ہی ختم کرتی بہرحال میں نے خیال کیا جہاں بھائی جان مجھے ستانے ہر روز نت نئے ڈھونگ رچایا کرتے وہاں یہ بھی ایک نئی چال ملی ہو اور کبھی بھائی جان کی سنجیدگی اس خیال کو غلط ثابت کرتی۔ الغرض دیر تک اس کشمکش میں مبتلا رہی اللہ۔ کہیں بھائی جان کی باتیں سچ نہ ہوں اور واقعی اگر ایسا ہے تو پھر کیا ہو گا۔ اسی طرح سوچتے سوچتے کھڑکی سے نگاہیں صحن میں جو پڑیں تو کویٹ کے درخت کو دیکھتے ہی نہ جانے کیوں خوف کے مارے جھرجھری سی آ گئی۔ ساتھ ہی کوٹیوں کے سوراخوں نے اور بھی شبہ پیدا ڈال دیا۔ آخر یہ کوٹیوں میں سوراخ کیوں نکلتے ہیں شاید چڑیل کے سایہ کا اثر ہو۔ کچھ دیر تک درخت کو دیکھتی رہی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سچ مچ درخت پر چڑیل ہے اور جب میں بھائی جان سے باتیں کر رہی تھی تو اس نے میرا چیلنج بھی سن لیا ہو۔ ہائے اللہ اب کیا ہو گا۔ مارے ڈر کے نظر میں ٹالبو ناول جو بھائی جان کے آ دھمکنے کی وجہ سے بند کر دیا تھا پھر سے دوبارہ پڑھنا

شروع کیا مگر تو بہ کیجیے جو پل بھر کو دل لگا ہو اسی کشمکش اور بے چینی میں شام ہوگئی رات کی تاریکی کے ساتھ میرے ۔۔۔۔ خوف میں بھی اضافہ ہونے لگا کسی سے کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہ تھی ۔ آخر سب لوگ کیا کہینگے ۔ اتنی ڈرپوک ہے یہ لڑکی اور پھر بھائی جان تو جینا ہی مشکل کر دینگے ۔

رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر تک میں بھائی جان اور جاوید ریڈیو سنتے رہے بھائی جان کو پروگرام کچھ پسند نہیں آرہا تھا ۔ یہ اسٹیشن تبدیل کرنے لگے ابھی کوئی اسٹیشن ملانے ہی نہ پائے تھے کہ باہر سے مرغی کی بھیانک آوازآئی جیسے کوئی اس کا گلا پھاڑ رہا ہو ۔ ہم تینوں باہر لپکے مگر بلّی مرغی کو دبوچ چکی تھی ۔ عجیب طرح طرح کی وحشت ناک آوازیں نکال رہی تھی ۔ اس منظر نے جانے کیوں چڑیل کا تصور میرے دماغ میں پھر سے تازہ کر دیا ۔ ڈر سا ہونے لگا ۔ بھائی جان نے اپنے کمرے کا رخ کیا اور جاوید کو امی نے کسی کام سے پکار لیا ۔ میں ڈرتی ڈرتی اپنے کمرے میں داخل ہوئی ۔ دس بج چکے تھے سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی دیر تک پیہم کوششوں کے بعد بھی نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا طرح طرح کے ڈراؤنے خیالات پریشان کر رہے تھے ۔ کوہیٹ کی چڑیل نئے نئے روپ میں آنکھوں میں گھوم جاتی اور میں خوف کے مارے لرز لرز جاتی ۔ کچھ ایسی دہشت سوار تھی کہ کسی طرح چڑیل کا خیال دماغ سے نکالے نہیں نکلتا تھا ۔ لاحول بھیجی آیۃ الکرسی پڑھ ڈالی چاروں قل دھرائے اسی کشمکش میں نہ جانے کب آنکھ لگ گئی ۔ مگر آج چڑیل خواب میں بھی مسلط تھی ۔ میں نے دیکھا کہ درخت پر واقعی چڑیل دکھائی دے رہی ہے اور پھر آہستہ آہستہ اتر کر اس نے میرے کمرے کا رخ کیا ۔ گھبرا کر آنکھیں جو کھولیں تو فقط دم ہی نکل گیا ۔ خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ چیخ تک نہ نکل سکتی تھی کیونکہ بازو کے کمرے سے عجیب عجیب آوازیں آرہی تھیں ۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی دم میں چڑیل مجھے آدبوچے گی اور ساتھ ہی مجھے اپنا دیا ہوا یہ چیلنج بھی یاد آگیا ۔ جسم میں کاٹو تو لہو نہیں تھا کچھ سوجھائی نہ دیتا تھا کہ کیا کروں نہ ہی اٹھ کر لائٹ جلا کر دیکھنے کی ہمت تھی اور نہ ہی چیخنے ہی کی سکت ۔ لمحہ بہ لمحہ آوازیں عجیب تر ہوتی جاتی تھیں ۔

دفعتاً ایک زور کی آواز آئی اور نہ جانے میں نے کیسے ایک چیخ مار ہی دی۔
جب مجھے اپنے آپ کی خبر ہوئی تو امی مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر پکار رہی تھیں۔ امی
کی آواز سن کر جان میں جان آئی آنکھیں کھول کر دیکھا تو پاس ہی بھائی جان
مجسم سوال بنے کھڑے تھے اور میں بس سمجھ لیجئے سراپا حیرت و استعجاب
سلمیٰ! آخر بتاؤ بھی تو کیا ہوا۔ مجھے امی کی آواز آئی۔ میں نے اپنے حواس یکجا
جمع کرتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی۔ بازو کے کمرے سے عجیب عجیب
آوازیں آرہی ہیں" بھائی جان نے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے
کمرے کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں ایک بار پھر آوازیں سنائی دیں اور میں
سہم گئی۔ اب امی بھی سٹپٹا گئیں۔ بھائی جان نے ایک لمحہ کو غور سے آواز سنی
اور دوسرے لمحے ان کے بلند قہقہے کمرے کی فضا پر مسلط تھے اور میں حیرت و استعجاب
میں ڈوبی ہوئی ان کو دیکھ رہی تھی ان کی اس بے موقع ہنسی امی کو بھی اچھی نہ لگی
بھئی آخر ماجرا کیا ہے ظہیر! اور تم ٹھٹھے کیوں لگا رہے ہو کوئی بات بھی
آخر۔ امی نے قدرے سختی سے کہا۔ ادھر مجھ پر شرم طاری! اب مجھ میں ہمت بھی
آگئی تھی۔ دیکھئے نہ امی انہیں تو ہمیشہ ایسی ہی بے تکی حرکتیں سوجھتی ہیں۔ میں نے
بمشکل یہ جملہ ادا کیا۔ خدا کی قسم سلمیٰ تمہاری عقل و سمجھ کے فقط قربان جانے کو طبیعت چاہتی
ہے بھائی جان نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ میرے پلّے خاک نہیں
پڑ رہا تھا البتہ بھائی جان پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ مذاق کا بھی ایک وقت ہوتا ہے
بھائی جان میں نے شوخی سے کہا ہر وقت آپکو صرف یہی کام یاد رہتا ہے اور ہر وقت
آپکو صرف احمق پن ہی یاد رہتا ہے۔ بھائی جان نے جواب دیا۔ قبل اسکے میں یا
امی کوئی جواب دیتیں یہ حضرت مجھے گھسیٹ کر بازو کے کمرے میں لے گئے۔ نہ معلوم
داخل ہوتے ہوئے میرا ہارٹ کیسے نہیں فیل ہوا۔ امی بھی آگئیں۔ وہاں جاکر جو ایک لمحہ
کیلئے غور کیا تو یقین مانیئے تھوڑی دیر کے لئے مرنے مر جانے کو جی چاہا۔ وہ بھوت
چڑیل کی آوازیں تو خاک نہیں تھیں بلکہ ریڈیو چل رہا تھا جو میری عادت کی وجہ
سے اتفاقاً کھلا رہ گیا تھا اور چین کے کسی اسٹیشن سے پروگرام ہو رہا تھا جسکی ہر ویسی
زبان کو میں نے اپنے ڈر اور خوف میں کیا سے کیا سمجھ لیا۔ مگر یہ آدمی ذات کو

پروگرام کی بھی خوب ہی رہی مگر دوسرے ہی لمحہ میٹرک میں پڑھا ہوا عرض بلد طول بلد
کا فرق اور اوقات کی کمی بیشی کا سبق دماغ میں گھوم گیا۔ اس کے بعد یہ بتانا بیکار
ہے کہ بھائی جان نے ستا ستا کے میری کیا گت بنائی ہوگی۔ تاہم میں نے اپنی بات گرنے
نہ دی اور کہا : ہاں صاحب میری جگہ اور کوئی بھی ہوتا تو ایسے ہی ڈر جاتا۔ گہری
نیند میں دھوکا کھا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں میں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش
کی وہ تو میں نیند میں تھی اور آوازیں آ رہی تھیں اس لیے ڈر گئی ورنہ واقعی اگر کہیں چڑیل
بھوت نظر آ جائے تو کبھی نہ ڈروں میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ میری اس خواہ مخواہ کی بہادری
پر امی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ کیا کہتے ہیں جناب آپ بس خاتمہ ہی تو کر دیں گی
اس غریب کا بھائی جان نے میری پیش کی ہوئی صفائی کا بری طرح مذاق اڑاتے
ہوئے کہا نہ معلوم یہ حضرت کب تک میری جان کھاتے مگر امی نے قصہ ختم کیا اور
سب اپنے اپنے کمروں میں سونے چلے گئے۔ صبح ہوئی یہ میرے لئے مصیبت کا
پیغام تھی کیونکہ دن بھر بھائی جان اور جاوید کے لئے میں ستانے اور مذاق
اڑانے کا بہترین موضوع بنی رہی۔ یہ جاوید حالانکہ چھوٹا ہی ہے ایسے نیک
کاموں میں وہ بھائی جان سے ذرا بھی کم نہیں۔ ان لوگوں کے جواب میں نے
وہی رات والی دلیل پیش کر دی اور چارہ ہی کیا تھا۔ مگر یہ طلسم بھی ایک دن میں ٹوٹ
کر ہی رہا وہ یوں سمجھئے کہ اللہ میاں کو بھی کچھ مجھے ستانے کی سوجھی تھی۔ شام
کے کھانے کے بعد جب سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے امی نے مجھے باورچی خانے
بھیجا کہ دیکھ آؤں شرفو نے کوئی چیز کھلی تو نہیں چھوڑ دی۔ جیسے ہی صحن میں
آئی درخت کے سایہ کے ساتھ ایک جسم کا سایہ نظر آیا۔ ڈر کے مارے دل کی
حرکت بند ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ہمت کر کے اوپر جو نظریں اٹھائیں تو اف میرے
خدا! وہاں ایک جسم ٹہنی سے دوسری ٹہنی پہ اچک پھلانگ کر رہا تھا اور شاید مجھے
دیکھتے ہی ایک ڈالی پر رک گیا اور ساتھ ہی میرے ذہن میں چڑیل کو دیا ہوا،
چیلنج گونج اٹھا۔ سکتہ کا سا عالم تھا جنبش تک نہ کر سکتی تھی۔ یکایک میرے برابر ایک
گول سی چیز آ گری میں سمجھی بس اعلان جنگ ہے۔ چڑیل بری طرح بپھری ہوئی ہے
اور ساتھ ہی ایک زوردار چیخ بلند کی۔ سب کے سب دوڑے آئے۔ [illegible]

بھائی جان صورتِ حال کو سمجھ گئے اور جیسے ہی درخت کی طرف غور سے دیکھا ان کے
منہ سے بے اختیار نکل پڑا ارے جاوید! اب میری سمجھ میں آیا کہ حضرت جاوید
ابا اور امی کے ڈر سے رات کو چوروں کی طرح اپنا شوق پورا کرنے درخت پر
متمکن ہیں اور وہ گول سی گرنے والی چیز ایک شامت کا مارا کوبیٹ تھا جو جاوید صاحب
کے ہاتھ سے گھبراہٹ میں گر پڑا ابھی سب متحیر ہی کھڑے تھے کہ امی نے گرجنا
شروع کیا۔ بیچارے جاوید کی ایسی حالت تھی کہ نیچے اترتے بنتا تھا اور نہ وہیں
قرار تھا۔

چلو جاوید! نیچے اترو ابا نے ڈانٹ بتائی اسکے بعد انہوں نے خود تو اپنے
کمرے کا رخ کیا اور جاوید صاحب عرش سے زمین پر تشریف لائے مگر یہاں انکی
تواضع کرنے امی کیا کم تھیں ان کی جیسی کچھ مرمت ہوئی ہو گی ظاہر ہے مگر ادھر میری
جان عذاب میں تھی خفت اور ندامت سے گڑی جاتی تھی۔ خیریت اسی میں تھی
کہ چپکے سے کھسک جاؤں اپنے کمرے میں آکر سر جھکائے بیٹھی تھی اپنے آپ
پر بے حد غصہ آرہا تھا ادھر بچہ الگ پٹ گیا گو یہ حضرت اس قابل تھے اور ادھر
میری اپنی خرابی الگ۔ پانچ منٹ بھی نہ گزرے ہونگے بھائی جان آ وارد ہوئے
جی! آداب عرض کرتا ہوں قائل ہو گئے آپکی بہادری کے بھائی جان نے کہا
وہ کام کیا آپ نے جو رستم سے نہ ہو گا۔ خود تو بھلا کیا کرتیں البتہ امی کے شیطان کو پٹوا
دیا۔ واللہ کسقدر معاملہ فہم ہو۔ بچے ہیں اور بھوت میں تیز تو خوب کی ان کی زبان
قینچی کیطرح چل رہی تھی۔ ان کی تو بن آئی تھی ایک نیا مذاق ہاتھ آیا تھا۔ دوسرے
روز دن تمام بھائی جان مجھے اپنے چبھتے ہوئے جملوں کا نشانہ بناتے رہے اور جاوید
الگ کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا اور میری حالت بس آسمان دور اور زمین سخت تھی

کایا پلٹ

افسانہ

(رفیعہ عبدالحمید کشش)

پھر ایکبار ہندوستان پر فساد کے دیوتا نے پتھر پھینکنے شروع کر دیئے انسانیت کے جنازے نکلنے لگے۔ رقابت کی آندھیوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے باغ بے گل، خانہ بے چراغ ہو رہے تھے۔ ایسے میں تاریک سے مکان میں نواب افضل حسین کی بیوہ اپنی آخری سانسیں پوری کر رہی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں یکسانیت کی جستجو فضول ہے کیونکہ یہ تو وہ باغ ہے جہاں بہار بھی کروٹیں لیتی ہے اور خزاں بھی نواب افضل حسین کے مرنے کے بعد انکی بیوی نصرت کا آفتاب زندگی غروب ہو گیا اور سیاہی نے اپنی چادر پھیلا دی لیکن اس اندھیری رات میں دو ننھے ننھے ستارے چمک رہے تھے وہ ننھے عشرت اور امجد...... انکے جیٹھ نواب تجمل نے انکی زندگی کو اور بھی زیادہ تنگ کر دیا، نواب افضل کی جتنی بھی جائداد تھی خود وارث بن بیٹھے۔ زمانے کا دوسرا نام مکر اور جبل ہے اور یہی تو ہے تاریکی میں اپنی پرچھائیاں تک جدا ہو جاتی ہیں...... بس نیک بختی کا ساتھ کون دیتا.... نصرت کی رگوں میں شریف خون تھا...... اس نے کسی سے فریاد نہ کی اور کرتی بھی کس سے قانون تو قصر و ایوان میں پہنچ کر اندھا ہو جاتا ہے اس کے علاوہ اس کی غیبت کی لو بھی بھڑک اٹھی۔ عشرت اور امجد کو لے کر وہ اپنے چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئی جب خون جگر سے ملے ہوئے یہ ننھے ننھے پودے اپنی بہار دکھلانے لگے تو باغبان کے رخصت ہونے کا وقت آن پہنچا۔ ہوا کے تیز جھکڑ نے زندگی کی شمع گل کر دی۔ امجد اور عشرت بے سہارا ہو گئے۔ قریب ہی ہم بیشمار رنج و ملال کی جگہ خوف و وحشت نے لے لی۔ عشرت سہم کر بھائی سے لپٹ گئی۔ چند لمحوں کے بعد ایک برقعہ پوش لڑکی اور ایک پریشان حال نوجوان اندھیرے میں بھٹکتے پھر رہے تھے، رات کے اندھیرے میں کچھ سجھائی نہ

دیتا تھا، حوادثات زندگی نے انکو کچھ نڈر بنا دیا تھا۔ اس وقت وہ سوائے خدا کے اور کسی کی مدد کے خواہاں نہ تھے۔

ریل بڑی تیزی سے آگے بڑھتی جارہی تھی۔ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں غم نصیب عشرت اور امجد بیٹھے اپنے مستقبل کا تصور کر رہے تھے۔ سیاہ برقعہ میں ملبوس پھول پژمردہ ہوگیا تھا۔ عشرت کبھی کبھی تیزی سے گذرتی ہوئی زمین پر اپنی تھکی ماندہ نظریں گاڑ دیتی۔ وہ خیال کرتی کہ اب یہ زمین ختم ہوجائے گی۔ لیکن زمین کے گذرنے کے بعد ..... پھر زمین ..... اور وہی تیرگیاں۔ آخر ایک جگہ وہ اتر پڑے اپنی منزل سے بے حقیقی ..... جب انسان پر غم والم کا کوہ ٹوٹ پڑتا ہے تو اس کا دماغ بھی پرواز کرنے لگتا ہے۔ زمانے نے ایسے گہرے نقوش انکے دل و دماغ پر مرتسم کئے تھے کہ امجد نے بھی خود میں ایک قوت محسوس کی وہ اس طوفان سے بھی کسی نہ کسی طرح گذر جائے گا لیکن ...... جب وہ عشرت پر نظر ڈالتا ..... تو اس کے بعد ہی اسکی نظریں آسمان کی جانب اٹھ جاتیں، نہ جانے کیوں۔ وہ اسٹیشن سے نکلکر وسیع و عریض سڑک پر گامزن ہوئے تو عشرت نے پوچھا "کہاں چلنے ہو بھیا؟" امجد نے چونکا۔ پڑا ارے یہ تو نہیں معلوم .... اس نے سوچا۔ ایک موٹر قریب آکر رکا ایک خوش پوش اور خوش وضع نوجوان نے سر باہر نکالتے ہوئے کہا "جناب آپکی نظریں بتلاتی ہیں کہ آپ اس شہر میں اجنبی ہیں۔ کیا میں آپکی مدد کرسکتا ہوں" ...... لہجہ کی شیرینی اور خلوص، اور نگاہوں کی تسرادنت نے لمحہ بھر میں وہ کام کیا جو رسمی ہمدردی لاکھو بار بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہ ڈاکٹر نجم الحسن تھے سارے شہر میں ان کے علاج اور اخلاق حسنہ کی دھوم تھی ..... امجد پر پہلی مرتبہ ہمدردی کی نگاہیں پڑی تھیں۔ آپکی مہربانی کا شکریہ" کیا یہاں کوئی چھوٹا سا مکان مل سکتا ہے" ڈاکٹر نجم نے کہا" جی مل تو سکتا ہے۔ لیکن فی الحال آپ دونوں میرے ہمراہ چلئے مکان ملنے پر آپ منتقل ہوسکتے ہیں ورنہ آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑ جگی ...... امجد نے احسانمندانہ نظروں سے نجم کی طرف دیکھا پھر عشرت کو بالآخر وہ دونوں موٹر میں سوار ہوگئے۔ نجم نے ابتک عشرت کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا پہلی مرتبہ اس نے نگاہ غلط انداز اسپر ڈالیں۔ اس کا حسن برقعہ میں سے بھی ضیا پاشیان

کر رہا تھا۔ "آپکی تعریف" وہ پوچھ بیٹھا۔

"عشرت ۔ ۔ ۔ ۔ میری بہن ہے" امجد نے کہا نہ جانے کیوں ڈاکٹر نجم الحسن کی آنکھوں میں مسرت نے ایک کروٹ لی اور انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

موٹر ایک بڑی کوٹھی میں داخل ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ عشرت اور امجد نے غربت میں پرورش پائی تھی لیکن انہوں نے بھی کبھی ایسی ہی فضا میں سانس لیا تھا۔ ڈاکٹر نجم الحسن اترے اور دروازہ کھولکر امجد اور عشرت کو بھی ساتھ لئے ہوئے آگے بڑھے۔ "صفو اے صفو ۔ ۔ ۔ ۔ کہاں ہو بھئی دیکھو آج ہمارے مہمان آئے ہیں۔"

صفیہ ڈاکٹر نجم الحسن کی چہیتی بہن تھی۔ "بھائی جان آ تو رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اررے۔" اسکانے دیکھا کہ ایک سیدھا سادھا شکیل نوجوان ایک برقعہ پوش لڑکی کو لئے کھڑا ہے۔ وہ سنبھل گئی۔ "لو تم اپنی بہن کو لیجاؤ" "اور کچھ ناشتہ وغیرہ کی تیاری کرو ۔ ۔ ۔ بس باقی آئندہ" نجم نے کہا اور خود امجد کو غسل خانہ دکھا کر نوکر سے کہدیا کہ جب وہ نکلے تو باغ میں بھیجدے۔

صفیہ حسین تو نہ تھی لیکن اس کے چہرے پر ملاحت بلا کی تھی وہ بے پردہ تھی لیکن عام لڑکیوں کی طرح بے باک نہیں تھی۔ جب وہ عشرت کو لے کر اندر پہنچی اس نے اپنا برقعہ اتارا ہر چند کہ اسپر افسردگی اور تھکن کا غلاف چڑھا ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ تیسرے پہر کا آفتاب معلوم پڑتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے کپڑے بدلے اور ناشتہ کرتے ہوئے صفیہ نے اس کی داستان سن لی۔ اس قلیل عرصہ میں صفیہ اور عشرت اسقدر قریب ہو گئے تھے جیسے برسوں کی ملاقات ہو۔

نجم نے امجد سے اسکی الم انگیز داستان سننے کے بعد تسلی دی اور اس سے کہا کہ اس حالت میں تو وہ اس کو ہرگز کہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا اور سچ تو یہ ہے کہ امجد اور انجم دونوں میں ایک طرح کا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ نجم کے حسن اخلاق نے امجد کو اپنا گرویدہ بنایا۔

ناشتہ کے بعد کچھ دیر تک صفیہ اور عشرت میں باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد وہ بھی اٹھ کر باغ میں گئیں۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ امجد اور نجم بھی یہیں ہیں۔

یکایک عشرت اور نجم کا سامنا ہوگیا وہ گھبرا کر درخت کی اوٹ میں ہوگئی لیکن اتنا ہی کافی تھا ڈاکٹر نجم الحسن کچھ دیر سکتے میں آگئے لیکن جلد ہی خود پر قابو پالیا امجد نے آواز دی "عشرت بہن .... کیا نجم صاحب سے پردہ کروگی وہ تو اپنے محسن ہیں .... آجاؤ" اور عشرت پسینے میں شرابور زمین میں نگاہیں گاڑے ہوئی صفیہ کے ہمراہ آئی۔ صفیہ نے سب کچھ دیکھ لیا تھا ..... آپ ہی آپ مسکرا کر چپ ہو رہی۔ نجم نے لاکھ چاہا کہ عشرت کی جانب نہ دیکھے لیکن نادانستہ طور پر نگاہیں اٹھ ہی گئیں۔ لیکن جب صفیہ کو نگراں پایا تو گھبرا گئے عشرت گو نیچے نظر کئے بیٹھی تھی تاہم اس نے بھی نجم کی گھبراہٹ محسوس کی اور اچھی طرح صفیہ کی اوٹ میں ہو بیٹھی۔ عشرت نے ایک قسم کا سکون پایا تھا اسے اب صرف اپنی اس ماں کی یاد ستا رہی تھی جسکو انہوں نے لاوارث چھوڑا تھا۔ نجم اور صفیہ بھی چونکہ یہ چوٹ کھا چکے تھے اس لئے انکی افسردگی نے انہیں بھی ملول کردیا کچھ دیر بعد یہ صحبت ختم ہوئی نجم اپنے مطلب چلے گئے۔ عشرت اور صفیہ الگ جا بیٹھیں اب امجد کو موقعہ ملا کہ اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچ سکے۔ مصائب کی شدت نے اس کے ضمیر کو بیدار کردیا تھا۔ اگر نجم نے اس کو پناہ دی تھی تو اس کے یہ معنی تو نہیں تھے کہ وہ عمر بھر اسکی روٹیاں توڑے اسکے احساس خودداری کو کاری ضرب لگی۔ وہ کسی صورت میں بھی انجم پر بار ثابت ہونا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نیا شہر وہ کچھ کر بھی تو نہ سکتا تھا۔ آخرکار بیکاری میں اس نے اپنا رفیق شاعری کو پایا اب ملک کو بھی نوشاعروں کی ضرورت تھی جو سوتوں کو جگا سکیں انہیں انسانیت کا درس دے سکیں۔ اس نے غزلیں لکھنی شروع کردیں .... جب اس کی پہلی غزل شائع ہوئی اور اس کی خوب خوب تعریفیں کی گئیں تب اسے معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہے اس کے اشعار میں تکلف وبود کی کشش ہوتی خصوصًا اس کی وہ نظم جس میں اس نے موت اور زندگی کی حقیقتوں کو بیان کیا تھا بہت پسند کی گئی۔

عشرت اور امجد کو یہاں رہتے ہوئے ۸ ماہ سے زائد ہو چکے تھے وقت کے مرہم نے انکے دلوں کے زخموں کو کچھ مندمل کردیا تھا۔ وقت گذر گیا تھا ایک دفعہ صفیہ اپنی کسی سہیلی کے ہاں مخلوط پارٹی میں گئی ہوئی تھی لیکن عشرت نے

پردے کے خیال سے انکار کر دیا امجد اپنے جاری کردہ رسالے کا کام بڑے انہماک سے کرتا رہا۔ عشرت تنہائی سے گھبرا کر باغ میں چلی آئی خدا جانے کس خیال میں گم ہوگئی۔ ڈاکٹر نجم جب واپس آئے تو معلوم ہوا کہ صرف عشرت باغ میں موجود ہے وہ وہیں جانے لگا پھر ٹھٹک کر رہ گیا اس نے سوچا عشرت کیا خیال کرے گی۔ خفا ہوگئی تو ـــــ . . . . . وہ عرصہ سے کوشش کر رہا تھا کہ عشرت سے وہ سب کچھ کہہ دے جو اس کے دل میں تھا لیکن ہمت نہ پڑتی تھی۔ جب سے نجم نے عشرت کو دیکھا تھا وہ اسے بہت پسند کرنے لگا تھا اور جب اس نے اس کی سیرت کا مطالعہ کیا تو یہ پسندیدگی بے پناہ محبت میں تبدیل ہوگئی۔ لیکن اس کا برتاؤ ہمیشہ شریفانہ رہا اس سے عشرت کے دل میں بھی اس کی منزلت اور بڑھ گئی۔ آخر وہ چل پڑا "میں آسکتا ہوں" عشرت اس کی غیر متوقع آمد سے پریشان سی ہوگئی۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد نجم نے کہا تو کیا واپس چلا جاؤں" عشرت نے گھبرا کر کہا "نہیں نہیں . . . . . بیٹھئے آپ جانے کے لئے تو . . . نہیں کہا . . . تشریف لائیے۔ کچھ دیر سکوت کے بعد نجم نے کہا عشرت میں عرصہ سے تم سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اندیشہ تھا کہ کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ . . . . . نجم نے جرأت کرکے کہا۔ عشرت نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی کچھ کچھ نجم کا مطلب سمجھ گئی۔ کیونکہ اس کے معصوم دل میں بھی تو وہی آگ بھڑک رہی تھی۔ نجم اس وقت جو کچھ بھی کہہ رہا تھا یہ سب اس کے دل کی ہر دھڑکن کہہ رہی تھی۔ اس نے سیدھے سادے الفاظ میں سب کچھ عشرت سے کہہ دیا۔ عشرت حیران تھی کہ آج نجم کو کیا ہوگیا ہے۔ اس نے سنبھل کر کہا۔

نجم صاحب، آپ غریبوں کی زندگی کا کیوں مذاق اڑا رہے ہیں لیکن جلد ہی اس کی غلط فہمی دور ہوگئی۔ کیونکہ محبت ان تمام قیود سے آزاد ہے۔ محبت ایک ایسا جنون ہے جو دو اجزاء کو ایک کر دیتا ہے اور آخر کار نجم اور عشرت بھی ایک ہوگئے۔

وہ دونوں بہت مسرور تھے جیسے راز زندگی پا لیا ہو۔

ایک روز نجم کی کوٹھی میں خوب چہل پہل تھی۔ آج ڈاکٹر نجم الحسن نے اپنی

شباب

بہن کی شادی کی مسرت میں احباب کو پارٹی دی تھی۔ کیونکہ نجم اور عشرت کی شادی کے بعد ہی امجد اور صفیہ بھی اسی بندھن میں باندھے گئے تھے دوسرے دن اخبار میں ایک اعلان آیا یہ نواب تجمل کی جانب سے تھا۔ وہ سخت بیمار تھے اور جلد از جلد عشرت اور امجد جہاں کہیں بھی ہوں پہنچنے کی تاکید کی گئی۔ ان کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی اب عشرت اور امجد نے بے سروسامانی کی حالت میں جس شہر کو چھوڑا تھا وہیں اب شادکام واپس لوٹ رہے تھے صفیہ اور نجم بھی ساتھ تھے جب وہ نواب تجمل کے پاس پہنچے تو انکے چل چلاؤ کا وقت تھا سکرات کے عالم میں تھے سچ ہے مظلوم کے آنسوؤں میں سمندر کے مد و جزر سے بھی زیادہ طاقت پنہاں ہوتی ہے عشرت کے آنسو اپنا کام کر گئے ان کے دیکھتے ہی نواب صاحب کے آنسو ڈھلک آئے زبان سے تو کچھ کہہ نہ سکے صرف ایک دستاویز امجد کے ہاتھ میں تھما دی اور ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئے۔ چچا چاہے کیسے کیوں نہ ہوں لیکن امجد اور عشرت پر انکی موت کا گہرا اثر ہوا۔ کیونکہ وہ مرتے وقت اپنی حرکتوں پر پشیمان تھے۔ بھائی کی جائداد کے علاوہ انہوں نے اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ امجد اور عشرت کے نام لکھ دیا تھا اب عشرت نجم، صفیہ اور امجد آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

یہ سب زمانے کی نیرنگیاں نہیں تو اور کیا ہیں!

بقیہ سلسلہ صفحہ (۲۷)

بیوبل اگر اسکی بیماری تو دور نہ بھی کر سکیں تو یہی کیا کم ہے کہ ایک بیمار کو اس سے وہ خوشی پہنچ جائے جو اسکی بیماری کو آدھی کر دے اور پھر عورت کی نظروں میں اس ہستی کا کتنا کچھ وقار نہیں بیٹھ جاتا جو محض اس کے لئے اس کے دکھ کو مٹانے کی خاطر اپنا قیمتی وقت اس پر نثار کر سکتا ہو۔ مگر یہ تو وہی سمجھے جو ازدواجی زندگی کی اہمیت سے واقف ہو ورنہ آجکل تو عام طور پر شادی ایک کھیل اور بیوی ایک کھلونا ثابت ہوتی ہے۔

شباب

دکھ درد کے ساتھی

صغرا عبدالسبحان

ساجدہ کہہ رہی تھی "حمید صاحب کو تو میری بیماری سے چڑ ہے۔
انسان ہوں کبھی سال چھ مہینے میں پڑ جاتی تو جیسے میرے ساتھ انکو بھی بخار
آتا ہے۔ صفیہ نے کہا اجی تو اس سے بڑھ کر اچھی بات کیا ہے۔ اکیلی بخار میں
پھنکتی ہو وہ بیچارہ تو تمہارا ساتھ ہی دیدیتا ہے۔ "خوب گذرے گی جو مل بیٹھ
دیوانے دو" کہنے لگی ارے نہیں بھئی ایسا بخار تھوڑی ہوتا ہے جو خدانخواستہ
میرا ساتھ دیں۔ انکو تو غصہ کا بخار چڑھ جاتا ہے جب تک میں بیمار رہونگی کبھی
سیدھے منہ بات نہیں کرتے کبھی تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ بس کرو اپنا یہ ڈھونگ"
ساجدہ جیسی شوہر پرست لڑکی کے منہ سے یہ باتیں سن کر ذرا تعجب ہی ہوا۔
ٹھیک ہے کہ ہنسنے والوں کا سب ساتھ دیتے ہیں جب تک تم خوش رہو دنیا
لفظی معنوں ہی میں ہنستی ہوئی دکھائی نہ دے گی۔ بلکہ واقعی تمہارے قہقہوں کا
جواب قہقہوں میں ملیں گے لیکن جب تم پر کوئی دکھ آ پڑے جب تم کو مصیبت
اور پریشانی کے انبار اپنے گرد دکھائی دیں اس وقت تمہارا ساتھ دینے کوئی
نہیں آتا۔ کلفتوں اور آفتوں کو ہمیشہ اکیلے ہی جھیلنا پڑتا ہے "کہ تاریکی
میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انسان سے" مگر یہ دنیا بھی عجیب ہے اور دنیا والے
عجیب تر۔ کہتے ہیں "شادی ایک حسین بندھن ہے" ! مرد شریک زندگی بنتا ہے
عورت رفیق حیات کہلاتی ہے۔ لیکن کتنے دن؟ اپنی پسند کی شادی ہوئی تو چار
چھ مہینے کی جگہ سال دو سال ہی سہی۔ ان ایام میں عورت اپنے بخت کی بلندی
کو کمال عروج پر سمجھتی ہے اور پھر وہ بخت اٹھ گئے اور بلندی کا رہ گئی۔ پھر وہی
بستی اپنی کم نصیبی اور تیرہ بختی کا ماتم کرتی نظر آئے گی۔ آخر یہ کیوں؟ قصور
کس کا؟ سزاوار کون؟ یہ کسطرح کہا جائے اور کون کہہ سکتا ہے۔ یہ گتھی جو ہی
آپس میں سلجھا سکتے ہیں جو ایک دوسرے کے جیون ساتھی بنتے ہیں۔ بظاہر
دونوں ہی قصوروار ٹھہرائے جا سکتے ہیں لیکن پلہ کس کا بھاری ہوتا ہے۔

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۷)

سرپرستی خاص اعلیحضرت خسرو دکن و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

دور عثمانی کی وہ مستند مصنوعات جن کے مفید ہونے سے دنیا کی کوئی ہستی انکار نہیں کر سکتی

ہر جگہ ملتے ہیں

نظام ٹیبلیٹ ہیر آئیل

دکن ہیر آئیل

گولڈن اسنو

دکن ہیر کریم

دکن ٹائیلٹ پوڈر

ذولفکس تین سال کے مسلسل تجربے کے بعد یہ تیل محض ان حضرات کی فرمائش پر تیار کیا گیا ہے جنکے بال کمزوری سے بکثرت گرتے ہیں۔ ذولفکس پوڈر زمین اور سر پر بال پیدا کرنے میں مفید ثابت ہوا ہے۔ ہم سے طلب فرمائیے قیمت فی بوتل علاوہ اخراجات
للعہ ۱۲ر چار روپیہ بارہ آنہ مقرر ہے

مبارک ہے وہ ملک جو اپنے ہی ملک کے مفید مصنوعات سے مستفید ہو رہا ہے
اور قابل فخر ہے وہ کارخانہ جو ایمانداری سے دنیا پر اپنا اعتماد قائم کرے

دکن ہیر آئیل کمپنی اعظم پورہ روبرو چمن پل چادرگھاٹ حیدرآباد دکن

شہاب

سالنامہ

مرتبہ

محمد عبدالرزاق بسمل

قیمت سالانہ (صہ)

جلد (۱۲) فروردی ۱۳۵۷ف م فبروری ۱۹۴۸ء نمبر (۱۵)

نوائے درد

جناب بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر

الٰہی خیر ہو کیوں ہو گیا ہے آسماں دشمن
نظر آنے لگا ہر پھول کو اب باغباں دشمن

نہیں شایاں مقدر میں حکومت شادکامی کی
کہ آزادی نہیں پختہ ہوئی خصلت غلامی کی

ابھی تو چھا رہی تھیں جنگ کی تاریکیاں گھر سے
اچانک چھا گیا پھر دورِ خونریزی نئے سر سے

وہ آنکھیں جو ہمیشہ دیکھتی تھیں خواب آزادی
وہی اب دیکھتی ہیں چار سو سامانِ بربادی

وہی اغیار کے بندے غلامی جن کی فطرت ہے
وہ کیا آزاد ہوں گے جن سے آزادی کو نفرت ہے

ملی ان کو حکومت جو حکومت بھول بیٹھے تھے
تباہی ان پہ چھائی جو اخوت بھول بیٹھے تھے

عوامی راج میں آزادیوں کی حکمرانی ہے
برستا ہے لہو ہندوستاں کی راجدھانی میں

کہیں مذہب کہیں حکام عبث بدنام ہوتا ہے
جہالت عام ہوتی ہے تو قتلِ عام ہوتا ہے

تعصب کی کشاکش تنگ نظری کی علامت ہے
ادھورا علم نااہلوں کی فطرت پر مصیبت ہے

تباہی ساتھ ہے بچ کر چلو اے کارواں والو
"نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!"

کافی

جناب سید سعید الدین صاحب پروفیسر

مشروبات جن میں کیفین (Coffeine) ہوتا ہے دنیا بھر میں محرک اور مفرح کے طور پر کسی نہ کسی شکل میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ کافی جس کا مبداء جنوب مغربی ایشیاء سے متصل خطے ہیں اب دنیا کی ایک تہائی آبادی استعمال کرتی ہے۔ کیفین، کونین، جیسا کہ ایک الکلائیڈ (alKaoid) ہے۔ وہ زیادہ مقدار میں یقیناً مضر ہے لیکن کافی اور ایسے ہی دوسرے مشروبات میں وہ دو فیصد سے شاید ہی زیادہ ہوتا ہے اسلئے معمولی طور پر تندرست جوان اسکے معتدل استعمال سے کوئی مضر اثر محسوس نہیں کرتا۔ اعتدال سے زیادہ استعمال مضرت رساں ہے۔ خصوصاً بچوں اور ایسے لوگوں کے لئے جنہیں اعصابی خرابی ہو۔

اگرچہ کافی سے زیادہ چائے استعمال کیجاتی ہے تاہم کافی اہم ترین مشروبات میں سے ہے۔

کافی کے درخت کا وطن حبش بتایا جاتا ہے جہاں اسکو (بیجوں کو) بن کہتے ہیں۔ مصر اور شام میں بھی یہی نام مستعمل ہے۔ بھونے ہوئے بیجوں کے سفوف کو قہوہ کہتے ہیں۔ دونوں نام فارسی اور عربی میں مستعمل ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ شہاب الدین نے کافی کو عدن میں رواج دیا۔ انہوں نے افریقی ساحل پر کافی کے استعمال سے واقفیت حاصل کی تھی۔ شیخ صاحب نے ۱۴۷۰ء میں وفات پائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی میں کافی کا رواج ہوا۔ وہ یمن سے مکہ میں لیجائی گئی۔ جہاں چند سال کے بعد ۱۵۱۱ء میں اس کے استعمال کو غیر قانونی قرار دینے کے متعلق زبردست کارروائی کی گئی۔ کافی قاہرہ، دمشق اور الیپو ہوتی ہوئی قسطنطنیہ پہنچی۔ جہاں ۱۵۵۴ء میں پہلا قہوہ خانہ قائم ہوا۔ اسکو وینس میں ۱۶۱۵ء، پیرس میں ۱۶۴۳ء، لندن میں ۱۶۵۲ء، لنکا اور جاوا میں ۱۶۹۰ء، ویسٹ انڈیا میں ۱۷۲۰ء اور برازیل میں ۱۷۶۰ء میں پہنچایا گیا۔ برطانیہ میں پہلا قہوہ خانہ ۱۶۵۲ء میں قائم ہوا۔
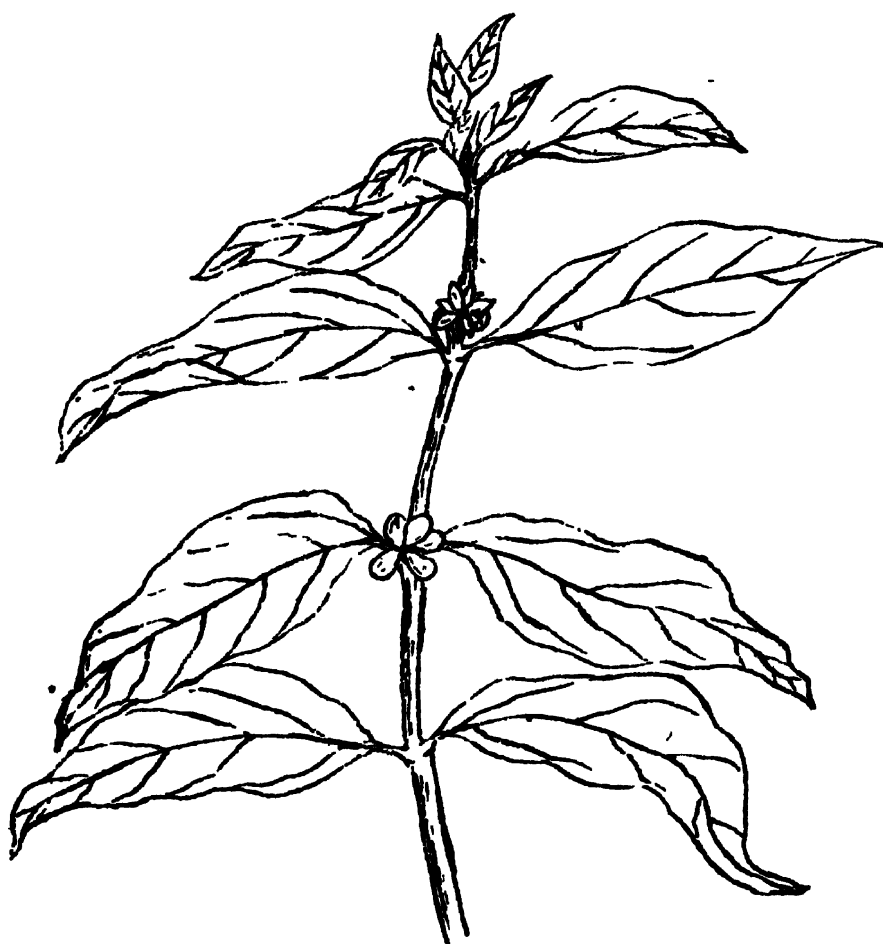
شکل ۳ - کافی کا درخت

بہت جلد قہوہ خانوں کی کثرت ہو گئی کیونکہ وہ علما اور مفکرین کے اجتماع کے مرکز بن گئے۔ ۱۶۷۵ء میں چارلس دوم کے قہوہ خانوں کے انسداد کیلئے شاہی فرمان نکلا اسکی وجہ سیاسی تھی۔ پیرس میں پہلا قہوہ خانہ ۱۶۷۲ء میں قائم ہوا۔ پھر بہت جلد کافی پورے یورپ میں پھیل گئی۔ اگرچہ کوکو سب سے پہلے یورپ میں استعمال کیا جانے لگی تھی۔ جو جنوبی امریکہ سے اہل ہسپانیہ کے توسط سے پھیلی تھی۔ آج امریکہ کافی کا سب سے بڑا خریدار ہے۔

۱۵۰۵ء میں لنکا میں پرتگالیوں کے حملہ سے قبل عربوں نے کافی کو رائج کیا۔ ۱۶۹۰ء میں ولندیزیوں نے کافی کی باضابطہ کاشت شروع کی۔ لیکن بعد میں اہل لنکا نے کاشت کرنی شروع کی۔ ۱۸۲۵ء میں سر اڈورڈ بارنس (Sir Edward Barnes) نے یورپی سرمایہ داروں کی کاشت کو فروغ دیا۔ ۱۸۶۹ء میں کافی کے درختوں پر ایک پھپھوندی کی مہلک بیماری پھیلی جس سے زبردست نقصان ہوا۔

ہندوستان میں کافی کے استعمال اور کاشت کے متعلق صحیح اندازہ قائم نہیں کیا جا سکا۔ اکثر و بیشتر مصنفین اس بات پر متفق ہیں کہ دو صدی قبل مکہ سے بابا بڈن صاحب نے کافی کے سات بیج میسور لائے تھے۔ جنوبی ہند میں یہ قصہ اتنا مشہور ہے کہ اس میں کچھ صداقت معلوم ہوتی ہے۔

کافی کے درخت (شکل ۴) کا لاطینی کافیہ اوریبیکہ (Coffea arabica) ہے جس سے دنیا کی ۹۰ فیصد کافی حاصل کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کافیہ کی دوسری انواع سے ۱۰ فیصد کافی حاصل ہوتی ہے۔ کافی کا درخت (اسکو جھاڑی یا چھوٹا درخت کہنا چاہیئے) ۱۵ فیٹ سے لیکر ۳۰ فیٹ تک بلند ہوتا ہے۔ سفید خوشبودار، تارہ نما پھول پتوں کی بغلوں میں گچھوں میں واقع ہوتے ہیں۔ پختہ پھل سرخ رنگ کا ہوتا ہے جس میں دو سبزی مائل بھورے بیج ہوتے ہیں۔ ان پر ایک پتلی جھلی ہوتی ہے۔ دونوں بیج ایک خشک سپر سے جیسی پوشش میں بند ہوتے ہیں۔ کبھی صرف ایک ہی بیج نشوونما پاتا ہے اور یہ اچھا سمجھا جاتا ہے۔

کافی کا درخت مداری کاشتوں سے تعلق رکھتا ہے اسکے لئے گرم اور مرطوب آب وہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ کم سے کم بارش ۵۰ انچ ہونی چاہیئے۔ لیکن

۱۲۰ انچ بارش میں وہ بہت اچھی طرح پھلتا پھولتا ہے۔ یوں تو کافی کے درخت کم بلندی پر اگائے جا سکتے ہیں لیکن اسکے اچھے نشوونما کیلئے پہاڑیاں موزوں ہوتی ہیں۔ کافی کو کامیابی کے ساتھ ۶۰۰۰ فیٹ بلندی تک اگایا جا سکتا ہے۔ پودے چھ چھ فٹ کے فاصلہ سے لگائے جاتے ہیں۔ پودوں کو سایہ کی ضرورت ہوتی ہے خودرو بوٹیوں کو مسلسل نکالتے رہنے کی ضرورت ہے۔ درخت تیسرے سال پھل دینا شروع کرتا ہے۔ پانچویں سال سے اچھے اور زیادہ مقدار میں پھل حاصل ہونے لگتے ہیں۔ تیس سال تک درخت کارآمد رہتا ہے۔ جب پھل پختہ ہو جاتے ہیں تو یا تو توڑ لئے جاتے ہیں یا زمین پر گر جانے دئے جاتے ہیں۔ پھر بیجوں کو پھیلا کر دھوپ میں سکھایا جاتا ہے اور بارش سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ بار بار بیجوں کو الٹنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ ہر طرف اور یکساں طور پر خشک ہوں۔ اس کے بعد مختلف طریقوں سے چھلکا وغیرہ علیحدہ کیا جاتا اور بالآخر بیج بھونے جاتے ہیں اس سے خوشبو، رنگ اور ذائقہ میں نمایاں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ بازار میں بھونے ہوئے بیج اور ان کا سفوف دونوں فروخت کئے جاتے ہیں۔ کافی میں کاسنی کے بیجوں کا سفوف کی بھی آمیزش کیجاتی ہے۔

کافی کی کاشت زیادہ تر جنوبی ہند ہی میں کیجاتی ہے۔ میسور، مدراس، کورگ ٹراونکور اور کوچین کی شہرت سے تو آپ واقف ہی ہونگے۔

۱۔ اخبار نویس کی صورت دیکھکر شیطان کا باوا ابلیس بھی کانپ جاتا ہے۔ (ولیم سٹیڈ)

۲۔ کیڑے مکوڑوں میں سے اخبار نویس بھی ہے۔ (ملکہ الزبیتھ)

۳۔ اے قلم تو نہایت خوبصورت ہے لیکن میری سلطنت میں تو شیطان سے بھی بدتر ثابت ہوا۔ (ذاتی رانی اولار مل)

۴۔ اے اخبار نویسو تمہیں نے مجھے برباد کر دیا (رانو بل نصرول بادشاہ بنگال ج)

۵۔ اگر جہنم کا پھاٹک بھی میں کھلا دیکھوں تو اتنا نہ ڈرونگا جتنا اخبار نویس کے نام سے ڈرتا ہوں۔ (جمہوریہ وزیر امریکہ)

۶۔ اس ملک میں ہر دس آدمیوں میں صرف ایک شخص کو اخبار پڑھنا چاہئے۔ (روزولٹ امریکہ)

۷۔ صحافت موجودہ عہد میں چوتھی طاقت کا نام ہے۔

چند شخصیتیں

کہتے ہیں کہ اعلیٰ خدمت، اخلاق کے جانچنے کی کسوٹی ہے اور وہ ایک ایسا محل ہے جہاں کردار بنتا، ڈھلتا، ترشتا ہے اور یہ مقولہ (اگر بدولت برسی مست نہ گردی مردی) صادق آتا ہے۔

ذیل میں چند ایسی ہستیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جنہوں نے ہر عہد، ہر دور میں اپنے صف مقابل کے بیٹھنے والوں کو "سلام" میں پیش قدمی کر کے ہمیشہ نادم اور شرمندہ کیا ہے۔

مقصود اس سے تحزب و تکبر نہیں ہے

البتہ دکھلانا یہ ہے کہ "ہند شاخ پر میوہ سر بر زمین" جنہوں نے جہد للحیات میں باوجود مدارج اعلیٰ پر فائز ہونے کے ہمیشہ وسعت اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے۔ حکومت اور خدمت کبھی انکی فطرت نہیں بدلی۔ کیونکہ الماس الماس ہی رہا ہے جس نے خذف کو کبھی بے مایہ نہیں سمجھا کیونکہ اس وسیع کائنات میں ایک ذرہ بھی اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے

۱۔ مولوی محمد بیگ صاحب اول تعلقدار وظیفہ یاب حال ناظم اسٹیٹ مہاراجہ آنجہانی جنکی اصابت رائے اور صیغہ مال کے معلومات مسلمہ ہیں۔ میرے ہم مکتب اور ہم جماعت تھے۔ جوں جوں وہ ترقی کرتے گئے عجز و فروتنی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اوس دن سے آج تک دہی بے تکلفانہ مراسم ہیں آپ نے مجھے کبھی اپنا ہم جماعت یا دوست نہیں سمجھا بلکہ عزیز ہی جانا ہر موقع اور ہر محل پر اپنی نوازشوں سے گرانبار اور مجھے منفعل و محجوب کیا ہے۔

۲۔ مولوی میر مہدی علی صاحب شہید (نواب شہید یار جنگ بہادر) سخن گو بذلہ سنج سخن فہم ہیں یہ میرے ہم مکتب تو نہ تھے لیکن اوسی عہد جہالت کی پیداوار میں ہیں اسے اور لطیفہ نیاز فٹ بال کلب کی شرکت کے سلسلہ میں ہوا اس دور میں وہ ترقی کرتے ہوئے صدر ہیں۔ صاحب خطاب بشاہزادوں کی صحبت میں بسر کرتے آئے ہیں۔ لیکن کبھی اپنے ملنے والوں سے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ آپکی طبیعت کی افتاد

عجیب واقعہ ہوئی ہے کہ دنیا یورپ کی سیاحت پہ جان دیتی ہے لیکن آپ اس سے دور رہا گئے ہیں بارہا یوروپ گئے ہیں لیکن ہمیشہ طفیل یہ تکلف بھی معدودے چند ہی والا معاملہ تھا۔ کیونکہ یورپ کی آزادانہ زندگی آپ کے مذہبی مشاغل میں مانع رہتی ہے مانا کہ وہ اوروں کے نزدیک نواب شہید یار جنگ ہوں لیکن میرے پاس تو بھی مہدی یا شہید ہیں۔

۳۔ مولوی سید محمد مہدی صاحب (نواب مہدی نواز جنگ بہادر) اوسی عہد ماضی کے متعارف ہیں۔ یورپ کی بارہا سیاحت کی ہے اور ترقی کرتے ہوئے، صدارت عظمیٰ کی معتمدی جیسی اہم اور ذمہ دارانہ خدمت گیارہ سال تک نہایت مستعدی سے ادا کی ہے جسکے کمپونڈ میں روز آنہ اہل غرض کا مجمع رہتا تھا۔ لیکن کبھی اپنے نیاز مندوں قدیم کو اس احساس کا موقعہ نہ دیا کہ وہ ایک موقع خدمت پر فائز ہیں۔

آپ میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ہر ہفتہ عشرہ میں قدیم اور جدید احباب کو بلاتے ہیں۔ جہاں ماضی کے داستانوں اور حال کے افسانوں میں وقت گذرتا ہے۔ گویا وقت خوش کہ وقت ناخوش کردی "

۴۔ مولوی عسکری حسن صاحب (عسکر یار جنگ بہادر) اوسی قدیم دور کی یادگار ہیں یہ انگلستان گئے۔ بیرسٹر بنے ملک کے کامیاب وکیل ثابت ہوئے۔ صاحب خطاب ہوئے۔ معتمد و معتمد تو انین رہے لیکن احباب میں وہی "عسکری" کہلائے حالانکہ آپ نے اکثر احباب کی زندگیوں کو سنوارا ہے اور گرتوں کو سنبھالا ہے۔

۵۔ مولوی رحمت اللہ شریف صاحب (نواب رحمت جنگ بہادر) اول تعلقدار وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ خطاب پایا آجکل کلیۃً صرف خاص مبارک کے رکن ہیں اپنی سنجیدگی کم سخنی میں مشہور عام ہیں۔ لیکن جب کبھی مجھے ملنے کا موقعہ ہوا اکثر وہ دلی سے گفتگو کی اور میری ہر درخواست کے پذیرائی میں تامل نہ کیا

۶۔ مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی صوبہ داری سے وظیفہ حاصل کی اور آج کل میر مجلس پائیگاہ ہیں۔ علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ میرے عہد طفلی سے کے ملنے والوں سے ہیں مگر اخلاق اور اخلاص میں وہی طرز عمل ہے۔

۷۔ مولوی غلام مصطفیٰ صاحب ناظم کلاڈ تحصیل داری سے ترقی کرتے ہوئے

نظامت پر کارفرما ہیں۔ پیشتر آپ کے وسعت اخلاق اور ہمدردیوں کے معترف ہیں۔ آپکی زندگی سادہ ہے فخر و تشخص سے گریز کرتے ہیں میرے ساتھ ہمیشہ برادرانہ سلوک مرعی رکھا ہے۔ آپکا دروازہ ہر ایک کے استقبال کے لیے کھلا رہتا ہے۔

۸۔ مولوی میر لائق علی صاحب (صدر اعظم دولت آصفیہ) سے اُسوقت نیاز حاصل ہوا جبکہ آپ طالب علم تھے۔ یورپ گئے۔ انجینیر بنے ملازمت میں منسلک رہے پیر کنٹر وکشن کمپنی سے تعلق پیدا کیا۔ شکر نگر، کاغذ نگر کے خالق کہلائے اگر دوران جنگ میں یہ کارخانے نہ ہوتے تو حیدرآبادیوں کو شکر۔ دیران عمرانہ کو کاغذ میسر نہ آتا۔

آپ کے نام کے ساتھ ہی ذہن میں عزم بلند۔ محنت و مشقت۔ صلاحیت کارکردگی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ یہ جوان سال فرما نے اپنے قوت بازو سے اس مرتبہ پر فائز ہوا ہے۔ جنکی فنی صلاحیتوں کا اعتراف ایک عالم کو ہے چنانچہ حال ہی میں پاکستان کی جانب سے صنعتی نمائندہ کی حیثیت سے ادارہ اقوام میں شرکت کی ہے۔ موجودہ خدمت سے آپ کے حب وطن کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ملک کی خدمت کے لئے اس خدمت کو قبول کیا جا رہا ہے جبکہ آپ کے سامنے چاندی سونے کے ڈھیر تھے۔ توقع ہے کہ آپ کا عہد کارفرمائی ملک اور افراد ملک کیلئے کامیاب اور کامران ثابت ہوگا۔ اپنے ملنے والوں سے اب بھی خلق و مروت سے ملتے ہیں۔

۹۔ مولوی احمد محی الدین صاحب رضوی پاکیزہ صفات اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں تخمیناً (۲۵) ایک سال سے سلسلہ نیاز ہے اس عرصہ میں وہ مدارج اعلیٰ پر پہونچتے رہے اور آج کل (چیف سکرٹری) جیسی اہم خدمت پر کارگذار ہیں لیکن اخلاق اور اخلاص کا وہی عالم ہے جو آج سے ۲۵ سال قبل ابتدائی ملازمت کے زمانہ میں تھا۔ آپکی محبوب کا ایک زمانہ مداح ہے۔

۱۰۔ مولوی احمد رضا بیگ صاحب اول تعلقدار نظام آباد اور مولوی عبدالباسط بیگ صاحب زائد اول تعلقدار پربھنی کی نسبت اتنا کہہ دینا کافی ہے یہ دونوں ولد اثر نشاء ابی کی مکمل تفسیر ہیں۔

غزل

طاہرہ

آج سے ایک عرصہ پیشتر قرۃ العین زرین تاج۔ طاہرہ کے حالات شہاب میں شائع ہو چکے ہیں۔ جس نے اپنے حسن و جمال اور پرشوق شاعری کی بدولت ایرانیوں پر حکومت کر چکی ہے جس کی چند غزلیں فراہم ہوئی ہیں جو دعوت ذوق کیلئے پیش کی جاتی ہیں۔ آئندہ کسی اشاعت میں اور بھی شائع کی جائیں گی۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ رو برو۔ شرح دہم غم ترا نکتہ بنکتہ مو بمو

از پئی دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام۔ خانہ بخانہ در بدر کوچہ بکوچہ کو بکو

میرود از فراق تو خون دل از دو دیدہ ام۔ دجلہ بدجلہ یم بیم چشمہ بچشمہ جو بجو

دور دہان تنگ تو عارض عنبرین خطت۔ غنچہ بغنچہ گل بگل لالہ بلالہ بو ببو

ابرو چشم خال تو صید نمودہ مرغ دل۔ طبع بطبع و دل بدل مہر بمہر و خو بخو

مہر ترا دل حزین بافتہ بر قماش جان۔ رشتہ برشتہ نخ بنخ تار بتار و پو بپو

در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا۔ صفحہ بصفحہ لا بلا پردہ بپردہ تو بتو

تفلیس

جناب اکرام الدین صاحب

تفلیس رنیا لڈ کا جنت ہے جس نے اس کا ناول الہ دین پڑھا ہے۔ وہ وہاں کے حسن و جمال کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ ایک جنت ارضی ہے جہاں حسن اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔ ایران سے علیحدہ ہو کر کچھ ایسا زیادہ زمانہ نہیں گذرا لیکن اسمیں بہت کچھ تغیرات ہو گئے ہیں اور یہاں کیرونڈنیل کے بہت سے کنوئیں ہیں اور اکثر اسی کی بدولت لکھ پتی بن گئے ہیں۔

یہ مقام اوائل دور مسیح میں ایک نامعلوم مقام تھا پانچویں صدی عیسوی میں ایک بادشاہ شکار کھیلتا ہوا اسطرف آنکلا اور اسکو یہاں کا ایک گرم پانی کا چشمہ پسند آیا کہ اپنا دار السلطنت بنا دیا۔ ۱۳۹۰ء میں تیمور نے اسکو فتح کیا اسکے بعد ایرانیوں کا تسلط ہوا اور وہ عرصہ تک اسپر قابض رہے۔ بالآخر ۱۸۰۱ء میں روس کے زیر اثر آگیا اسوقت سے اسمیں ترقی ہونے لگی۔

اسکے دو حصے ہیں ایک یورپین اور دوسرا دیسی۔ یورپین حصے میں بڑی بڑی دکانیں۔ عجائب خانے۔ باغ اسکندر۔ تھیٹر ہال ہیں یہ نہایت خوشنما ہے سڑک کی دوسری جانب زیادہ تر ہوٹل تماشہ گاہیں اور آخر میں ایک باغ ہے جہاں لوگ شام کو سیر و تفریح کیلئے آتے ہیں۔ رنگا رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے نہایت دلگداز گانے گاتے ہیں۔ دیسی حصہ میں باغ۔ جامع مسجدیں اور بازار ہیں اور یہاں بازار ہی کہلاتے ہیں اسمیں سب سے بڑا بازار۔ میدان بازار۔ راستہ بازار اور شیطان بازار ہیں۔

یہاں ایک چھوٹی سی نہر ہے جسکو کورا کہتے ہیں ایک اور چھوٹی سی نہر ہے جو فیرہ کہلاتی ہے۔ یہی نہر پر کئی پن چکیاں ہیں۔

یہاں ایک قصبہ ہے جو قارالشوف کے نام سے مشہور ہے جو قوقاز کا گورنر

شباب

تھا۔ یہاں کا سب سے بڑا ہوٹل اورینٹل ہے جو یورپ کے بڑے بڑے
ہوٹلوں کے مقابلہ میں کسی درجہ کم نہیں ہے۔ گورنر کی کوٹھی کے پیچھے کوہ قدس
داؤد ہے اور ۷ بجے شام سے اس پہاڑ کی سڑا میں ایک نشاط بخش تازگی
پیدا ہو جاتی ہے خصوصاً شب میں سیر و تفریح کے لئے بکثرت لوگ آتے
ہیں اور ایک برقی سیڑھی میں بیٹھ کر چڑھتے ہیں اور یہ چڑھائی کوئی دس منٹ
میں ختم ہو جاتی ہے اسکا بہترین فرحت گاہوں میں شمار ہوتا ہے اوپر کافی۔
قہوہ خانے اور گانے کے لئے تخت ہیں جہاں سے تمام شہر کا نظارہ دن
سے زیادہ رات کو بڑا دلکش ہوتا ہے۔ یہ شہر چاروں طرف سے پہاڑوں
میں گھرا ہوا ہے۔

تفلیس کی آبادی ۴ لاکھ ہے حسب ذیل ہے۔ ۳۰ ہزار روسی ایک لاکھ اسی ہزار
ارمنی ایک لاکھ گورجی ۹۰ ہزار مسلمان اور ۵ ہزار یہودی بستے ہیں۔ یہاں کے
عجائب خانہ میں وہ جھنڈے اب تک محفوظ ہیں جو قوقاز کے سردار اور پیر و شیخ
شامل نے روس کے ساتھ جنگ میں استعمال کئے ہیں۔ ان جھنڈوں پر "نصر من
اللہ و فتح قریب و بشر المومنین یا محمد" لکھا ہوا ہے اور ایک تختی میں شیخ شامل
کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ ان آثار کے سوا ایسے جھنڈے بھی ہیں جن پر قرآنی
آیات ہیں۔ پرانے اسلحہ اور توپیں بھی ہیں اور ان پر عربی اور ترکی میں عبارتیں
کندہ ہیں۔

آب و ہوا اتنی خوشگوار اور طرب انگیز ہوتی ہے کہ موسم گرما میں بھی
گرمی کا نام و نشان نہیں رہتا۔

ایک موٹر کار کمپنی کی موٹریں تفلیس اور ولادی قفقاز کے درمیان عمدہ سڑکوں
سے گذرتی ہیں اگرچہ ریل سے بھی سفر کیا جا سکتا ہے لیکن راستے کے مناظر
اتنے دلکش نہیں ہیں۔

درحقیقت اگر جنت ارضی کے دیکھنے کی ہوس ہو تو ایک مرتبہ تفلیس
اور نواح تفلیس ضرور دیکھیں۔

حقیقتِ مستور

قدیم اہلِ یونان کے عقائد

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

کہتے ہیں، ڈیوکلس، جو علم و حکمت کا طالب علم تھا، اتھینس، دیوی کے حضور میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ گذار دیا کہ وہ حقیقت کو بے نقاب دیکھ پائے۔ دیوی کو اسکی الحاح و زاری استقلال اور مشقت پر رحم آیا ایک عرصہ دراز کے بعد کہا کہ ایسی تمنا اور آرزو مت کر کیونکہ اسکو دیکھنے کیلیئے بڑے سخت امتحان دینا پڑینگے وہ جب بھی اسپر آمادہ ہو گیا تو دیوی نے کہا حقیقت ستر حجاب میں محجوب ہے تو بیک وقت ان حجابات کو چاک نہیں کر سکیگا اور نہ ایسا ممکن ہے البتہ ہر سال ایک پردہ چاک کرنا پڑیگا اور یوں رفتہ رفتہ حقیقت مستور عریاں اور بے نقاب ہوتی جائے گی۔ ڈیوکلس اسپر بھی آمادہ تھا تب دیوی اوسکو لیکر اڑی جب آنکھیں کھولیں تو اوس نے اپنے آپ کو ایک پہاڑ کی بلند چوٹی پر دیکھا جہاں کالی بدلیوں میں کچھ پرچھائیاں نظر آرہی تھیں دیوی نے اشارہ کیا کہ یہی حقیقت ہے اور زمین پر جب اسکی شعاعیں پڑتی ہیں تو اسکے دھندلے عکس ہی دنیا کے فلسفی اور حکیم نور حق کا سایہ ڈھونڈ لیتے ہیں اگر یہ پرچھائیاں نہوتیں تو آج دنیا تاریک اور بھیانک رہتی۔ حقیقت روشن بے حد روشن ہے جسکا قیاس سورج کی روشنی سے بھی نہیں کیا جا سکتا وہ ان پردوں میں مستور ہے آگے بڑھ اور ایک پردہ چاک کر ہاتھ کے سفید پردہ پرندہ بنکر نوجوان کے سر پر منڈلایا اور آسمان کی جانب پرواز کر گیا۔ ڈیوکلس نے دیکھا کہ شعاعیں پہلے سے زیادہ منور اور تابناک ہیں اس مشاہدہ کے بعد اسنے اپنا آرام اور چین چھوڑ دیا اور اشتیاق میں شوق کے اور زیادہ پر لگ گئے کہ وہ چاہتا تھا کہ جلد حقیقت کو بے نقاب دیکھ سکے۔

دوسرے سال دیوی اوسے اپنے ساتھ لیکر پھر پرواز کی اور دوسرا پردہ چاک

کرنے کی ہدایت کی اس مرتبہ روشنی تیز سے تیز تر ہو گئی۔ نئے نئے انکشاف
نے اسکے شوق میں اور اضافہ کر دیا وہ اور بھی زیادہ بیتاب و مضطرب تھا۔ دیوی
نے کہا اب بھی اپنی خواہش باز آ۔ زندگی آرام میں گذار لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا
دیوکلس کی کئی دوشیزاؤں سے ملاقات تھی جن میں ایک دوشیزہ کو اس سے محبت بھی تھی
اس نے دیکھا کہ دیوکلس میں تغیر ہوتا چلا جاتا ہے اسکی رعنائی شباب میں روز بروز
کمی ہے دنیوی لذتوں سے اجتناب پیدا ہو رہا ہے تو ایک دن مسکرا کر کہا کہ دیکھو
تم مجھ سے بیزار نظر آرہے ہو، حالانکہ میرا حسن وہی آب و تاب رکھتا ہے شباب اپنی
سکر کی حد تک پہنچ چکا ہے اور میری نگاہوں میں جو بجلیاں ہیں اونہیں دیکھ بیقراری ہے
میری محبت کی تحقیر نہ کرو میں سائل بنکر تمہارے آستانہ پر آئی ہوں۔ دیوکلس نے جوابدیا
یہ سب کچھ سہی محبت میرے دل سے اسطرح اڑ گئی ہے کہ جسطرح کہ پہلا پردہ چاک
کرنے پر پرندہ فضائے آسمانی میں پرواز کر چکا ہے یہ کہکر وہ چلدیا۔
اسطرح برس پر برس گذرتے گئے اور سب پردوں کے چاک پر حقیقت کے نت نئے
جلوے اسکی نگاہوں میں تھے۔ دیوی نے کہا اب بھی باز آ جوں جوں پردے چاک
کر رہا ہے تیری ہی حقیقت تیرے سامنے آرہی ہے مگر دیوکلس اور بھی دیوانہ ہوتا
گیا۔ جوابدیا کہ جسکی زندگی کا بڑا حصہ اسی جستجو میں ختم ہو چکا ہے اوس سے واپس آنا
میرے لئے محال ترین ہے۔ تاوقتیکہ حقیقت مستور کو بے حجاب نہ دیکھ لوں۔
آئندہ سال دیوی اوسے لیکر ایک اور بلند ترین پہاڑ پر پہونچی کہا کہ دیکھ یہ میری
آخری نصیحت ہے کہ اب بھی واپس چلیں اور آرام سے بقیہ زندگی گذار دیں ورنہ
پچھتانے سے فائدہ نہ ہوگا۔
مگر دیوکلس کیونکر باز آتا جبکہ اس جنون میں کئی منزلیں طے کر چکا تھا وہ چاہتا تھا
کہ اسکے حصول میں جان کی بھی بازی لگادے۔ نہایت التجا اور عاجزی سے کہا
کہ دیوی جب یہانتک پہنچ چکا ہوں تو پھر اس سے لوٹنا میرے لئے ناممکن ہے
دیوی نے جب دیکھا کہ وہ اپنے ہٹ سے واپس ہونے والا نہیں تو اوس نے اجازت
دیکہ تشنہ اور بڑھ کر یہ آخری پردہ بھی چاک کردے۔
وہ آگے بڑھا اور پردہ کھینچ لیا۔ اف ہولناکی۔ پردہ ہٹتے ہی روشنی غائب ہو گئی

دنیا پر تاریکی چھا گئی۔ اسکی آنکھوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا زور سے ایک چیخ ماری کہ حقیقت کہاں ہے؟ یہاں تو تمام فضاء تیرہ و تار ہے۔

دیوی نے جواب دیا تری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ آنکھوں کی جوت زائل ہو چکی ہے تو غفلت کی آخری زینہ پر پہنچ گیا ہے۔

یاد رکھ خوب یاد رکھ کہ حقیقت کو کوئی بے نقاب دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اگر دیکھنا مقصود ہے تو اوسے پردہ میں لپٹا ہی دیکھ سکتا ہے۔ حقیقت کبھی عریاں نہیں ہو سکتی۔

دیوکیں نے یہ سنا اور منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ روح جسم میں موجود نہ تھی شاید وہ حقیقت کی تلاش میں دوسری دنیا کا سفر اختیار کر چکی تھی۔

شہاب کو کمی اشاعت کی شکایت نہ ہوتی اگر مصارف کی زیادتی پیش نہ آتی۔ ۱۳۴۲ف سے آج تک جاری ہے مگر تمام طباعتی اشیاء کی قیمت گذشتہ قیمتوں سے کئی چند اضافہ ہو گئی ہیں۔

اسوقت "شہاب" ہی حیدرآباد کا ادبی پرچہ ہے کہ باوجود گرانی کے نہایت پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

مصارف کی زیادتی کی وجہ سے اتبک آمد و خرچ برابر نہیں ہو سکے ہیں کیا آپ اس معاملہ پر توجہ ضروری نہیں سمجھتے؟ اگر ضروری سمجھتے ہیں تو توسیع اشاعت کیلئے کوشش کیجئے کہ اردو کا دیرینہ خدمت گذار آپکے ذوق ادب کیلئے اپنی پوری توانائیاں وقف کرے۔

بادل

جناب محمد فخرالدین احمد صاحب سعید بی اے (عثمانیہ)

تمنائے کساں، رندوں کی جاں، یعنی سحاب آیا ہوا کے دوش پر اڑتا سمندر کا حباب آیا

لگے راستے میں مہر نے تار اسکو کرنوں کے بجیگا چھیڑنے بجلی کی، ارغنون رباب آیا

جدھر ڈھلکا ادھر ڈھلکا، جدھر بھٹکا ادھر بھٹکا ہواؤں میں لڑکھڑاتا جھومتا، مست شراب آیا

اڑا، اترا، رکا کہسار پر، آیا کبھی ہولے عجب خوشدل مسافر ہے کبھی تو یہ شتاب آیا

جو چھوڑا بحر کا پہلو تو پھر گھر تھا نہ منزل تھی اک آوارہ منش، گم کردہ رہ، خانہ خراب آیا

چمن زادوں نے پوچھا کیا جوانی لوٹ آئیگی تو بادل کے لفافہ میں سمندر سے جواب آیا

ہوئے ہیں سرخرو جنگل ہوا جھڑ کا منہ کالا بہاروں کا شباب آیا، خزاں پر اک عذاب آیا

گلستاں، کوہ و بن خوش ہیں پھر آئے دن نکھرنے کے کہ بادل کے خطوطوں میں پھر انکا انتساب آیا

برس کر گھل گیا آخر ہوا کے ہلکے جھکوں سے ادھر ہستی مٹی اسکی، ادھر کھیتوں میں آب آیا

فنا کا جام پی کر یہ سبق تو دے گیا بادل

کہ مرنا بھلائی کیلئے اوروں کی ہے افضل

پولیس اور عوام

جناب محمد یحییٰ صاحب

سلسلۂ گزشتہ = سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ کسی جرم کی اطلاع کرنے کے بعد یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہمارا فرض ادا ہوگیا اب پولیس والوں کو چاہیئے کہ وہ سب کچھ کریں ۔ یہ بھولنا نہ چاہیئے کہ پولیس والے انسان ہیں انکی صلاحیتیں بھی محدود ہیں ۔ اسلئے جبتک انکو ضروری مدد نہ دیجائیگی انہیں اپنی کوششوں میں کماحقہٗ کامیابی نہ ہوسکے گی ۔

عوام کو یہ سوچنا چاہیئے کہ اگر جرائم کی اطلاع پولیس کو دیجائیگی مجرم کا پتہ چلانے میں انکی امداد کیجائیگی ۔ کسی جرم سے متعلق جو کچھ ہوا ہے چھپانے کی کوشش نہ کیجائیگی ۔ تو یہ دراصل پولیس کی امداد نہ ہوگی بلکہ خود اپنی مدد ہوگی ۔ عوام کا یہ فعل سماج اور ملک کی بھلائی کے لئے ہوگا ۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر شخص کو اس کا احساس ضرور ہے کہ پولیس والے ہماری کتنی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں ۔ اگر انسداد اور سراغ رسی جرائم کا کوئی انتظام نہوتا تو ہماری زندگی کیسی مصیبت ہوتی ۔ نہ ہمکو راتوں میں نیند آتی نہ دن کو چین ہوتا ۔ ہم اپنے سایہ سے ڈرتے ہوتے جانے کون کسوقت لوٹ لے جانے کون کہاں ہمیں ختم کردے ۔ بس یہی دھڑکہ ہر ایک کو ہر وقت رہتا ۔ ایک خلفشار ہوتا ایک پریشانی ہوتی ۔

" کبھی کیا فرمایا آپنے ۔ پولیس والے ناقابل اعتبار ہوتے ہیں ۔ بدتہذیب ہوتے ہیں ۔ بے حس ہوتے ہیں ۔ ظالم ہوتے ہیں " ۔

جی ہاں بہت سے لوگ پولیس والوں کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ کس بناء پر انہوں نے یہ رائے قائم کی تو شاید وہ کوئی جواب اسکے سوا نہ دے سکینگے ۔ " سنا ہے "

میں اوپر عرض کرچکا ہوں بالعموم عوام پولیس والوں کے ساتھ تعاون نہیں کرتے لیکن خواہ عوام تعاون کریں یا نہ کریں انہیں اپنا فرض انجام دینا پڑتا ہے وہ مجبور ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنا مطلب حاصل کریں ۔ مثلاً فرض کیجئے کہ ایک پولیس افسر ایک مقدمہ کی تفتیش کر رہا ہے اور اسے معلوم ہوا کہ زید اصل مقدمہ کے واقعات سے واقف ہے زید سے وہ پوچھتا ہے زید انکار کر دیتا ہے

لہٰذا وہ دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے - وہ زید کا دوست بن جاتا ہے اور بہ حیثیت دوست کے زید سے پوچھتا ہے - زید سب کچھ بیان کر دیتا ہے - پولیس افسر زید کے اس بیان سے فائدہ اٹھاتا ہے - اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ پولیس افسر نا قابل اعتبار ہے؟ آپکو غالباً مجھ سے اتفاق ہوگا کہ اسے نا قابل اعتبار نہیں کہا جا سکتا -

اصل میں اعتبار سے اعتبار پیدا ہوتا ہے - عوام پولیس والے پر اعتبار نہیں کرتے وہ عوام پر اعتبار نہیں کرتا - عوام اوس پر اعتبار کرنے لگیں تو وہ عوام پر اعتبار کریگا اور پھر عدم اعتمادی کی یہ شکایت باقی نہ رہیگی - ہاں اگر ادائی فرض کو نا قابل اعتمادی سمجھا جائے تو پھر وہ نا قابل اعتماد رہنا ہی پسند کریگا

پولیس والے بد تہذیب تو کیقدر ضرور ہوتے ہیں مگر اسکے ذمہ دار عوام اور وہ دونوں ہیں - وہ اسلئے کہ انکی پرورش ہی ایسے ماحول میں ہوئی جہاں وہ مہذب نہیں ہو سکتے - کانسٹبل اسی فیصدی غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں ان سے مہذب ہونے کی توقع غلط ہے - باقی بیس فیصدی بھی ایسے ہوتے ہیں جو چار یا پانچ جماعتیں پڑھے ہوئے ہیں ان سے اوپر کے عہدہ داروں میں بھی اکثر و بیشتر وہ ہیں جو ان بیس فیصدی پڑھے لکھے کانسٹبلوں میں سے ترقی یاب ہوتے ہیں - جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے - اب رفتہ رفتہ تعصب کم ہو رہا ہے - تعلیم یافتہ لوگ آنے لگے ہیں اور یقیناً ان کا طرز عمل بدلا ہوا ہے -

عوام اسلئے کہ بعض وقت عوام ان کو بد تہذیب بننے پر مجبور کر دیتے ہیں -

اس سلسلہ میں ایک قصہ سناؤں - بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ٹریفک کے کانسٹبلوں کو سکھایا جا رہا تھا کہ عوام کو کیسے مخاطب کرنا چاہیئے - ان سے کہا گیا دیکھو یہ شخص سیکل غلط سمت لے جا رہا ہے اس سے کہنا ہے "سیدھی طرف سے لیجا ئیے - اسکو یوں مخاطب کرو" مولوی صاحب سیکل سیدھی طرف سے لیجا ئیے" چنانچہ کانسٹبلوں نے جو ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے یکے بعد دیگرے کہنا شروع کیا جب ساتویں کانسٹبل کی باری آئی تو اس نے ایک موٹی سی گالی دیکر کہا "اسے سیدھی طرف سے لیجا" - اس سے کہا گیا - یہ کیا حرکت ہے - کہنے لگا جب (۶) آدمیوں نے نترا فنت سے کہا اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا اسلئے مجھے

مجبوراً یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا

پولیس والے بالکل ایسے ہی بے حس ہوتے ہیں جیسے کہ ڈاکٹر۔ ڈاکٹر کی بے حسی کا تجربہ تو کم و بیش سب ہی کو ہوگا کسی کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے درد سے وہ بے چین ہوا جا رہا ہے مگر ڈاکٹر ہے کہ ہاتھ کھینچ رہا ہے۔ وہ چیخ رہا ہے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کتنا بے حس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر۔ مگر کیا وہ قابل ملامت ہے؟ نہیں ۔ اسلئے کہ وہ مریض کی بھلائی کیلئے بے حس بن گیا ہے۔ اگر وہ بے حس نہ بنے تو ہاتھ ہی نہ جڑ سکے۔ اور مریض مدت العمر تکلیف میں مبتلا رہے ۔

پولیس والا بھی تو ڈاکٹر ہے سماج کا۔ وہ سماج کے ایسے اعضاء کو نکال پھینکنا چاہتا ہے۔ جن سے دوسرے اعضاء کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو۔ وہ تو عوام کی ہی آیندہ تکلیف کے مدنظر بے حس بن رہا ہے۔ پھر وہ قابل ملامت کیوں ہے۔ کتنے بے حس ہیں خود عوام ۔

پولیس والے بعض وقت ظلم بھی کرتے ہیں۔ یہ بھی ہمیں تسلیم ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ چور سے پوچھا جائے کہ دیکھو بھائی سچ سچ بتا دو تم نے چوری کی ہے یا نہیں "یا قاتل سے کہا جائے،، میاں تم بہت شریف آدمی ہو بتا دو کہ تم نے مقتول کی لاش کہاں چھپائی ہے" تو کیا وہ بتا دیگا؟ آپکو تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ کبھی نہ بتائیگا۔ لازماً کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑیگا۔ ہمارے آپکے نزدیک بہت سے معقول طریقے بھی ہیں مگر جس قسم کے لوگوں سے میں نے آپکو روشناس کرایا ہے اونکے نزدیک واحد طریقہ "ڈنڈا ہے،، مار کے آگے بھوت بھی بھاگتا ہے۔ بیچارے مجرم کا دل ہی کتنا۔ جو اسکی تاب لا سکے۔

اگر کوئی عیب ہی نکالنے بیٹھ جائے تو اور بھی بہت سے عیوب پولیس والوں میں نکلینگے۔ جن کا تجربہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ اون کا واحد سبب کم علمی ہے۔ جیسے جیسے تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بڑھتی جائیگی خرابیاں دور ہوتی جائینگی۔ اور یقیناً عوام کی بہت سی شکایتیں رفع ہو جائینگی۔

عوام کو بھی چاہیئے کہ اپنی اصلاح کریں۔ اپنی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ان پر غور کریں۔ جن نے نہ غلط بیانی سے کام لیا ہے نہ مبالغہ سے

عوام ان ذمہ داریوں سے غفلت برت رہے ہیں ۔ جو بہ حیثیت شہری ان پر عائد ہوتی ہیں وہ پولیس کا ہاتھ بٹائیں ۔ وہ ان کے لئے اور زیادہ مفید ثابت ہونگے ۔

"خوش باش دمی"

جناب مرزا شکور بیگ صاحب

دنیا میں صداقت کا اب نام نہیں ملتا
گٹھلی نظر آتی ہے اور آم نہیں ملتا
آجر کو شکایت ہے مزدور نہیں ملتے
مزدور یہ کہتے ہیں کچھ کام نہیں ملتا
اس دور ترقی میں موت ایسی ہوئی سستی
جو صبح کو ملتا ہے وہ شام نہیں ملتا
ایمان فروشی سے جو نام کماتے تھے
ڈھونڈے سے کہیں ان کا اب نام نہیں ملتا
دن رات میں جو ہل کر پانی بھی نہیں پیتے
ان کو بھی شکایت ہے آرام نہیں ملتا
تحقیق سے ثابت ہے بندر تھا البشر پہلے
آغاز تو ملتا ہے انجام نہیں ملتا
آزادی کے متوالے اب فاقوں سے تنگ آکر
مشتاق اسیری ہیں پر دام نہیں ملتا
دنیا کی محبت میں ناکام ہوئے لاکھوں
کہتے ہیں کہ مرزا سا ناکام نہیں ملتا

عورت

جناب عبدالحمید صاحب بی۔ اے شوق

مذاق حسن نے آدم کو ایسی رُستگاری کی
کہ اس نے اپنے اشکوں سے زمیں کی آبیاری کی

انہیں اشکوں نے الفت کی زمیں میں کشتکاری کی
انہیں آہوں نے بخشی دل کو گرمی بیقراری کی

تصور میں لئے فطرت کی وہ رنگینیاں ساری
پھرا کرتا تھا اک امیدوار رحمت باری

فضائے گلشن جاوید اسکو خوش آتی نہ تھی
کہ تنہائی میں اسکو دید رضواں بھی نہ بھاتی تھی

نسیم صبحدم آکر جو اس کو گدگداتی تھی
تو اسکے دل میں رہ رہ کر کسی کی یاد آتی تھی

یہ اوسکی یاد تھی جسکو نہ دیکھا تھا نہ بھالا تھا
مگر پھر بھی کسی کی یاد سے دل میں اُجالا تھا

دعا کرتا تھا یارب تو مری تسکین کا ساماں کر
مرے اس دامن پرخوں کو یاد گل سے داماں کر

مرے دل کو الٰہی تو ہمیشہ وقف ارماں کر
مرے داغ تمنا کو الٰہی مہر تاباں کر

مجھے اس چشم میگوں سے پلا دے جام الفت کا
ہوں مشت خاک دے مجھ میں شرارا سکی محبت کا

غرض اسطرح اظہار تمنا وہ رہا کرتا
غرض اسطرح دم الفت کا وہ ہر دم رہا بھرتا

غرض اسطرح وہ فرقت میں نادیدہ پہ تھا مرتا
تصور میں سدا رنگ تخیل وہ رہا بھرتا

تو اک دن خالق باری نے اس پر رحم فرمایا
تصور سے جو چونکا پاس حوا کو کھڑے پایا

نگاہیں چار ہوتے ہی کلی دل کی لگی کھلنے
لب جاں بخش ہلتے ہی غذائے روح لگی ملنے

تبسم ہی تبسم تھا لگی زلف دوتا ہلنے
مرے دکھ کی دوا یہ ہے کہا بے ساختہ دل نے

انہیں اب عشق کی رنگینیاں کچھ لطف دیتی تھیں
تمنائیں ہی سوتے جاگتے میں گھیر لیتی تھیں

کیا آدم کو پیدا حق نے بے شک آب اور گل سے
مگر عورت کی پیدائش ہوئی ہے مرد کے دل سے
ہے نوری اور ناری آدمی اس بحر باطل سے
یہی نیکی ہے جو لکھی گئی ہر اک دل کے محمل سے

وہ دل کی چیز تھی آنکھوں کے رستہ دل میں آ بیٹھی
مکاں اپنا بنا کے ٹھیک سے وہاں قبضہ جما بیٹھی

انہیں اب معصیت میں بھی مسرت ہی مسرت تھی
نکالا انکو جنت سے تو یہ دنیا بھی جنت تھی
کوئی دکھ تھا تو اونکی عارضی دم بھر کی فرقت تھی
وگرنہ انکو محنت اور مشقت میں بھی راحت تھی

عبادت انکی تھی اک دوسرے کو دیکھتے رہنا
تمنا تھی کہ فرقت کا پڑے صدمہ نہ کچھ سہنا

پڑی بنیاد گھر کی اور گھر سے خانہ داری کی
تمدن ہے ترقی باہمی خدمت گزاری کی
ہوئی جب روح پیدا ان میں باہم غمگساری کی
قسم کھائی محبت نے ہمیشہ رازداری کی

گل رضواں سے بڑھکر پھول دونوں نے مٹا ڈالے
ندامت کے تصور مل کے دونوں نے مٹا ڈالے

یہ عورت ہے جو دنیا میں بنائے قوم و ملت ہے
حقیقت میں امومت ہی فقط بنیاد امت ہے
یہ عورت ہے کہ جسکا کام ہمدردی و خدمت ہے
یہ عورت ہے کہ جسکے نام سے نام محبت ہے

اگر عورت نہ ہو دنیا فقط ویرانہ ہو جائے
اگر عورت نہ ہو انسان فقط دیوانہ ہو جائے

وہ عورت ماں ہے جسکے زیر پا انساں کی جنت ہے
وہ عورت ہے کہ جسکے لمس میں آرام و راحت ہے
وہ عورت ہے کہ جسکے واسطے ساری یہ زینت ہے
وہ عورت ہے کہ جسکے واسطے انساں کی خلقت ہے

اسی کے واسطے انسان نے راہ معصیت ڈھونڈی
اسی کے دامن شفقت میں سب نے عافیت ڈھونڈی

کوئی ان میں خدیجہؓ ہے تو کوئی ان میں مریمؑ ہے
کوئی دل کی تمنا ہے کوئی زخموں کا مرہم ہے
کوئی ہے عائشہؓ جسکے سبب دنیا میں پیہم ہے
کوئی ہے فاطمہؓ ام شہیداں معظم ہے

جو سچ پوچھو تو عورت ہی لباسِ آدمیت ہے
لباسِ آدمیت کیا اساسِ آدمیت ہے

بہت سے لوگ عورت ہیں ریا کے خاص شاکی ہیں
بہت سے کید و نقدانِ وفا کے خاص شاکی ہیں

بہت سے ہیں جو حرص و ہوا کے خاص شاکی ہیں
بہت سے ہیں کہ بی بی سے جفا کے خاص شاکی ہیں

مگر اپنی خباثت سے وہ آگاہ تک نہیں ہوتے!
عزیز مصر بنتے ہیں مگر یوسف نہیں ہوتے!

عزیز و شوق کی یہ نظم کیا ہے نالۂ دل ہے
کہ اس کا دل ازل سے حسن کی چیتوں کا گھایل ہے

مگر یہ درد ملتا ہے اسی کو جو اس کے قابل ہے
یہی بارِ امانت ہے کہ جس کا مرد حامل ہے

ابا کرتا ہے جو اس سے وہ ظالم اور جاہل ہے
جو ہو عہدہ برآ اس سے وہی انسانِ کامل ہے

عورت

شمس ناہید

جو زندگی پہ تجھے اختیار مل جائے
تو ہر نفس کو متاعِ بہار مل جائے

چراغ بن کے فروزاں ہوں تیرے نقشِ قدم
ترے عمل کو اگر رہ گزار مل جائے

لبوں پہ بن کے تبسم اٹھے جبیں کی شکن
تری وفا کو اگر اقتدار مل جائے

اگر زمانہ تری دل کی دھڑکنیں سن لے
تو آنسوؤں میں درِ آبدار مل جائے

نظر کو حسنِ نظر کا اگر سلیقہ ہو
تو تجھ میں اس کو دلِ حسن کار مل جائے

ترا مقام سمجھ لیں جو دیکھنے والے
تو تیری ذات میں اک شاہکار مل جائے

ظالم نے آخر کاٹا

جناب معین الدین صاحب مغربی

موسم سرما کی ایک سرد لیکن تاریک رات تھی اور سرما کے کی سردی پڑ رہی تھی گویا تمام چیزوں کو سرد کر کے ہی رہیگی ،، میں ایک باریک چادر اوڑھے ہوئے اپنے آپکو گھڑی کی شکل بنائے سردی سے محفوظ اور نیند کو خوش آمدید کہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سردی جانے پر اور نیند آنے پر آمادہ نہ تھی۔ تاھم کوشش میں مصروف تھا کہ سردی کا جادو مجھ پر چلنے نہ پائے۔ لیکن خواب راحت کے وہ خواب ، خواب کی شکل اختیار کرنے پر اڑ گئے اور میں سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ اسی عالم کرب میں دوبارہ نیند کی دعوت دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ فضا کو چیرتی ہوئی ایک باریک سی سریلی آواز سنائی دی۔ میں نے کان کھڑے کئے معلوم ہوا کہ ایک مچھر یلغار کی فکر میں ہے اور سر سے پیر تک چکر لگا رہا ہے کہ کوئی موقع مل جائے اور ہلہ بول دے مچھر کی اس کوشش پر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے اپنے آپ کو چادر میں اور اچھی طرح ملفوف کر لیا۔ جب یقین ہو گیا کہ مچھر کی ایک نہ چلیگی تو میں گویا ہوا۔

باز آئے اپنی یلغار سے۔ سردی کو میں چیلنج دے چکا تھا کہ اب اونٹ افروز ہو چکے ہیں تمہاری حکومت کو بھی میرا چیلنج ہے کہ کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔

اب سردی کا احساس نہ تھا۔ سچ ہے جب تم کسی کام میں محو ہو جاؤ تو گرد و پیش کے ماحول کا تم پر کوئی اثر نہ ہوگا ، چنانچہ اس کا تجربہ مجھے اسی وقت ہوا۔ مچھر نے جواب دیا کہ :-

مچھر — ہمت مرداں مدد خدا۔ میرا تو یہ طریقہ رہا ہے کہ کوشش کرتا چلا جاؤں مدد کرنے والا خدا ہے۔

میں نے یہ جو سنا تو کٹ کر رہ گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دشمن بڑا دانا لگتا ہے۔

اور آسانی سے ہار ماننے والا نہین ۔

مین ۔ تم دیکھو میرے اطراف فصیل کھنچی ہے ۔ تم کیون ایسی حرکت کر رہے ہو جس سے تمہین سبکسرانی اور پشیمانی کے حاصل نہ کچھ ہوگا ۔ انجام کار تمہین ضیارٹو الدنیو ہونگے ۔ اور تمہیں پھر نا یہ کہنا پڑیگا کہ ع ۔ ہائے اوس زود پشیمان کا پشیمان ہونا میری صلاح مانو مین تمہین معاف کرتا ہون ۔ اور اجازت ہے کہ تمہین اور جا کر جرأت آزمائی کرین ۔ میرا خیال تھا کہ اوس پر میری نصیحت کا اثر ضرور ہوگا لیکن وہ بھی بڑا کڑا جلاد ثابت ہوا ہنسنے لگا ۔

مچھر ۔ جناب والا قصور معاف اوس نے اڑاتے ہوئے جواب دیا ۔ اگر آپ نازان ہین کہ اپنے اطراف اچھا درسی فصیل کھڑی کرلی ہے تو یہ بھی جان لیجئے کہ ناچیز بھی ارادہ کر چکا ہے کیا آپنے اقبال کا وہ شعر نہین سنا ہے

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں مین
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہین سکتا

مین لاجواب ہو گیا ۔ لیکن اپنی خفت مٹانے کو قہقہہ لگا کر کہا

مین ـــــ کوئی تدبیر کارگر نہین ہوئی تو آپنے شاعری شروع کر دی ہے

یہ تن و توش اور یہ رفتار :۔ ایسی رفتار پر خدا کی مار

مچھر نے اپنے گردش کو جاری رکھتے ہوئے کہا

مجھکو جو سخت و سست فرمایا :۔ آپنے سب درست فرمایا

مین نے کہا اب آ پہنچے راہ پر

اس نے کہا " لیکن "

مین نے گھبراتے ہوئے کہا لیکن کیا ؟

لیکن یہ کہ آپ میرے تن و توش پر نہ جائیے بلکہ یہ دیکھئے کہ مین کیا ہون ۔ میرے تن و توش کی کوئی قیمت نہین ہے تو پھر ڈر کیون رہے ہین آپ ؟ ہٹائیے نا اپنی فصیل ؟ ۔ پھر دیکھئے ہمارے جوہر ۔

مچھر کی اس بے باکی اور گستاخی نے مجھے مرعوب کر دیا ۔ مین نے کہا اب آؤ ذرا غرہ [illegible] آکر دیکھین کہ حضرت پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے ۔ چنانچہ مین نے کہا

مین - (بناوٹی غصہ سے) اے بزدل اور حقیر مخلوق وہ جو راتون کے وقت خاموشی سے سونیوالون کی نیند خراب کرتا ہے - کیون اپنی جان کے درپے ہو رہا ہے - اگر مین چاہون تو لمحے بھر مین تجھ جیسے بیسیون کو چٹکیون مین مسل کر پھینک دون - جواب ہونے دے میرے پاس اب " جواب جاہلان باشد خموشی " کے سوائے کوئی جواب نہین - یہ کہکر مین نے چادر اچھی طرح دوبارہ جسم سے لپیٹی اور ایسا انجان بن گیا جیسے کہ سو رہا ہون - مچھر شاید میری کمزوری تاڑ گیا - استقلال سے کہنے لگا -

مچھر ---- کیا کہا . . . . . مین بزدل ہون ؟ مین خاموشی سے آکر سوتے مین آپ پر حملہ کرتا ہون ؟ حضرت کان کھول کر سن لیجیئے ہم ہانکے پکارے حملہ کرتے ہین لیکن کیا کیا جائے کہ آپ لوگ خواب خرگوش سے اسوقت بیدار ہوتے ہین جبکہ ہم اپنا کام کر چکتے ہین آپنے ہم مچھرونکی سخت توہین کی ہے - ہم وہ ہین جنہون نے موسیٰ علیہ السلام کی مدد کر کے نمرود کو ڈھیر کر دیا تھا اسکے بعد وہ مستعدی سے میرے اطراف چکر لگانے لگا تاکہ کوئی موقعہ مل جائے اور مجھ پر حملہ بولدے - مچھر کی اس کوشش پر مجھے ہنسی آگئی -

تھوڑی دیر بعد میرے کانون نے سنا کہ مچھر کی آواز غائب ہوگئی اب مجھے سردی ہو رہی تھی اور مین سوچ ہی رہا تھا مچھر کی ناکامی پر کہ بے اختیار میرے منہ سے نکلا

کمبخت آخر کاٹ ہی ڈالا

پیشتر اسکے کہ مین اوسے مسل ڈالون فضا کو چیرتی ہوئی ایک باریک سی آواز جو مین کے مانند تھی سنائی دی مین نے کان تو کھڑے نہین کئے نہین دیکھا کہ مچھر راگ الاپتا فتح کے نقارے بجاتا تاریکی مین غائب ہوگیا . . . . . اب یہی حالت . . . کیا عرض کرون!

روحیلہ - آپ کا مضمون (نہ جانے کیون) ڈاک کے ذریعہ ملا - یہ آپنے اپنا پتہ نشان نہین بتایا - پھر جواب دیا جائے تو کہان؟ دہمکی نہ دیجیئے کہ مضمون شائع ہو تو آئندہ نہین لکھین گی ،، بہت ہے (نہ جانے کیون) نہین لکھا - آخر کوئی سبب؟

کہتے ہیں

۱۔ محبت کے لیئے دل کیطرح جو چھپا ہوا ہے پردہ ضرور ہے۔ جہاں کسی نے جان لیا کہ کسی کو کسی سے محبت ہے۔ وہ محبت نہیں بازاری ہوس ہے۔

۲۔ حسن و وفا دو خوبیاں ساتھ مشکل ہیں کہ ایک دوسری کی روادار نہیں۔ جب اچھی شکل کو سب ہی چاہیں تو وہ وفا کس کس سے کیجئے جو کر سکے حسین نہیں فرشتہ ہے

۳۔ کسی حسین پردہ نشین کو چاہنے والے کا خط ملے اور شرم کے مارے اسوقت پڑھ نہ سکے اور طاق میں رکھکر بھول جائے اور جب کوئی ہو تلاش نہ کرے ذرا مشکل ہے۔

۴۔ دو آدمی ایک دوسرے کو چاہیں اور تیسرا پہچان نہ سکے۔ یہ ممکن نہیں کسی سے پوچھیئے کہ تم نے کسطرح جانا؟ کیا میری نگاہ سے؟ نہیں عورت کی نگاہ سے۔

۵۔ جب دوپٹہ اوڑھنے کے سوا اور کچھ کام نہ دے دوپٹہ ہے اور محض ایک کپڑے کا نام ہے جب منہ چھپانے اور آپ کی طرف سے آنچل کا سرا کھینچکر آڑ کرنیکے کام آئے تو نرا دوپٹہ نہ رہا بلکہ کتاب محبت کا وہ ورق ہے جسکے آگے ہزار لیلیٰ مجنوں کے قصے اور لاکھ یوسف زلیخا کی مثنویاں ہیچ ہیں

۶۔ کسی سے محبت کرنا شاعرانہ تخیل کی حسن آرائی ہے مگر تحریک منافقت تعریب اور جذبات کا گلا گھونٹ دیتی ہے خواہ اس کا جواب اثبات ہی میں کیوں ہو

۷۔ عورت ہی حدد زندگی کی بنیاد ہے اور جو دل میں آ ما جا تہ ہیں او نکو چاہیئے کہ اپنے پیروں اور اپنی جوتیوں کو اس لائق بنائیں کہ وہ لوگوں کے دلوں کو پامال کرنے کے اہل ثابت ہوں۔

۸۔ حسن و عشق کی ہر زندگی کے لیئے، محبت کی پہلی غلطی، ہمیشہ دردناک رہی ہے اور اس راہ میں جب کبھی ٹھوکر لگتی ہے تو پہلے ہی قدم سو لگتی ہے مگر اس راہ کی پہلی غلطی ہمیشہ لاعلاج ثابت ہوئی ہے اس کا زخم جب گہرا ہو جائے تو پھر اس کا کوئی علاج نہیں

۹۔ لبا اوقات محبت چہرہ پہ نقاب ڈالکر آتی ہے جو بہت دلفریب ہوتا ہے

مگر اس کی دلفریبی کو چھپے ہوئے چہرے کی دلفریبی سمجھ لیتے ہیں ہم غلطی کر جاتے ہیں۔

۱۰۔ نظروں کا اصلی ٹھکانہ تاراج ناکامی ہو جاتا ہے تو وہ عشق کے دوسرے آشیانوں کی جستجو شروع کر دیتی ہیں۔

۱۱۔ جرم اور گناہ روح کا زخم ہے یہ محبت کے مرہم ہی سے اچھا ہو سکتا ہے لیکن دنیا کے پاس قید خانہ کا تازیانہ ہے۔

۱۲۔ تھوڑی فرقت محبت کو بڑھاتی ہے۔ اور زیادہ فرقت محبت کو قتل کر ڈالتی ہے۔

۱۳۔ آدم سب سے زیادہ خوش نصیب انسان تھا۔ کیونکہ اس کی ساس نہ تھی۔

۱۴۔ اتفاق تم کیا جانو اتفاق کیا ہے؟ اتفاق ایک سفید کبوتر ہے جو اپنی چونچ میں زیتون کی شاخ لیئے ہوئے ناتفاقی کے طوفان سے نجات دینے کی خوشخبری سنا رہا ہے۔ یا وہ چہچہاتی ایک بلبل ہے اور اپنے شیریں راگوں سے غمزدہ دلوں میں طرب پیدا کر رہی ہے۔ یا ایک خوبصورت عندلیب ہے جو آسمان پر اڑتی چلی جاتی ہے اور وہاں سے نسیم جنت بن کر واپس آتی ہے۔ یا وہ آسمانی فرشتہ ہے جو اپنے نورانی پر بہادر روحوں پر پھیلا دیتا ہے۔

۱۵۔ ایک محب وطن اپنے محبوب کے لیئے سولی کے تختہ کھڑا ہوتا ہے ایک پرستار حق اپنے مقصود کیلئے عیش و آرام کو خیرباد کہتا ہے ایک عالم و کشف راہ کشف و علم میں قربان ہو جاتا ہے

۱۶۔ محبت انسانیت اور عشق کی پاک قربانیوں کی ایک ان گنت صف تاریخ کے سامنے ہے

۱۷۔ حیات انسانی کی حدود سے بالاتر ایک روح ملکوتی شعلوں کی چادر کے اندر سے بنی نوع انسان کی غفلت پر ماتم کرتی ہے۔

۱۸۔ کتنی ٹھوکریں ہیں جو استقامت کا سبق دیتی ہیں۔ کتنی ناکامیابیاں ہیں جو کامرانی کا پیام لاتی ہیں۔ کتنی مایوسیاں ہیں جن کی تاریکی سے صبح امید طلوع ہوتی ہے۔

جناب حمید الدین صاحب ابو الفیض فخر۔ بی۔ یس۔ سی

بھائی صاحب نے یم۔ یس۔ سی۔ درجہ اول مین کامیاب کیا تھا۔ اور جامعہ مین لیکچرار تھے۔ مین بھی اوسی جامعہ کا ایک طالب علم تھا اور بی۔ یس۔ سی کا آخری سال تھا اقامت خانہ سے بھائی کے ہان چلا آیا۔ چونکہ مکان جامعہ سے قریب اور شہر کے بارونق محلہ مین تھا۔ اسلئے :۔ صد جلوہ روبرو تھا تو نرگان اٹھائے
اس عرصہ مین مین اپنے ہمسایون سے واقف ہوتا گیا ہمارے مکان کے سامنے ہی نینا کا مکان تھا۔ اور وہ کلیہ اناث مین تعلیم پاتی تھی۔ کالیج کی بس کیلئے اوسکو ہمارے مکان پر سے گزرنا پڑتا۔ اکثر اوقات ہماری آنکھین بھی چار ہوئین مگر پھر خود بخود و فور شرم سے جھک گئین۔ مجھے بھی بس کے لئے اوسوقت نکلنا پڑتا جبوقت کہ نینا کو اپنی بس کے لئے جانا ہوتا۔ تقریباً ہر دن ہماری مختصر مگر پر لطف ملاقات ہوتی رہتی۔

امتحان قریب آرہا تھا۔ فروری کا مہینہ تھا اور ہماری تیاری صفر تھی ہاکی کے مقابلون سے ابھی ابھی فرصت ملی تھی۔ چند روز ہوئے لاہور سے مین جامعہ کی ہاکی کے مقابلون مین شریک ہو کر واپس آیا تھا۔ سرمائی تعطیلات تفریح کی نظر ہو چکی تھین۔ فکر ہوئی کہ کچھ نہ کچھ امتحان کے لئے تیاری کرنی چاہیئے۔ چارپائی پر لیٹا تیاری کے منصوبہ باندھ رہا تھا۔ یہ مصمم ارادہ تھا کہ کل ہی سے پابندی ہوگی۔ جب طبیعت ذرا سست معلوم ہونے لگی تو ٹہلنے کے لئے چھت پر آیا۔ دیکھتا ہون سامنے والے مکان کے کمرہ مین نینا غرق مطالعہ ہے۔ مجھے معلوم تھا اس کا بھی بی اے کا آخری سال ہے۔ اب میرے ارادہ کو تقویت ہوگئی معلوم نہین کتنے دنون سے وہ امتحان کی تیاری مین مصروف تھی دوسرے دن جو اپنے کمرہ مین پڑھنے کیلئے گیا تو دیکھا نینا ہے اور مطالعہ۔ مجھے آج یہ محسوس ہوا کہ واقعی لڑکیاں ہم سے

زیادہ محنت کرتی ہیں۔ میری خود داری کو ٹھیس لگی یہ قطعی ارادہ کرلیا کہ خوب جی لگاکر پڑھونگا۔ اور اپنے تیار کیئے ہوئے نظام العمل میں فرق نہ آنے دونگا۔ دوسرے دن سے باقاعدہ مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔ وہ دیر گئے بعد آئی۔ اور اب ہم دونوں اپنے کتابوں کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ جب سورج غروب ہونے لگا تو میں اسکی طرف کنکھیوں سے دیکھا کہ آیا وہ چلی گئی یا موجود ہے۔ جب وہ جاچکی تو اطمنان کا سانس لیکر نیچے اتر آیا کہ جیت میری تھی۔

دوسرے روز اپنے کمرہ میں آیا تو نینا اپنے کمرہ میں موجود ہے اور مطالعہ میں ہمہ تن مصروف مجھے کچھ سبکی محسوس ہوئی۔ اسکی کسر اسطرح نکالی کہ شام کو دیر گئے تک پڑھتا رہا وہ مجھ سے پہلے چلی گئی اب میں یہ سمجھنے لگا کہ ہم دونوں کا مقابلہ ہو رہا ہے وہ لڑکیوں کی نمایندگی کررہی ہے۔ اور میں لڑکوں کی۔ میری ناکامی گویا تمام لڑکوں کی ناکامی ہے۔ مقابلہ بڑے زوروں پر جاری تھا۔ میرے اس غیر معمولی انہماک سے دوست تو دوست بھائی صاحب بھی اس تبدیلی کو محسوس کرنے لگے۔ شام کی تفریح تقریباً ختم ہوگئی تھی اچھے اچھے بکھر آئے مگر دل پر پتھر باندھکر خاموش ہوگیا۔ کبھی دوست مجبوراً گھسیٹ لے جاتے۔ اب دوستوں کی محفل میں دیر تک بیٹھنے میں ایک بے کلی محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ میں اپنا وقت ضائع کررہا تھا اور نینا شاید پڑھ رہی ہوگی میں تھوڑی دیر کے بعد معذرت چاہکر واپس چلا

کبھی نینا اپنے کمرے میں دیر سے آتی۔ مجھے نینا کے آنے کا بے چینی سے انتظار رہتا اور میں نے یہ دیکھا کہ اسکو بھی میرے کبھی دیر سے آنے کا احساس ہوتا۔ کیونکہ وہ میری غیر موجودگی میں اکثر کمرے کی طرف دیکھتی رہتی۔

امتحان کل سے شروع ہونے والا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اس توقع کہ زیادہ تیاری کی تھی۔ کامیابی کی امید تو پیدا ہوگئی یہ سب نینا کی بدولت تھا۔ نینا نہ اسطرح چھت پر پڑھتی اور نہ مجھے اسطرح کا مسابقتی شوق پیدا ہوتا اور نہ میں اس محدود عرصہ میں اسطرح تیاری کرسکتا۔

پرچے اچھے گزرے۔ نتیجہ کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ آخر کار وہ یوم حشر بھی آپہونچا جس میں قسمت کا فیصلہ تھا۔ ہم ناشتہ کی میز پر بیٹھے کہ نوکر نے

بڑے بھائی کو اخبار لا کر دیا - بھائی صاحب نے میری درجہ دوم میں کامیابی کی خبر سنائی لیکن مجھے تو کسی اور ہی کامیابی کا خیال تھا - اخبار لیکر طالبات کی فہرست پر نظر ڈالی - میری محسنہ کا نام کلیہ اناث کی فہرست میں نمایاں نظر آیا

مغنیہ سے خطاب

جناب محمد عبد الحق صاحب - رفیق -

اے حسین مغنیہ ! گائے جا اور گائے جا !

دو عالم کے طلسم کو توڑ دینے کا اقتدار تیرے لبوں کی جنبش میں پوشیدہ ہے -
آبشاروں کی ترنم ریزیاں، طیور کی نغمہ سرائیاں تیری ہی ہمنوا ہیں -
کانوں کی راہ سے شراب پلا کر مست و بیخود بنا دینا تیرا ہی کمال ہے -
جب تیرے گانے سے متاثر ہو کر فضا وجد کرنے لگ گئی ہو - تو اے حسین مطرب اپنی جنبش مضراب کو تیز تر کر دے - اور اپنی آواز میں اتنا لوچ اور اتنا اثر پیدا کر دے کہ ساری کائنات بصرف تیری موسیقی ہی مسلط ہو کر رہ جائے اور فرشتے سر بسجود ہو جائیں -
موسیقی جب نسوانی حسن کا جامہ پہنکر منظر عام پر ضیا پاشیاں کرتی ہے تو جذبات میں ایک تلاطم برپا ہو جاتا ہے - تیرے میٹھے اور رسیلے بول ایک زاہد خشک اور عابد شب زندہ دار کے پائے استقامت کو متزلزل کر دینے کی خوفناک طاقت پنہاں رکھتے ہیں -

اے روح افروز مغنیہ ! گائے جا اور گائے جا !

تیرا شیریں نغمہ انسان کو کچھ دیر کے لیئے اس رنج و محن سے بھری ہوئی دنیا سے نکال کر ایک دوسری دنیا میں پہونچا دیتا ہے - جو صرف حسن اور رومان کی دنیا ہے -
اور جس میں صرف خوشیاں ہی خوشیاں کارفرما ہیں !!!
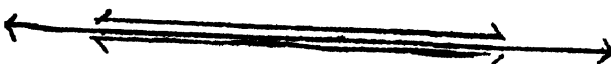
آثار قدیمہ

کا پتہ اکثر اتفاقات اور قرائین اور افواہوں اور کہانیوں سے چلا ہے۔

۱۔ اسپین میں بعض آدمیوں نے ایک غار میں جھانکا۔ انہیں وہاں چند تصویریں نظر آئیں۔ یہ تصویریں حیوانات کی تھیں۔ جو اب روئے زمین پر باقی نہ رہیں جس سے معلوم ہوا کہ کسی دور میں ایسے حیوان موجود تھے۔

۲۔ یونان کے علاقہ میں ریل ٹوٹ گئی۔ چند مسافر ٹہلتے ہوئے ایک پہاڑی پر جا پہونچے وہاں انہیں ایک قدیم آبادی کے نشان ملے۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ سنہ ۲ م سے ایک ہزار پہلے یہاں آبادی تھی۔

۳۔ یونان میں ایک شخص کو ٹوٹے ہوئے برتن کا ایک ٹکڑا ملا جس کے اوپر یہ کندہ تھا۔ وہ کون جنتی ہے جو سفید روٹی کھاتا ہے؟ دیوجانس فلسفی سے پوچھا گیا اس نے جواب دیا وہ زاہی جو دل نگل لیتی ہے۔

۴۔ اطراف کے بدوؤں میں یہ افواہ تھی کہ ایک ٹیلے کے نیچے شہر مدفون ہے۔

۵۔ ایک جرمن لڑکا ہومر کی منظوم الیڈ پڑھ رہا تھا اسے شوق ہوا کہ شہر ٹرائے (ٹراؤڈہ) کو دیکھے حالانکہ علما کہتے تھے اس شہر کا کوئی وجود نہیں ہے مگر لڑکا اپنے شوق سے باز نہ آیا اور (۳۵) سال کی عمر میں وہ مصیبتیں برداشت کر کے اس مقام پر جا پہونچا۔ زمین کھودتا رہا یہاں تک کہ شہر کے نشان مل گیا

۶۔ اٹلی میں شہر پامپیائی ہے جو پہلی صدی عیسوی میں آتش فشان پہاڑ نے اسے راکھ سے پاٹ دیا تھا اب کھودنے سے آثار نکل آئے کہ دو کانیں بدستور ہیں۔ ایک شراب خانہ میں مرمری میز اپنی اصلی حالت میں ہے۔ سڑکوں پر گاڑی کے پہیوں کے نشان موجود ہیں دیواروں پر اوس زمانہ کے سرکاری اعلان چسپاں ہیں۔ باغیچے بدستور ہیں۔

۷۔ ٹیونس سمندر میں ایک کشتی ملی جو دو ہزار برس پہلے غرق ہوئی تھی جس میں سنگ مرمر کے (۶۵) ستون تھے

۸۔ مغربی چین میں ایک مٹی کا کتب خانہ دستیاب ہوا قیاس ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں یہ دفن ہوگیا تھا۔ اسمیں تبتی چینی اور ترکی زبانوں کی (۵۰۰) فٹ مکعب تحریریں موجود ہیں۔ ۴۴

۹۔ شمالی ایشیا اور جنوبی روس میں ایک سکیتھی بادشاہ کی قبر ملی ہے اسکی تاریخ چوتھی صدی قبل مسیح بتائی جاتی ہے جسکے ساتھ

[illegible]

آسیب زدہ مکان

سلیم (کلیۂ امانت)

گرما کی چھٹیاں ملنے ابھی چند دن باقی تھے۔ نہ معلوم کیوں مجھے اتنی الجھن سی رہنے لگی تھی دل چاہتا تھا کہ جلدی سے کالج بند ہو جائے تو پھر کہیں چلینگے۔ مگر یہ کم بخت بھی جلدی بند ہونیکا نام نہ لیتا تھا۔ جب عمر خضر گزر جاتی ہے تو پھر یہ چند دن کس شمار میں تھے۔ آخر وہ دن آہی پہونچا۔ جس کا ہمیں بے حد انتظار تھا۔ صبح ہی ایک عجیب اداسی چھائی ہوئی تھی ہم بھی بہت ہی سنجیدہ تھے حالانکہ ہم تو وہ تھے جن کا کالج بھر میں اخوان الشیاطین کے نام سے شہرہ تھا پورا دن گزر گیا۔ سب سے باچشم تر گلے ملے گئے۔ خدا حافظ کہا گیا۔ اور اپنی شرارتوں کی معافی مانگی گئی۔ شام کے وقت جب بس میں بیٹھے تو قطرات اشک جیسی بیش بہا چیز کا کچھ غیر ضروری خرچ بھی ہوا۔ خیر یہ سب گھر پہونچنے تک ہی تھا۔ گھر پہونچتے ہی ننھو نے کہا کہ باجی! آسی بھیا آئے ہیں۔ اور حقیقتاً جب میں دروازے میں داخل ہوئی تو تسلیمات عرض کرتا ہوں کی آواز کے ساتھ ہی آسی بھیا آدھمکے۔ اب ہمارے لئے کہیں راہ فرار بھی نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن والا معاملہ تھا۔ مجبوراً اسلام کا جواب دیکر خاموش کھڑی ہو گئی کہ وہ ہٹیں تو آگے بڑھوں۔ مگر کیا کہنے ہیں۔ اس بندۂ خدا کی ہمت مردانہ کے کہ جیسے کھڑے تھے ویسے ہی قطب بنے کھڑے ہی رہے۔ اور مجھے ہی کہنا پڑا کہ مہربانی فرما کر ذرا ہٹ جائیے ارے آپ ابھی تک یہیں کھڑی ہوئی ہیں؟ مجھے خیال ہی نہ رہا کہتے ہوئے بھیا دوسری طرف چلے گئے اور ہم اندر اسقدر غصہ آرہا تھا بھیا کی اس حرکت پر جسکی حد نہیں۔

شام کی چائے کے بعد ہم سب پھوپی کے پاس چلے گئے وہاں بڑی دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ راحیل بھیا کا مہذب مذاق بہت ہی دلچسپ تھا۔ آسی بھیا کسی طرح چھیڑ رہے تھے۔ نہ معلوم اتی کو مجھ سے ایسی کونسی دشمنی تھی کہ ان سے بے تکلف ہونے نہ دیتی تھیں۔ اگر ایسے ہی میں بھیا سے ہنسی ہنسی میں کچھ کہہ دیتی تو ڈانٹ دیتیں کہ "کمو ہٹیں

شرم نہیں آئی بڑے بھائی سے مذاق کرتے" اور ہمیں خاموش ہوجانا پڑتا ۔ ہماری اس شرمندگی
بھیا زیرلب مسکرا کر خاموش ہوجاتے ۔ جب ہم راحیل بھیا کی با مذاق گفتگو کا لطف
اٹھا کر گھر واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ آنسی بھیا کل جا رہے ہیں ۔ ہمیں خوشی ہوئی مگر
پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمیں بھی انکے ساتھ جانا پڑیگا کیونکہ بڑے ہی عجز و انکسار سے
دعوت دیگئی ہے کہ ہم ان کے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر انکی عزت افزائی کا
باعث ہوں ۔ امی کے راضی ہونے پر ہم کو بھی راضی ہونا پڑا ۔ میں ۔ نمو ۔ ہماری خالہ
اور ہمارے بھائی جان سب نے ملکر دوسرے دن انکے گھر جانے کے لئے تمام تیاریاں
مکمل کرلیں ۔ شام کے چار بجے ٹرین میں سوار ہوئے تو تقریباً ۳ ½ بجے وہاں اسٹیشن
پہونچے ۔ گھر پہونچنے تک چار بج گئے ۔ گھر پر ممانی جان نگہت آپا عاصمہ بھابی
اور شاہد وغیرہ ہمارے انتظار میں تھیں ۔ تھکے ہوئے ہونیکی وجہ سے جاتے ہی سو گئے ۔
نئے گھر کو دیکھنے بھالنے کا موقع ہی نہیں ملا ۔ صبح اٹھے تو آٹھ بج گئے تھے ابھی تک نیند کا
خمار آنکھوں میں تھا ناشتہ کے بعد شاہد نے کہا کہ اوپر چلکر بیٹھیں ۔ سکون رہیگا یہاں
بچے بہت شور کرتے ہیں ۔ ہم سب اوپر چلے گئے ۔ عاصمہ بھابی نہایت ہی پیاری
تھیں ۔ بھولی بھولی اداس سی آنکھیں جنہیں دیکھکر بے اختیار دکھ ہوتا تھا ۔ کھلتا ہوا گندمی
رنگ ۔ پیارا پیارا کھڑا نقشہ حسین نہایت ہی جاذبیت تھی ۔ بھیا بغرض تعلیم امریکہ
گئے ہوئے تھے ۔ اسی وجہ سے بھابی عاصمہ ۔ کبھی کبھی سسرال آیا کرتیں زیادہ دن تو میکہ
ہی میں رہتیں ۔

تھوڑی دیر تک تو میں بیٹھی رہی مگر جب نیند بہت ستانے لگی تو وہیں سو گئی ۔ خوب
گہری نیند سو رہی تھی کہ یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی گلا دبا رہا ہے ۔ چیخنا چاہتی
ہوں تو چیخ نہیں نکل سکتی ۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پلنگ اٹھا رہا ہے ۔ یا میرے اللہ
تیری دہائی ہے ۔ نہ مجھ سے آنکھیں ہی کھولی جاتیں نہ کسی کو پکارا جاتا ۔ عجیب مصیبت تھی
اتنے میں باہر سے ممانی جان کی آواز آئی ۔ جب کہیں مجھے ذرا ہمت ہوئی اور میں اٹھکر بھاگی
اب اگر کسی سے اس واقعہ کا ذکر کرتی تو سب ہنسیں الٹا ابو نے آخر مجھ سے نہ رہا گیا
اور میں نے عاصمہ بھابی سے اس کا ذکر کیا انہوں نے جواب دیا کہ ایسی ہیئت سی

روایات اس مکان سے متعلق ہیں مگر ابتک تو ہمیں یہاں کچھ دکھائی دیا اور نہ کچھ ڈر محسوس ہوا

تنہائی سے میں اب ایسی ہی ڈر رہی تھی جیسے کوئی خوفناک درندے سے ڈرتا ہے۔ اب رات سر پر آئی۔ بس سے کہتی کہ میرے ساتھ سو رہو۔ خیر خدا سے دعائیں مانگتے سو گئے۔ کوئی آدھی گزرے یکایک آنکھ کھل گئی کیا دیکھتی ہوں کوئی سفید کپڑے پہنے سرہانے کھڑا ہے روح ہی تو نکل گئی۔ کوئی دعا بھی اسوقت یاد نہیں آرہی تھی۔ آنکھیں بند کئے ایسی پڑی تھی جیسے کوئی مردہ۔ ایسی مہیب مہیب ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی ڈھاڑ رہا ہے یا کوئی کسی پر جھپٹ رہا ہے۔ اب نہ تو کسی کو پکارنے کی ہمت ہے اور نہ ہی حقیقت حال کی آنکھیں کھولکر دیکھنے کی۔ تھوڑی دیر بعد جب یہ محسوس ہوا کہ کوئی نہ ہوگا تو ذرا سی آنکھیں کھولیں اب کوئی پلنگ کو پکڑے ہوئے پائنتی ہی کھڑا تھا۔ اب تو رہے سہے حواس بھی ختم ہوگئے۔ پلنگ بھی جھولنے لگا۔ مارے ڈر کے میرے منہ سے ایک زوردار چیخ نکل گئی جس سے نکہت آپا جاگ اٹھیں۔ اور پوچھا کیا ہوا۔ میں اپنے ہوش میں ہوتی تو جواب دیتی۔ جلدی سے نکہت آپا میرے پلنگ کے پاس آئیں۔ دیکھا تو میں گم سم لیٹی ہوئی تھی اور ٹھنڈا پسینہ بہ رہا تھا۔ آپا بہت گھبرا گئیں۔ فوراً آپا اور بھائی نے پانی وغیرہ چھڑکا جب کہیں جاکر مجھے ہوش آیا تو میں نے پورا قصہ کہہ ڈالا۔ یہ سن کر نکہت آپا بھی کہنے لگیں کہ" میں بھی یہاں پر بہت ڈراؤنے خواب دیکھتی ہوں کل دوپہر میں مجھے ڈر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ایک نہ معلوم سا ڈر۔ جب تم دولہا کو سو گئیں تو میں یہاں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے کوئی پیچھے سے ڈھکیل رہا ہے۔ میں نے کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ مبادا کہ میرا مذاق اڑایا جائے۔ اب باقی رات نیند کہاں لگتی انھیں قصوں میں رات کٹ گئی۔ صبح ہوئی بچوں کے شور و غل میں ہم سب واقعات بھول گئے

دوپہر کا وقت تھا ہم سب مکان کے باغ والے حصہ کی طرف برآمدے میں بیٹھے کھیل رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے ایک پیپل اور نیم کے درخت تھوڑے تھوڑے سے فاصلہ پر تھے۔ کیرم ہو رہا تھا۔ میں اور عاصمہ بھابی پارٹنر تھیں اور نکہت باجی دیباری خالہ۔ مجھے کھیل تو آتا نہ تھا مگر شوق ضرور تھا عاصمہ بھابی بہت عمدہ کھیلتی تھیں۔ جس سے گیم ہمارا ہی ہوا۔ اتنے میں آسی بھیا بھی

آگئے اور کہنے لگے کہ کارڈز کھیلینگے۔ ابھی کھیل شروع ہوئی تھوڑی دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ باہر کوئی بھائی جان سے ملنے آیا۔ آسی بھیا اور بھائی جان اٹھکر بھاگے اب ہم ہی ہم تھے بھابی کارڈز اچھا کھیلتی تھیں۔ مگر پیاری خالہ اون سے بھی بڑھکر تھیں۔ جسکی وجہ سے ہمیں بار ہوئی ہم ایسے ہی کارڈ سامنے رکھے باتیں کر رہے تھے کہ اس زور سے ہوا چلنے لگی کہ الامان والحفیظ۔ کارڈ ہوا میں منتشر ہو گئے چند ایک کارڈ اڑکر درختوں کے نیچے چلے گئے میں جلدی سے دوڑ کر وہاں پہونچی اور کارڈز لینے جھکی ہی تھی کہ کسی نے زور دار قہقہہ لگایا اور یہ کہتے ہوئے سنائی دیا کہ "کارڈز لینا آسان کام نہیں ہے" اسکے بعد کس کی ہمت تھی کہ جو کارڈز اٹھاتا۔ الٹے پاؤں جو وہاں سے بھاگی ہوں تو راستہ میں بھیا آسی سے ٹکرا نے بچی اور سیدھے کمرہ میں پہونچکر ایسی بے حال ہو کر گری ہوں کہ سب پریشان ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا ہوا۔ جب معلوم ہوا کہ میں ڈر گئی ہوں تو آسی بھیا نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہنے لگے کہ " واہ ! واہ ! اسقدر تعلیم یافتہ ہو کر ایسی بے سرو پا باتوں پر اعتقاد۔ میں کہتا ہوں کہ عورت لاکھ تعلیم پائے۔ مگر بیچاری کیا کر سکتی ہے جب اوسکی تخلیق ہی ایسی ہے خود اس کا دماغ ہی ایسا بنایا جائے کہ ہر چھوٹی سی چیز سے ڈر جائے پھر تم کس شمار میں ہو۔ دیکھو میں ابھی لاتا ہوں۔ دیکھیں تو سہی بھوت صاحب کیا کرتے ہیں" پھر بہ آواز بلند کہنے لگے " اجی بھوت صاحب! تمہیں قسم ہے اسی پیپل تلے کے بھتنے کی سلطان کی " کہ ہمارے سامنے اصلی روپ میں آکر ہمارا مقابلہ کرو ورنہ ہم تمہارے وجود کے قائل ہی نہ ہونگے۔ اس پر تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ آسی بھیا نے آگے بڑھکر کارڈز اٹھائے ہی تھے کہ ایک پرزور قہقہہ کے ساتھ ایک طمانچہ بھیا کے گال پر لگا۔ اور ایک آواز آئی " یہ منہ اور مسور کی دال " اب بجائے اسکے ہم ان کا مذاق اڑاتے ہم پر ڈر سوار ہو گیا۔ نہ معلوم میں اتنی ڈرپوک کیونکر واقع ہوئی تھی۔

جب ان تمام واقعات کی خبر نانی جان کو ہوئی تو وہ کہنے لگیں کہ کچھ تو جن گھر میں

قرآن ہو وہاں آسیب ہونا چہ معنی دارد۔ چونکہ یہ گھر ایک غیر مسلم کی میراث ہے اسلئے
شاید کچھ ہو اب اگر قرآن مجید کی آواز گونجے گی تو کسکی مجال ہے کہ ہمیں ستائے۔ چنانچہ
ہمیں پنجوقتہ نماز پڑھنے اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے کی تاکید کیگئی۔ اس سے مجھے کچھ
ہمت سی ہوگئی اور ہم نے اوس ارادہ کو جو گھر جانے سے متعلق تھا بدل ڈالا۔ اور چند دن
ٹھہرنے کیلئے راضی ہوگئے۔

اب ہم روز آنہ صبح اٹھکر ممانی جان کی ہدایتوں پر عمل کرتے دو تین دن یونہی گزر گئے
ایک روز بھابی عاصمہ اپنی ہی بیٹھی ہوئی کسی کو خط لکھ رہی تھیں کہ قلم میں سیاہی ختم ہوگئی
اونہوں نے اٹھکر بوتل نکالی اور قلم میں سیاہی ڈالنے کے بعد کھلی رکھکر غسل کرنے
چلی گئیں واپس دروازے تک بھی نہیں آئی تھیں کہ بغیر کسی وجہ کے سیاہی کی بوتل میز پر
الٹ گئی تمام کتابیں رائٹنگ پیاڈ سب ستیاناس ہوگئے۔ اسکے علاوہ وہ قیمتی ملاور
جو ابھی ابھی اون کے بھائی نے لادیا تھا۔ اوس کا بھی برا حال ہوگیا اتنا پیارا رنگ
تھا اسکا۔ حالانکہ اسوقت نہ ہوا ہی چل رہی تھی نہ کوئی اور ہی وجہ تھی۔ بھابی
بہت پریشان ہوگئیں۔ مگر بہادر تھیں بھاگی نہیں۔

اسکے دوسرے دن شاہو سوکر اٹھی تو کیا دیکھتی ہے کہ اسکا پلنگ پھولوں سے لدا ہوا ہے
تمام کمرہ پھولوں سے سجا ہوا ہے۔ میز پر گلدانوں میں اتنے خوبصورت پھول اس خوبصورتی
سے سجائے گئے تھے کہ واہ واہ۔ خود اسکے گلے کے پھولوں کے ہار اسقدر کہ انکی گرانی
ناقابل برداشت تھی۔ شاہو تو بہت ہی ڈر گئی۔

دوپہر کو سب کھانے بیٹھے تھے مگر بھیا اور ماموں کا کھانا باہر بھیجا گیا۔ کوئی
اون کے دوست بھی تھے ہم سب ابھی کھانا شروع کرنیوالے ہی تھے کہ ممانی نے
کہا کہ ذرا ٹھیرو۔ یہ کہکر انہوں نے یہاں کا کھانا باہر بھجوا دیا۔ مجھے تو بہت غصہ آیا
نہ معلوم یہ کونسی عقلمندی تھی کہ یہاں سے اٹھا باہر بھجوا دیا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ
جیسے ہی ماموں وغیرہ کھانا شروع کرنیوالے تھے کسی نے بہت سا خون رکابیوں
اور کٹوروں میں ڈالدیا۔

اسروز ۵ بجے کے قریب میں حمام میں منہہ دھو رہی تھی لیکن ساتھی باتیں
جلدی کر رہی تھیں۔ چلو چائے پئیں۔ خیر ہم منہہ دھوکر جیسے ہی چائے پینے ڈائننگ روم

چلے - انکے دروازے ہی پر کسی نے آگ رکھ دی تھی اور جلدی مین ہم اسکو دیکھے بغیر جو پاؤن آگے رکھے ہین تو وہ بکھر کر میرے پاؤن پر گری - میرے منہ سے اسقدر زور سے چیخ نکلی ہے کہ تو بہ ہی بھلی - آبلہ آگیا - مجھے بہت رونا آیا - اور مین خوب دل کھولکر روئی اور اسی روز بھائی جان کو مجبور کر کے مین واپس امی کے پاس لوٹ آئی -

ادہر خود وہ لوگ بھی گھر بدلنے کی فکر مین تھے ان کی کئی چیزون کا نقصان ہوا کئی برتن ٹوٹ گئے - ہمارے پیارے جگ گلدان سگریٹ کیس وغیرہ کا بھی کافی نقصان ہوا - زیورات گم ہو گئے - بھیا کے قیمتی سوٹ - بھابی کی زرین ساڑیان سلوزین - شلوارین - بھاری بھاری ڈوپٹے یا تو رکھے رکھے ہی خراب ہو گئے یا پہننے کیلئے نکالے گئے تھے باہر رکھے ہوئے ہی جل گئے یا کیچڑ مین لت پت پڑے تھے -

خیر چھٹیان جون تون کرکے کاٹین نتیجہ معلوم ہوا ہم کامیاب تھے تھرڈ ایر مین - اب ایک سال رہ گیا تھا پھر ہم بھی گراجویٹ کہلائینگے - ہم نے بھی جان توڑ محنت شروع کی اور خدا کے فضل سے جب بی - اے فائنل کا امتحان دیا تو فرسٹ ان فرسٹ آئے - گھر مین بہت خوشی منائی گئی - راحیل بھیا نے بھی اسی سال ایم اے کیا تھا اور انکی شادی بھی طے پا رہی تھی - جس سے انکی شادی ہو رہی تھی وہ میری عزیز دوست آنو کی چچازاد بہن تھی نہایت ہی خوبصورت و اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی - مگر راحیل بھیا کا عجیب حال تھا نہ معلوم کیون انہون نے ایک نہایت ہی طویل خاموشی اختیار کر لی تھی - اور کبھی بھی یہ ظاہر نہین ہو رہا تھا کہ اس سکوت کا کیا نتیجہ نکلیگا - بھیا بہت ہی پریشان اور اداس تھے - کئی مرتبہ رائے لی گئی مگر یہی جواب ملا کہ والدین کی رضامندی ہی میری رضامندی ہے بھیا کی سسرال بہت ہی امیر تھی چنانچہ ہماری ہونے والی بھابی بھی عالیشان جہیز لائی تھین

جب ہم بارات لئے دلہن کے شہر گئے تو ہمین انہین کے مکان کے ایک حصہ مین ٹھیرایا گیا جس مین خود دلہن والے تھے - مجھے یہ دیکھکر بے حد حیرت ہوئی کہ یہ وہی مکان تھا جس مین کہ ممانی جان وغیرہ رہ چکی تھین وہی آسیب زدہ مکان یا اللہ یہ لوگ کیسے ہین - مجھے سخت تعجب تھا - مین نے آنو سے پوچھا کہ کیا اس مکان مین غیر معمولی واقعات تو نہین پیش آئے ؟ تو کہنے لگی کہ ایک کئی واقعات ہو چکے ہین اور بعض تو ایسے بھی ہوئے ہین کہ جن سے انتہائی نقصان اٹھانا پڑا - مگر ہمارے چچا کو یہ مکان ایسا

پسند آیا ہے کہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ پرسوں ہی باجی (دلہن) کہہ رہی تھیں کہ کوئی ان سے
کہہ رہا ہے کہ شادی سے انکار کر دے ورنہ تیری خیر نہیں۔ مگر باجی اپنی ضد پر اڑی تھیں
کہتی ہیں کہ میں ضرور کروں گی۔ دیکھوں وہ میرا کیا کرتے ہیں"۔ یہ سن کر تو میرے ہوش اڑ گئے
عجیب عجیب خیال آ آ کر مجھے ڈرانے لگے۔ صبح نکاح تھا۔ ابھی سے طعام وغیرہ کی تیاری
شروع ہو چکی تھی۔ بہت ہی گڑبڑ مچی ہوئی تھی۔ ہماری ممانی۔ نشاہو۔ عاصمہ بھابی وغیرہ
سب آئی ہوئی تھیں۔ بھیا بھی امریکہ سے واپس آگئے تھے۔ جس سے بھابی کی باچھیں کھل
گئی تھیں اور ان کا حسن پہلے سے بھی زیادہ نکھر گیا تھا۔ یہ لوگ بھی شادی میں شریک ہوئے
کیونکہ ممانی جان پھوپی جان کی نند نہیں۔ نشاہو۔ عاصمہ بھابی۔ نکہت باجی وغیرہ تو
اف سے یہ سنکر دھک سی رہ گئیں اور دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگیں کہ خدا یا اس
پیاری بچی پر رحم فرما۔

گیارہ بج چکے تھے۔ غل غپاڑے میں کسی طرح کی کمی نہ آئی تھی بارہ بجے تک سب شور
مدھم پڑ گیا اور سب تھکے سے سب سونے کی فکر میں گئے ۱۲ ½ ایک بجے تک سو گئے۔ دلہن
کمرہ میں سوائے ایک بوڑھی خادمہ اور دو تین بڑی بہنوں کے اور کوئی نہ تھا اور یہ بھی
سب سو گئے تھے۔ ½ ۲ بجے کے قریب دلہن کے کمرے سے چیخیں بلند ہونے لگیں سب
اسی کمرے کی طرف بھاگے۔ مگر اندر لائٹ نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے روشنی کی گئی کسی نے
کرنٹ کاٹ دیا تھا۔ جب روشنی ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ دلہن پلنگ پر اس عجیب
ہیئت سے اوندھی پڑی تھی کہ دیکھنے سے دل ڈر جائے۔ آخر وہی ہوا جسکی آسیب دھمکی دے چکا
دلہن پلنگ پر مردہ پڑی تھی۔ آہ! وہ بھی عجیب وقت تھا جب شادی کے مہمان جنازے میں
شریک ہوئے ہیں۔ ہائے میرے اللہ ماں باپ بہن بھائیوں کے آنسو روکے نہیں
رکتے تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ نہ معلوم ان لوگوں کا ایسا کون سا
جگر ہوگا جو یہ دردناک سانحہ دیکھ کر یا سن کر ایک آنسو بھی نہ بہا سکا۔

اس دلخراش واقعہ کے چار مہینے بعد پھوپی ہمارے گھر آئیں۔ نہ معلوم امی سے
کیا گفتگو ہوئی کہ ہم سب سے یہ باتیں صیغہ راز میں رکھی گئیں۔ اس روز سے راحیل بھیا
ہمارے گھر بہت ہی کم آنے لگے اور جب کبھی بھی آتے امی مجھے ہٹ جانیکے لئے کہتیں۔
میں اس [illegible] صدمہ کو ابتک نہ بھول سکی۔ حالانکہ کوئی ایک سال کا

عرصہ گزر چکا ہے ۔ انو سے دریافت پر معلوم ہوا کہ انہوں نے جب سے گھر چھوڑ دیا ہے اسکے بعد سے وہاں کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ۔ مگر ان لوگوں کو اسقدر صدمہ ہوا کہ وہ بہت ہی دل برداشتہ ہو گئے تھے ۔ خصوصاً دلہن کی امی تو ہمیشہ روتی رہتی تھیں آنکھوں کے سامنے وہی تصویر پھر آکر تی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کمرے سے نکل گئی ہے یا اون سے گفتگو کرتے آ رہی ہے

مجھے اس گھر سے متعلق بڑی کھوج رہی ۔ جب میں دوبارہ ممانی کے پاس گئی تو خاص طور پر اس بات کا پتہ چلایا کہ آیا اس گھر میں کوئی رہتے بھی ہیں یا ویسے ہی اجڑا پڑا ہے معلوم ہوا کہ کوئی صاحب رہتے ہیں ۔ اتفاقاً وہ ابا کے شناسا نکلے ۔ اسی وجہ سے میں بھی صرف اس گھر کے متعلق واقعات سننے وہاں جا پہونچی ان صاحب کی لڑکی سے گفتگو کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ایک رات اوس کمرے میں جس میں دلہن سو رہی تھی وہ بھی سو رہی تھی تو کوئی حسینہ سفید کپڑے پہنے ہوئے آئی اور تمام واقعات دہرا کر کہا کہ " اب مجھے چین آ یا ۔ خدا کی قسم اب میں پھر کبھی نہ آؤنگی ۔ حمیرا اور راحیل سے سلام کہنا " یہ سن کر میرے آنسو نکل پڑے آہ !

بقیہ سلسلہ صفحہ (۴۷) چڑھائے ہوئے بھی تو رکشا والے ہوتے ہیں اگر انکے پاس پیسے نہیں ہوتے تو پھر وہ سینما گھروں ہوٹلوں میں کیسے آتے ہیں ۔ ۔ ۔ از دو تو مقامات کی رونق تو ان ہی سے ہوتی ہے میرے دل میں یقین ہونے لگا کہ رکشا والے بہت غریب نہیں ہوتے روزانہ کم از کم تین روپیے بھی ہیں تو ماہانہ اچھی آمدنی ہوتی ہے ۔ غریب تو ہیں جو دن رات مسلوں پر جھکے رہتے ہیں جو اپنا دماغ تن من سب اسکے پیچھے لگا دیتے ہیں اور اس مشقت کا معاوضہ ماہانہ صرف تیس روپیے لیتے ہیں ۔ غریب تو وہ ہیں جو شریف ہوتے ہیں اور اپنی شرافت نبھانے تیس روپیے پر ہی بسر کرتے ہیں ۔ جو عزت کے خاطر دوسرا کام نہیں کر سکتے ۔ جن کو صرف پیٹ بھرنے روٹی ہی نہیں بلکہ عزت نبھانے اور کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہی تو اصل معنوں میں غریب ہیں ۔ ۔ ۔ رکشا والوں کی طرح انہیں عمر بھر میں ایک وقت بھی سینما دیکھنا ہوٹلوں میں کھانا نصیب نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ٹن ۔ ۔ ۔ ٹن ۔ ۔ ۔ ٹن ۔ ۔ ۔ میں چونک پڑی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ سڑک پر رکشا جا رہا تھا ۔ ۔ ۔ رکشا والا دھوئیں کے یا دل اڑاتا گا رہا تھا ۔ ۔ ۔

مکتوبات جمیل

ساجدہ احمد محی الدین

پیاری روحی !

ابتک یاس اور حزن کے بہت سارے افسانے پڑھ ڈالے رنج وغم کے لاکھوں ہی قصے سنے جس وقت پڑھا دل مسلا ۔ رنج سے دم گھٹا مگر آج آنکھوں نے وہ نظارہ دیکھا جو لوح دل سے کبھی مٹ نہیں سکتا ۔ روحی ذرا سی دیر کیلئے اپنے تصور کی آنکھوں کو بند کر کے دیکھو کہ ایک گھر غربت اور افلاس جس کا بچھونا ، جہاں کی در و دیوار پر یاس نا امیدی برس رہی ہو اور جہاں روپیہ کی بارش نہیں بلکہ غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں ۔ کیا ہم اور تم جیسی تن آسان ہستیاں اس گھر کے رہنے والوں کی مشکلات کا اندازہ اور ان کے زندہ مگر مردہ قلوب سے تصور بھی کر سکتے ہیں ؟ بڑوں پر شدہ با بود گوشنت ،، مرجھائے ہوئے پژمردہ چہرے در اصل مفلسی کی زندہ تصویر اور زبان حال سے اپنی زبوں حالی کا دکھڑا رو رہے ہیں ۔ ہاں تو جذبات کی رو میں میں کہاں بھٹک گئی ۔ وہ نظارہ کیا تھا اور ان آنکھوں نے کیا دیکھا ؟

مدرسہ میں آج دوپہر کے وقت جب سارے ٹیچرس کھا پی چکے اور ایک طرف سب کے بکھرے ہوئے پیٹوں میں غذا بکھر ہی گئی تو دوسری طرف ایک معصوم اور کم عمر لڑکی فاقہ کا شکار بھوک سے نڈھال بے ہوش پڑی تھی ۔ ۸ ، ۹ برس کی جان اور دو دن سے مسلسل فاقہ تھا نقاہت نے چہرہ کی زردی کو اور زیادہ زرد بنا دیا تھا ستا ہوا چہرہ مردہ سا جسم بنچ پر پڑا تھا ۔ بہترے تدبیروں کے بعد ہوش آیا کسی نے ایسے ڈھونگ سمجھا تو کسی نے بیماری ۔ سچ تو یہ ہے کہ غریبوں کا دنیا میں کوئی سہارا اور مددگار نہیں ۔ موٹے کپڑے پہننے والے ٹاٹ پر سونے والے بیمار ہوں بھی تو اسے ڈھونگ سمجھا جائے اور قالین پر سونے والے ڈھونگ رچائیں بھی تو اسے بیماری پر محمول کیا جائے یہ ہے دنیا کا انصاف صداقت کو جانچنے کا معیار ۔ مسلسل تین گھنٹے گزر گئے اور معصوم جان اپنی بھوک کی نقاہت سے تڑپتی رہی ۔ کچھ پانی چھڑکا دودھ کا پیالہ

چلا گیا۔ ڈانٹا ڈپٹا تب کہیں ہوش آیا۔ اسکی ماں روتی دھوتی۔ اسنے بتلایا کہ بیچاری بیوہ پانچ بچے ہیں۔ ایک لڑکا کمانے والا اور دس کھانیوالے ہیں۔ یہ زندگی کا زندہ افسانہ تھا جسکو آنکھوں نے دیکھا کانوں سے سنا۔ دل رو رہا جگر پارہ پارہ ہوا — احساس کی بجلیاں چمکیں۔ آنسوؤں کی بارش برسی۔ احساس کا تار چھڑا اور اوس سے غم کے نغمے بلند ہوئے فضا میں پھیلے اور ساری فضا کو مرتعش کر دیا مگر روحی سوچو ذرا سی دیر کے لئے اپنے قیمتی وقت کو اس سوچ میں ضائع کرو۔ مگر نہیں ہم سوچیں ہی کیوں۔ ہمارے مسرتوں کے ملے اور خوشی کی گھڑیوں کو ایسے ناپاک خیالات سے آلودہ کیوں کریں۔ ہمیں اسکی ضرورت ہی کیا ہے۔ سکھ کی نیند لینے والے دکھ کے گیت کیوں گائیں۔ ہنستے ہوئے چہرے اور دل کو غمگین جھریوں سے بدنما کیوں کریں۔ اناج کے بھرے ہوئے تھیلوں کو دوسروں کے پیٹ میں کیوں ڈھکیلیں روپیوں سے بھرپور تھیلے ان کو روگیوں کا لنگا نہ کیوں بنائیں۔ اگر ہم آج ایسا کرنے لگیں تو دنیا میں ظلم و جور کا دستور کہاں قایم رہے؟

سعیدہ الانصاری

تاریکی کی پرچھائیں گہری ہوتی جاتی ہے اور میرے سپنے اس میں ڈوب کر ادھورے ہی رہ جاتے ہیں ——— ہمیشہ ——— !

سماج کے یہ خونی بندھن ——— جنہوں نے میرے ہندوستان کے اطراف جال سا بن رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے ——— آگ لگا دوں ان میں ——— پیروں تلے روند ڈالوں انہیں یہ سماج کی سنگین شکارگاہ ——— ہزاروں معصوم ——— لاکھوں بیگناہ ——— ان سنگین دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر ——— اور پھر ہار کر ابدی نیند سو جاتے ہیں ——— لاکھوں ہی نذرانے دیے جاتے ہیں اس قربان گاہ پر ——— مگر اسکی ہوس ہے، بڑھتی ہی جاتی یہ رسم و رواج کے قیود ——— یہ ذات پات کے الجھاؤ ——— انسان کو بندیوں سے اٹھا

پستیوں میں ڈھکیل دیتے ہیں۔ چاہتی ہوں کہ ان سب کو ختم کر کے ایک حسین و معصوم دنیا بسا لوں
مگر آہ احساس بیچارگی روک دیتا ہے اور قسمت مسکرانے لگتی ہے ——

—— "نہ بھول — ! تو ہندوستانی لڑکی ہے" ——

اور میرا سپنا ادھورا ادھورا ہی یاس کے اندھیاروں میں ڈوب جاتا ہے —!

میرا دل — حساس و پاکیزہ دل — چیخ اٹھتا ہے۔ کیوں نہ بغاوت کروں اس فرسودہ نظام کے خلاف — کیوں نہ انہیں کچل ڈالوں — یہ دکھ بھری آہیں یہ سسکتی سسکیاں — کیوں نہ انہیں مسرت بھرے نغموں میں بدل دوں —
اف — میرے کانوں میں بھیانک قہقہے گونجنے لگتے ہیں — جیسے میرا مسخرہ اڑایا جا رہا ہو میرے پاؤں میں پڑی ہوئی بےبسی و بےکسی کی زنجیریں صرف جھنجھنا کر رہ جاتی ہیں
یہ زنجیریں — جو ہمارے اپنے وطن نے ہمارے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں —
میرا ہی دکھی دل خون ہو جاتا ہے۔ مگر آہ قسمت مسکرانے لگتی ہے ——

—— "نہ بھول —— ! تو ہندوستانی لڑکی ہے" ——

یہ مرد —— کشتی ہند کے ناخدا —— بھارت کی غلامی کے بانی ——
خونخوار درندے —— سماج کے ٹھیکے دار —— قابل نفرت ہستیاں ——
جی چاہتا ہے انہیں ہمالیہ کی بلندیوں پر سے نیچے ڈھکیل دوں — جب یہ سسکنے لگیں تو میں مسکراؤں —— جب یہ تڑپیں تو میں ہنسوں —— جب یہ رحم کی بھیک مانگیں تو میں قہقہے لگاؤں —— جب انکی روحیں —— ان کے تڑپتے جسم سے وداع ہونے لگیں تو میں نظارہ کروں —— لطف اندوز ہوؤں ——
انہوں نے ہی پابندھ رکھا ہے ہمیں — ہمارے اعضاء مفلوج کر دئے ہیں —
ہماری قوتیں سلب کر لی ہیں —— کاش میں ان سے بدلہ لے سکوں ——
مگر آہ قسمت مسکرانے لگتی ہے ——

—— "نہ بھول —— تو ہندوستانی لڑکی ہے" ——

اور پھر میرے سپنے —— ادھورے ہی رہ جاتے ہیں ——
میری نگاہیں ہزاروں آرزوئیں اپنے دامنوں میں سمیٹے آسمان کی طرف اٹھتی ہیں میرا اپنا دل —— دھڑک دھڑک کر کچھ مانگتا ہے —— میرے لبوں سے

ایک ہلکی سی آہ نکل جاتی ہے ـــ میرے ہاتھ خود بخود معبود کی جناب میں اٹھ جاتے ہیں ـــ

اللہ میرے ـــ یا میری یہ نگاہیں ـــ میرا یہ ننھا دل ـــ میری یہ آہیں ـــ نہ جانے کب میری فریادیں لیکر تیری بارگاہ میں پہنچیں ـــ جانے کب تو انہیں شرف قبولیت بخشے ـــ

اعتدال

زہرا عبدالجبار

کسی بات میں حد سے بڑھ جانا نازیبا ہے۔ اسکی وجہ سے نقصان اٹھانا اور پچھتانا پڑتا ہے۔ حد سے زیادہ دوستی یا کسی سے بدلہ لینے میں یا غم و غصہ میں حد سے گزر جانا کسی طرح سے مناسب نہیں۔ عقلمند وہی کہلائے جانے کا مستحق ہے جو اپنی زندگی کے ہر پہلو میں اعتدال پر قایم رہے۔ عورت تو بظاہر ناقص العقل مرد بھی کسی نہ کسی بے اعتدالی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ کسی کو سگریٹ نوشی و سینما بینی کی حد سے زیادہ عادت ہے۔ کسی کا غصہ انتہائی حد کو پہنچا ہوا ہے۔ گھر کے بچے اور ملازمین خود بیوی بھی سہمی ہوئی رہتی ہیں کہ خدا معلوم یہ کوہ آتش فشاں کب پھٹ پڑتا ہے اور اسکے لاوا کی زد میں کون کم بخت آتا ہے۔

اکثر اپنی بیویوں کے اسقدر مطیع اور جی حضوری ہوتے ہیں کہ والدین کے حقوق بھول جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں اپنے دفتر کے کام سے انتہائی انس ہے نہ تو انہیں اپنی صحت کا خیال ہے نہ غذا و لباس کی پروا۔ بیوی بچوں سے دلچسپی نہ سیر و تفریح سے غرض جب مردوں کی گھٹی میں بے اعتدالی پڑی تو یہ گھٹی دینے والی بھی تو عورتیں ہیں۔ اگر ابتداء سے عورتیں اپنے بچوں کو اعتدال کے اصول پر تربیت دیں تو یہی بچے کل کے اچھے شہری ثابت ہونگے ـــ

کھانا، پینا، سونا، جاگنا، ہر بات میں بچپن سے اعتدال کی تعلیم ملتی تو آج ہمارے مرد اعتدال پر قایم رہتے۔ لیکن صد حیف کہ وہ خود نہ جانے کتنی باتوں میں حد اعتدال سے گزر جاتی ہیں۔ کوئی تو اپنے غصہ میں اسقدر آپے سے

باہر ہو جاتی ہے کہ بڑا ہو یا چھوٹا جو منہ مین آیا کہہ دیا۔ کسی کو تیر لگے یا بھالا۔ زبان ہے کہ قینچی کی طرح چلتی اور منہ سے ہے کہ کف جاری۔

کسی کو آزادی کی ہوا لگ گئی ہے۔ بے پردگی کا شوق شرم وحیا کے حدود سے تجاوز ہو چلا ہے۔ اگر دوپٹہ ، شلوار پہنی تو دوپٹہ برائے نام گلے مین پڑا ہوا سر سینہ کھلا ہے کوئی پروا نہین۔ اگر ساڑھی جاکٹ زیب تن ہے تو سینہ و بغل دعوت نظارہ دے رہا ہے۔ کوئی شرم کی بات نہین اون کا بڑھا ہوا شوق ایسی بات کی اجازت دے رہا ہے کہ وہ اسکی خاطر شرافت اور حجاب کو بالائے طاق رکھ دین۔ خَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُهَا۔

" رکشا والا "

ثمرو عبدالحمید

کالی کالی بدلیاں آسمان پر چھائی ہوئی تھین ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رنگ برنگے پھول عجیب سماں پیدا کر رہے تھے — امی۔ نے کہا کہ آج کالج نہ جاؤن بلکہ سب کے ہمراہ سیر کے لئے چلون — لیکن آج کالج جانا بھی تو ضروری تھا — شام مین واپس آئی تو گھر سنسان تھا مین اوپر اپنے کمرہ مین چلی آئی — رات کی رانی اپنی زلفین سیاہ بکھیرتی دنیا کی طرف بڑھنے لگی۔ دنیا پر ایک عجیب خاموشی طاری ہو رہی تھی۔ مین سونچنے لگی اب وقت کیسے گزارون — اوہو — میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا نیا رسالہ میز پر رکھا تھا — تنہائی کا ساتھی — مین نہایت شوق سے رسالہ دیکھنے لگی — دوسرے صفحہ پر نظر پڑی لکھا تھا " رکشا والا " اور مین نے جلدی سے کئی صفحے ایکدم الٹ دئے۔ اب تو رکشا والا " آہ " سماج کا دان " دولت کی بھینٹ کے عنوانات سے نفرت ہو گئی ہے۔ ہر رسالہ مین ان عنوانات جو افسانے لکھے جاتے ہین تقریباً سب کا پلاٹ ایک ہی ہوتا ہے — مین سوچتی ہون کہ آخر تصویر کا ایک رخ ہی کیون نمایاں کیا جاتا ہے — دوسرے رخ پر کیون توجہ نہین کیجاتی — آخر ہر افسانہ مین ہر رکشا والے کو کیون مار دیا جاتا ہے

رکشا والوں سے زیادہ محنت کرنے والے بھی تو اس دنیا میں بستے ہیں تو پھر وہ انکی طرح کیوں نہیں مر جاتے - - - - -

تقریباً اس عنوان کے افسانہ کا پلاٹ یہ ہوتا ہے کہ ایک غریب رکشا والا کبھی امیر لڑکی سے محبت کرتا ہے صرف غربت کی وجہ سے اس محبت میں ناکام رہتا - اور آخر کار اسی رنج میں جان دیدیتا ہے - یا ایک نہایت غریب انسان جس کے جسم پر گوشت کا نام نہیں ایک دوکاندار سے رود ہو کر رکشا حاصل کرتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ روزانہ مقررہ روپیے ادا کریگا ــــ لیکن جب وہ دن بھر خون پسینہ ایک کرتا ہے تو اوسکے ہاتھ صرف چند آنے لگتے ہیں - ان چند آنوں ہی کو لیکر وہ خوش خوش تصور میں سنہرے محل تعمیر کرتا ہوا گھر لوٹتا ہے - لیکن اسی اثنا میں ایک امیر آدمی کی موٹر سے ٹکر ہو جاتی ہے - رکشا ٹوٹ جاتا ہے - رکشا والا زخمی ہو جاتا ہے لیکن اس حادثہ کا امیر پر کوئی اثر نہیں ہوتا وہ الٹا اسی کو برا بھلا کہتا ہے ــ گرنے کی وجہ سے پیسے سڑک پر بکھر جاتے ہیں جو آخر کار پولیس کے جوان کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں - رکشا والا دوکاندار کے پاس پہونچتا ہے اور اس سے عاجزی سے کہتا ہے کہ وہ پیسے جلد ادا کر دیگا - لیکن دوکاندار جواب میں ایک لات رسید کرتا ہے جس سے یا تو خون کی ایک زبردست قے ہوتی ہے اور وہ ختم ہو جاتا ہے یا سڑک پر کسی موٹر کے نیچے آ کر کچلا جاتا ہے

بھلا کوئی بتائیے آخر کون پڑھے ــــ کوئی نئی چیز ہو تو پڑھی بھی جائے وقت گزرتا گیا اور اسکے ساتھ ہی رسالہ ختم ہوتا گیا ــــ آخر اس امید پر شاید کوئی اور کوئی پلاٹ ہو میں نے پڑھنا شروع کیا ــــ مگر توبہ کیجئے کوئی نئی چیز تھوڑی ہوتی وہی پرانا پلاٹ ــــــ آخر کار میں نے رسالہ رکھدیا اور آنکھیں بند کر لیں - - - - - - - ابھی چند سکنڈ بھی نہ گزرے تھے کہ ہزاروں رکشا میری آنکھوں میں گھومنے لگے - - - لال - پیلے - رنگوں - - - موٹے موٹے ریشمی پھندوں کا نیلا دینا، ممتاز شاستی کی تصویروں سے آراستہ - - - پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ تمام رکشائیں میرے سامنے آ کر رک گئیں - - - اور ان میں ایک آدمی جو کہ ان کا لیڈر معلوم ہو رہا تھا میری جانب بڑھا اور کہنے لگا - - - - - - - - - -

کیا وجہ ہے کہ تم ہمیں غریب اور حقیر سمجھتی ہو ــ کیا تم نہیں جانتیں کہ ہماری آمدنی

روزانہ ۵ روپیہ ہوتی ہے ——— تم ہمیں محتاج سمجھتی ہو —— لیکن غور کرو گی تو
خود ہی کو ہمارا محتاج پاؤ گی ——— ہم دوکاندار سے رکشا لیتے ہیں اور کرایہ بھی دیتے ہیں
پانچ کمانے میں تو دو روپیہ دیتے ہیں ——— ہمیں تمہارے جیسے ٹھاٹ باٹ نہیں
چاہیئے ——— پیٹ بھر کھانا ملجائے بس دوسرے ڈھکوسلے تم ہی کو مبارک ———
ان کو سب ہمارے سر تھوپ کر کیوں ہمدردی جتاتی ہو —— کسی دن پیسے کم ملتے ہیں
تو دوسرے دن اسکی کسر پوری کر لیتے ہیں ——— ہم تمہارے جیسے بے وقوف
نہیں ہیں ہم تمہاری ضروریات فوراً تاڑ جاتے ہیں جب تمہیں فوراً کام ہوتا ہے
اوسوقت ہم منہ مانگا کرایہ وصول کر لیتے ہیں ـ ـ ـ ـ اسکول سینما گھر ...
اسٹیشن ہمارے لئے نعمت ہیں بتاؤ ان مقامات پر کون مجبور رہتا ہے .... اسوقت
ہماری شان بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ تمہاری ...... پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ
اسکی آنکھیں انگارہ کی طرح دہکنے لگیں اور وہ غصہ کے مارے سرخ ہو گیا۔ اس نے
مٹھیاں بھینچ لیں اور چلا کر کہنے لگا ..... آخر کیا وجہ ہے کہ تم مضمون نگار ہمیشہ ہم پر
پولیس کی مار پڑتی ہوئی بتاتے ہو ...... وہ زمانہ گزر گیا کہ ایک انسان
دوسرے کی مار کھا کر خاموش رہتا تھا ..... دنیا بدل گئی ہے اب کوئی
کسی سے نہیں ڈرتا ـــــ اب تو اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے ....
اب رہی پولیس تو اون کو اب اسکی فرصت کہاں کہ رکشا والوں کو مارتے پیٹتے
رہیں .... ان کا کام تو آجکل فرقہ وارانہ فساد کو روکنا ہے ۔
کہو کیا یہ جھوٹ ہے ...... بولتی کیوں نہیں .... جواب دو نا ..
بس خاموش رہی ـ ـ اس کا غصہ اور بڑھ گیا ... اس نے چلا چلا کر
بولنا شروع کیا .... اور ..... اور میں چونک پڑی ... دیکھا تو وہی
کمرہ ہے نہ رکشا ہے اور نہ رکشا والا ....

میں سوچنے لگی سچ ہی تو کہہ رہا تھا وہ رکشا والا .... آخر یہ مضمون نگار
ہمیشہ رکشا والوں کو ہڈیوں کا ڈھانچہ کیوں بتاتے ہیں ... بالوں میں
خوب تیل ڈالے ..... بال الٹائے .... ہاتھ پہ گھڑی منہ میں پان دبائے
سگار اڑاتا ہوئے گلے میں مفلر یا دستی ڈالے آنکھوں پہ ہر موسم میں سیاہ چشمہ

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۲
3238
R.E.D.-M.N.D.

زیر سرپرستی خاص اعلیٰحضرت خسرو دکن و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

دور عثمانی کے وہ مستند مصنوعات جن کے مفید ہونے سے دنیا کی کوئی ہستی انکار نہین کرسکتی

ہر جگہ ملتے ہین

نظام وجیٹیبل ہیر آئیل

دکن ہیر آئیل

گولڈن اسنو

دکن ٹائیلٹ پوڈر

دکن ہیر کریم

ذولفکس تین سال کے مسلسل تجربہ کے بعد نیز بمحض اون حضرات کی فرمائش پر تیار کیا گیا ہے جن کے بال کمزوری سے بکثرت گرتے ہین۔ ذولفکس تو دو روز مین از سر نو بال پیدا کرنے مین مفید ثابت ہوا ہے راست ہم سے طلب فرمایئے۔ قیمت فی بوتل علاوہ اخراجات للعہ ۱۲ چار روپیہ بارہ آنہ مقرر ہے۔

مبارک ہے وہ ملک جو اپنے ملک کے مفید مصنوعات سے مستفید ہوتا رہا اور قابل فخر ہے وہ کارخانہ جو ایمانداری سے دنیا پر اپنا اعتماد قائم کرلے

دکن ہیر آئیل کمپنی اعظم پورہ روبرو گمپیں پل چادرگھاٹ حیدرآباد دکن

محمودیہ مشین پریس چارمینار مین چھپ کے دفتر شہاب دبیر پورہ سے شائع ہوا۔

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب بیر پوہ سے شائع ہوا

۲۸ ——— "ایک باغ ہے جس میں خزاں کے آثار شروع ہو گئے ہیں"

۲۹ ——— "ایک اچھی آواز جو تاریک راتوں میں دور سے سنائی دے اور بھلی معلوم ہو"

۳۰ ——— "قدیم ادبیت جس کا کسی وقت بڑا شہرہ ہو چکا ہے"

۳۱ ——— "معطر پھولوں اور پختہ پھلوں سے لدا ہوا درخت ہے لیکن افسردہ ہے"

۳۲ ——— "شمع ہے جو اپنی عمر ختم کر چکی ہے اور جس کی روشنی بھی مضمحل ہو چکی ہے"

۳۳ ——— "ایک کتاب ہے جس کا شیرازہ بکھر گیا ہے اور اوراق منتشر ہیں"

۳۴ ——— "ایک خیابان ہے جو کسی وقت فطرت سے بر سر تھا لیکن آثار خوشبو رہ گئے ہیں"

۳۵ ——— "ایک ضعیف سی روشنی ہے جو غروب کے بعد ہی نظر آسکتی ہے"

۳۶ ——— "ستارہ صباحی جو جلد غروب ہونے والا ہے"

۳۷ ——— "کسی مقفل کمرے یا حمام کے اندر کی آواز"

۳۸ ——— "گرم پانی کا پیالہ جو گرمی میں کسی پیاسے کو دیا جائے"

۳۹ ——— "پرانا قصر ہے جس میں سوائے مٹے ہوئے نقوش کے اور کچھ باقی نہیں"

۴۰ ——— "ایک ایسا حمام ہے جس میں ہوا کے لئے کوئی منفذ نہیں اور اگر انسان اس کے اندر آجائے تو دم گھٹ کر مر جائے"

(ماخوذ) ———

رباعی

ہیں اہل عزیز شمع بیگانہ ہے جلتا ہے چراغ سے جو پروانہ ہے
سب کی ہے سوئے کدۂ روشن پہ نگاہ جو ہے نئی روشنی کا پروانہ ہے

حضرت اکبر

عورت اہلِ ایران کے نزدیک

نفیس جہاں

ایرانیوں نے ۱۶ سال سے لیکر ۴۰ سال تک عورت پر جو تنقید کی ہے وہ خالی از لطف نہیں چنانچہ انکا بیان ہے کہ چودہ سال کی عمر میں عورت "اُس برگ پوش گلاب کی طرح ہے نہ جس کا رنگ ابھی ظاہر ہوا نہ خوشبو" پندرہ سال کی عورت ان کے نزدیک "سرو کا درخت ہے جسے نسیم کا ہلکا جھونکا بھی جھکا دیتا ہے"

۱۶ سال کی عورت "ایک چشمہ ہے جو تنکوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ لیکن اس کے نیچے شفاف پانی لہریں لے رہا ہے"

۱۷ ——— "ماہ کامل ہے عشوہ و ناز سے آراستہ"

۱۸ ——— "دوپہر کا چڑھتا ہوا آفتاب ہے جو آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے"

۱۹ ——— "پختہ رنگین سیب ہے کہ اگر کوئی اس کو توڑنے والا نہیں ہے تو زمین پر گر کر تباہ ہو جائے گا"

۲۰ ——— "آفتاب ہے مائل بہ انحطاط"

۲۱ ——— "سایہ دار صنوبر کا درخت ہے جس کے سایہ میں لوگ راحت پاتے ہیں"

۲۲ ——— "ایک رباب ہے جن کے تاروں سے نغمے نکل کر لوگوں کو مست کر دیتے ہیں"

۲۳ ——— "ہرنی ہے جس کو صیادوں نے گھیر رکھا ہے"

۲۴ ——— "ایک قصیدہ ہے کہ کسی شاعر نے ایسا قصیدہ نہ کہا اور جو مطلع سے مقطع تک بالکل زریں گلوبند معلوم ہوتا ہے"

۲۵ ——— "نسیم سحر ہے جو بدمستوں کو جگا دیتی ہے"

۲۶ ——— "گلاب کا پھول جو پوری طرح کھل چکا ہے اور دیکھنے والا چاہتا ہے کہ اسکو توڑ کر سر و سینہ سے لگائے"

۲۷ ——— "بدر کامل جو گھٹنے والا ہے"

آنسو

آنسہ باصرہ عبدالرؤف

اُف یہ کمبخت آنسو — ! اسی لیئے نہ کہا کرتا تھا کہ شادی نہ کرونگا — ! عورت کے آنسو — آہ خدا اس سے سمجھے اس نے کسی طرح میرے ارمان و تمناؤں کا خون کیا ہے — میں کہاں تک گناؤں کہ اس ناشاد کی وجہ سے میں نے کون کون سے ارمانوں کو خود اپنے ہاتھوں قبر میں کھود کر نہ سلایا۔

دن کا واقعہ — ! ہاں وہی — اسد نے جو وعدہ کیا آج چلنا فلم دیکھنے — مگر بیگم صاحبہ کے آنسو نے اس کا بھی ستیاناس ملا — کئی پیسے کتنے تماشہ اس آنسو کی نظر ہوئے — ؟ اب مجھ سے نہیں رہا جاتا یہ نامراد عورتوں کو اتنا جلد کہاں سے آنسو ابل پڑتا ہے — ؟ ! اس روز جو میں نے ان سے کہا کہ بیگم ذرا میرے کپڑے دھوبی کے پاس سے آگر پڑے ہیں رکھدو مگر اللہ کی بندی کو رکھنا تھا نہ رکھا — میں نے جو ڈانٹ بتائی تو لگے گورے رخساروں پر ڈھلکنے قیمتی "آنسو"۔ بات معمولی تھی مگر اس آنسوں نے مرعوب ہی کرلیا ! کل نھنی کا منہ صبح سے شام تک نہ دھلا ۔ میں سنے جو ٹوک دیا ساون بھادوں کی طرح جھڑی لگ گئی — !!

نوکری کا ملی ۔ آجکل پیسے تو اچھے پڑھے لکھوں کو جلدی نوکری نہیں ملتی ۔ اگر مل جائے تو غنیمت جانئے تو مجھے نوکری ملی ڈیرھ سو روپیہ ماہوار پر ۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور گھر والوں کو یہ خوشخبری سنائی ۔ سب کو بہت خوشی ہوئی — اور یہ طے پایا کہ فی الحال میں تنہا چلا جاؤں اور یہ لوگ یہیں رہیں گے ۔ مگر یہ بات بیگم محترمہ کو ناگوار گذری مجھسے رو رو کر کہنے لگی کہ بھلا میں تمہارے بغیر کیونکر رہونگی ۔ لاکھ سمجھایا مگر وہی آنسوں کی بارش اس اچھاوے میں اپنے مستقر وقت پر پہنچ سکا ۔ لیجئے ابھی خاصی نوکری بیگم کے آنسوؤں نے ہڑپ کرلی ۔ میرے سارے منصوبے خاک میں مل گئے ۔ نہیں معلوم اس بچپانش روپلی پر کیونکر بسر ہوگی — ! ابا میاں کا وظیفہ کب تک کافی ہوگا — سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کر بھی کیا سکتا ہوں — ان آنسوؤں کے ڈر سے خاموش ہوں — !

ہونا چاہیئے ۔ عورت کی فطرت الگ اور مرد کی الگ ہوتی ہے ۔ اور جس طرح عورتیں فطرتاً ایک سی ہوتی ہیں اسی طرح
مرد بھی ۔ فطرتیں جدا جدا بھی ہو سکتی ہیں مگر شاذ و نادر ۔ شادی ایک جوا ہے اور بار عورت ہی کی ہوتی ہے ۔ مرد عشق
فارغ ہوتا یا ہونا چاہتا ہے دونوں بات ایک ہی ہے ۔ میری رائے کیا دریافت کرتی ہو ۔ میری سنو تو اگر تم میں خدمت
کا جذبہ ہے اگر تم اپنی خودداری کو دوسرے پر نثار کر سکتی ہو اگر تم اپنے دل کو بغیر کسی تمنا کے رکھ سکتی ہو (یعنی تمنا تو
ضرور کر سکتی ہو مگر اسکے پورے ہونے کی توقع نہیں رکھ سکتیں) تو ہاں شادی کرو اور ضرور کرو ۔ کیونکہ شادی کے بعد
عورت کی زندگی کامیاب اسی وقت سمجھی جاتی ہے کہ وہ مرد پر اپنے آپ کو ہر طرح قربان کر دے ۔ سمجھیں؟
مگر یاد رکھو کہ سمجھنے اور کرنے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا زمین اور آسمان میں ۔ یہ شریک زندگی یہ "رفیق تنہائی"
شریک حیات' یہ سب تحریری الفاظ ہیں یقین مانو صرف کتابی ۔ حقیقت کی دنیا سے اسکو کوئی تعلق نہیں ۔
مرد کبھی تمھاری زندگی کا شریک نہیں بن سکتا ۔ وہ اپنی آزادی میں بیوی کی آمد مداخلت بیجا سمجھتا ہے ۔ بیوی
کیلئے وہ اپنے ان درجنوں دوستوں سے اپنی ان ہزاروں دلچسپیوں سے کبھی علیحدگی گوارا نہیں کر سکتا جو دن رات
اس پر مسلط ہوتے ہیں ۔ اگر تم نے کبھی ان کو ہٹانے کی کوشش کی تو یاد رکھو کہ تم خود ہٹادی جاؤگی ۔ اس کے بعد بھی بہت
ممکن ہے تم کھانے پینے کے لئے مرد ہی کی ممنون احسان ہوگی ایسی حالت میں بھی تمھیں اپنے "شریک حیات" کی رحمدلی
پر خوش ہونا پڑے گا کہ اسنے تمھیں الگ کرتے ہوئے بھی تمھاری کفالت کا ذمہ لے رکھا ہے ۔ تم شاید دریافت
کرو کہ مرد تو اپنی خوشی سے ہی شادی کرتا ہے اور بیوی مرنے کے بعد بھی فوراً خانہ پری کر لیتا ہے پھر بیوی کی آمد
"مداخلت بیجا" کسی طرح ہوئی! یہ تو فطرتی جذبہ ہے بھئی! شریف مرد بجائے ادھر ادھر بھٹکنے کے بہتر ہی سمجھتے
ہیں کہ شادی کے بہانے ایک عورت گھر میں آجائے ۔ جو ان کے جائز جذبات کو پورا کرتے ہوئے گھر کی دیکھ بھال
کر لیتی ہے اور بچے پیدا کر کے انکو کئی درجن صاحبزادے اور صاحبزادیوں کا "پدر بزرگوار" بھی بنا دیتی ہے ۔
مرد عورت کو بچے کے ایک کھلونے سے بڑھکر کبھی نہیں سمجھتا جب جی چاہا اور دوستوں سے فرصت ہوئی تو اس
کھلونے کی طرف بھی دو گھڑی کو متوجہ ہو جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ عورت صرف بچے پیدا کر کے ہی خوش ہو سکتی ہے
وہ اسے اپنے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کھانے پینے اور باتیں کرنے کا اہل کسی طرح بھی نہیں سمجھ سکتا ۔ لیکن وہ دن دور
نہیں کہ مرد کے خیالات جو آج کل حقیقت کا جامہ پہنے ہوئے ہیں محض خواب ہو کر رہ جائیں ۔ تعلیم کے سہارے
جو عورتیں اپنے بل بوتے پر کھڑی ہو رہی ہیں انہیں اب مرد کا سہارا لینے کی قطعاً ضرورت نہیں ۔ عورت نے
ابتدائے آفرینش سے مرد کے ساتھ وفا کی مگر نتیجہ ۔ گھل گھل کر جان دینا کسی مذہب نے نہیں بتایا ۔
مسلمان مرد نے مذہب کی آڑ میں جو جو سلوک عورتوں کے ساتھ کیئے اور کر رہے ہیں اس کا جواب پا لینے
کے لئے شاید انہیں بہت زیادہ انتظار کی ضرورت نہیں ۔

میں تحلیل ہو جاتیں —

حیات کے فوریں غنچوں کو سسکتا ہوا علالت کا نامہ بر ہر روز اپنی تاریک یاد سے میری روح لرزا دیتا — اداسی کے بے رنگ بادل از خود دل کی امنگوں پر چھا جاتے۔ افسردگی کے عالم میں سر جھکائے خاموش زرد گول چہرہ لیے میں اپنے سفید بستر پر ایک بیمار سی اداس انگڑائی لیتی — اور صحت آفریں دنوں کی یاد خار بنکر سینے میں کھٹکنے لگتی — اشک حسرت گوشۂ چشم پہ ابھر آتے کھلے مشرقی دریچوں سے دریائی موجوں پر لوٹتی ہوئی باریک سنہری اور دلربا کرنوں کا ہجوم کمرے کی وسعتوں میں پھیل جاتا۔ رنگین پرندوں کے سریلے ننھے فضاؤں میں کوئی ہلکا سا شور مچا دیتا پوشیدہ آرکسٹرا دلفریب موسیقی پھولوں کی نکہت میں مل جل کر تصورات پر عجب طرح کا سکر آمیز لیکن نادیدہ اور سحر انگیز اثر چھوڑ جاتی — حد نظر تک پہاڑی بلندیوں پر اگے ہوئے قدرتی پھولوں کے انبار میں ہلکی سنہری دھوپ کی تازہ کرنیں اپنی باریک نوکوں سمیت گھستی چلی جاتیں اونچے سبز بلوط بلند چوٹیوں پر پھیلی ہوئی باریک نرم نو پتیوں پر خورشید خاور کا بہتا ہوا رخ انور اپنی دلکشی کے ساتھ اونچا ہوتا چلا گیا —

آہستہ آہستہ کائنات تاریکی کا نقاب چاک کر کے زندگی کے نئے انداز میں بیدار ہوتی — خواب ناز سے تازہ دم ہو کر حیات نو کے مسافر زندگی کی دوڑ میں گام زن ہوتے ہر طرف نور ہی نور کا سیلاب پھیل جاتا — پُر مسرت چہروں پر صحت مندی کے نشان جگمگاتے — اور کش مکش حیات میں یوں مصروف ہو جاتے — گویا یہ دنیا کوئی بازی گاہ ہے جسے انہوں نے خوابوں کی کائنات کے پوشیدہ جزیروں سے ڈھونڈ نکالا ہے —

رباعی

بت خانے میں ہے بتوں کا جلوہ بنکر
کعبے میں عیاں نور تجلے بنکر
اللہ رے جمال کبریائی تو بھی
پھرتا ہے زمانے میں تماشا بنکر

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

لرزاں سائے

سلطانہ

افق کے دامن میں نئے نئے رنگوں کے تازہ نیلے سرخی اور زرد بادل آ گئے ۔ دلکش نغموں کی جان نواز موسیقی جذبات پر پرانی شراب بنکر بکھر گئی خیالوں کی دنیا میں کیف پرور تصورات شعلوں کی سرخ زود رقصاں کرنوں کے تار لمبی انگلیوں کی طرح پھیلتے چلے گئے ! تاریکی حیا آلود انداز میں سمٹ سمٹ کر افق کے آخری کناروں میں روپوش ہو گئی ۔

دریائی ساحلوں پر دھوئیں کی ہلکی ہلکی باریک لکیریں ہوا میں لہرائیں اور نیلگوں فضاؤں میں گھل مل کر رہ گئیں ۔

خاموشی گہری اور معنی خیز خاموشی کے ساتھ خوابوں کے سائے میں مجبور روحوں کی طرح ، اداس اور افسردہ زندگی آہستہ آہستہ تلملاتی رہی ۔ تمناؤں کے بجر سے پر آرزوؤں کے دلکش انبار لیئے سیاہ پانیوں کی تاریک وسعتوں کے درمیان نہ جانی ہوئی امیدوں کے بے پار تصورات کے بادبانوں سے لپٹی چلی جاتی کائنات کی بلندیوں پر پھیلی ہوئی افسردہ مسرت کے بے مزہ جذبات ۔ سرد اداس اور بے کیف اندھیں ادھر ادھر اڑتے چلے جاتے ۔ دلوں کے سکوں میں ہیجان انگیز تلاطم کی لہریں اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے رنگ برنگی کرنوں کا گہرا جال بنتے ہوئے لرزاں سائے ابھرتے اور معدوم ہو جاتے ۔ دل کی اداسی پر نئی امنگوں تازہ آرزوؤں سے لبریز جذبات کا طوفان ابھر آتا اچانک صبح کا قاصد نیلگوں آسمانوں پر نمودار ہوتا اور روشنی کا دیوتا اپنی طلائی کشتی زندگی کے سمندر میں کھینے کے لئے سنہری کرنوں اور جال دار تاروں کے پیچھے پھیلاتا ہوا ، اپنے شبستانوں سے نکل آتا ۔ نئے دن کی ہلکی روشنی میں تازہ اور رنگین پھولوں کی جاں بخش خوشبوؤں سے چھلکتے ہوئے جھونکے بیہوش خواب گاہ کے دریچوں سے سنہری کے پردے ہٹا کر گھس آتے نغمہ سحر کی تانیں روح کو برماتی ہوئی دھندلی فضاؤں

آخر تک نہیں پتہ چلنے نہیں پاتا ۔ بس یونہی ان جغرافیائی بھول بھلیاں میں کھو کے رہتے ہیں۔
ہماری یہ چین ہستیوں کو دیکھیا وہ اس بے ثبات دنیا اور اس کے اجزاء کا ہمارا موضوع
فکر بنا — ہنسی آتی ہے اس [illegible] پہ —

۷ ۔ ان کی جماعت میں ہندو مسلم فساد —— ارے توبہ اتحاد ہوتا ہے شیر بکری ایک گھاٹ
پانی پیتے ہیں اور دریائے لطافت خود مسکرا مسکرا کر پلاتا ہے اور ہم — ع
جو تو دریائے مئے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا
ہنس ہنس کر جھوم جھوم کر پیتے ہیں — اللہ ہی خیر کرے — شاید ہمارا لسانی اتحاد ہی اس
دریائے شعر میں ڈگمگاتی ناؤ کو پار لگا دے ۔

۸ ۔ اس مقدس کلاس کی بھی سیر کر لیجئے — پڑھانے والی فرشتہ سیرت معصوم سی ہیں —
کچھ [illegible] کھوئی کھوئی سی آپا ہیں یہ ہماری — تقدس میں وہ رنگینی کہاں جو گناہ کی ایک لغزش
میں ہے شیطان ہی تو گنہگار بنکر ہی دل یزداں میں آج تک کھٹکتا ہے — اور پھر زندگی سے
یہ خلش یہ چبھن یہ لازوال کھٹک نکل جائے تو اس کے سارے ساحرانہ انداز گم ہو
جائیں بڑی دلچسپ ہو جاتی ہے یہ جماعت ہم گنہگاروں کے بے تکے سوالوں سے —
ہمارے ہر سوال کا جواب کل پہ ٹال دیا جاتا ہے ۔ اب اللہ جانے یہ کل کب آئے ۔!
اب رہیں باقی اور جماعتیں — تو یوں سمجھ لیجئے — وہ کہتے ہیں نا — دور
کے ڈھول سہانے — بس کچھ یوں ہی سی بات ہے —

یاد رکھیے

پرچہ ہر مہینہ نہایت احتیاط سے ڈاک کیا جاتا ہے اگر کوئی پرچہ آپکو
نہ ملے تو وہ ڈاک خانہ کی بدنظمی ہے جس کے سبب پرچہ متاثر ہو رہا ہے
تاہم اگر اندرون (۱۵) تاریخ کوئی پرچہ نہ ملے تو مکرر طلب کر لیں ورنہ دفتر میں
کوئی کاپی نہیں رہتا ہے
بارہا عرض کیا گیا ہے مگر آپ توجہ نہیں فرماتے اور پھر شکایت ہوتی ہے پرچہ نہ پہنچے

کہ پڑھانے والی بھی بڑی ہی "کرم فرما" ملی ہیں — جنکی آنکھوں کے بے پناہ گردش میں ہماری اپنی قسمت
بھی کبھی کبھی چکرا جایا کرتی ہے —

۴ - توبہ ہے ان جماعتوں میں کیا کچھ نہیں سکھایا جاتا — لکھنا پڑھنا تو رہا ایک طرف — بیٹھے بٹھائے
گڑے مردے اکھاڑنے میں جانے کہاں کا فائدہ نظر آتا ہے انہیں — جب دیکھو سینکڑوں ہزاروں
برس ادھر مرنے والوں کی باتیں شاید پہلے کے بادشاہوں کو کچھ کام نہ تھا کہ آپس میں لڑتے مرتے تھے
ذرا ذرا سی باتوں پر اور پھر جنگیں اللہ جھوٹ نہ بلوائے برسوں تک چلتی تھیں — ہزاروں کٹ
مرے — وہ بھی کسی کی جان گئی اور ان لڑنے والوں کی ادا ٹھہری — سوائے کٹ مرنے
کے اور کوئی سی بات نہیں — زندوں کی تاریخ میں یہ فرسودگی کہاں — گھنٹے کے اختتام سے
پہلے ہی ایک کاہلی سی پھیل جاتی ہے ساری جماعت میں —

۳ - اگر آپ نے اب تک کسی شیریں بیاں کو نہیں دیکھا تو اس بلبل شیراز کو چہکتے ہوئے دیکھئے پر
قسم ہے کھو جائیں گے آپ ان کی شیرینی اور لطافت میں — فصاحت و بلاغت کے کڑوے گھونٹوں
میں بھی تھوڑی سی شکر گھول دیتی ہیں کہ تلخی کا احساس نہ ہو — لیکن زیادہ مٹھاس کھاؤ تو آخر میں ایک
ذرا سا تلخی کا احساس ہو ہی جاتا ہے — کچھ یوں ہی لگتا ہے ہمیں بھی اس جماعت میں —

۵ - ان کی کلاس میں کیا کچھ نہیں — دل کی دھڑکنیں — نشش کی حرکتیں درد کی اینٹھن،
اعصاب کا کھچاؤ غرض سب ہی کچھ تو ہے — یہ ہیں علم الابدان کی ماہر جن کا کام گندی گلیوں
میں بھی رنگینیاں بھر دینا ہے — پر اللہ جانے کس چیز کی جستجو نہیں ہے کہ بے چین نگاہوں کو قرار
ہی نہیں — خوب سے خوب تر کی جستجو ہے شاید — سدا بھٹکتے ہی دیکھا ان کی مسکراتی
نگاہوں کو اور ادھر ہمارا یہ حال کہ —

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی — !!

مضمون تو کچھ خشک سا ہے مگر پڑھانے کے انداز نے کافی دلچسپ بنا دیا ہے اور شاید یہی
تو ہے کمال طریقہ تعلیم کا —

۶ - آئیے ان سے بھی مل لیجئے — یہ اپنے ننھے سے دماغ میں ایک دنیا بسائے ہوئے ہیں —
دنیا کے بڑے بڑے شہر ان کی "سیر و سیاحت" در آمد برآمد — غرض کیا کچھ نہیں ہماری
شہر پر مسکراتی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے — جملے اس جماعت میں ہم کیا پڑھتے ہیں

ہماری جماعتیں

خالدہ شمیم

آج تو جی چاہتا ہے سب کچھ کھول کر رکھ دوں ——— ایک ایک بات پر سے پردہ اٹھادوں ان سب باتوں کا پول کھول ہی دوں جس سے اپنا گھٹنا کھول آپ ہی لاجوں مرنا پڑے ——— اور وہ بھی جن پر خود کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں ——— تو پھر لکھ دوں اپنی جماعتوں کے متعلق ۔ ہماری جماعتیں ۔ کیا کچھ نہیں ہوتا ——— پیاری پیاری استانیوں کی حسین بوکھلاہٹیں ——— اور ہماری اپنی دلچسپ بدحواسیاں ۔

جانے کہاں کی رنگ برنگی تیتریاں جمع ہو گئی ہیں ہمارے اس اسکول میں ۔ حسین تتلیاں جنہیں دیکھ کر ہمیں بے تحاشا اپنا بچپن یاد آجاتا ہے ——— ہمارا پیارا بچپن!! ——— اور اب ——— ابھی اب تو زندگی کی مصروفیتوں سے دم بوکھلا گیا ۔ خیر جانے بھی دیجئے ——— اب یہ باتیں لیجئے وہ گھنٹی بج رہی ہے ۔ شروع ہو گئیں ہماری جماعتیں ۔

۱ ۔ الجھنیں کہاں نہیں ——— زندگی خود ایک الجھن ہے ——— کوئی کہتا ہے سمجھ میں نہ آنے والا معمہ ہے یہ ۔ یا پھر ایک ان دیکھی پہیلی ——— جسے کوئی نہ بوجھ سکا اب تک ——— بس کچھ یوں ہی ایسی انجانی پہیلیاں سمجھائی جاتی ہیں اس جماعت میں ۔ لیکن اللہ رے یہ پہیلیاں ——— قانون اور قاعدہ کی پابند ۔ عجیب ضیق میں جان ہے ——— پر اللہ سلامت رکھے پڑھانے والی کو بڑا ہنس مکھ اور ساتھ ہی ذرا دلچسپ بھی ہیں ۔

۲ ۔ بھئی اللہ یہ انگریز ہوتے ہی ہیں کچھ پھیکے شلجم ——— اور پھر ان کی زبان ——— جانے کہاں کا اللہ واسطے کا بیر ہے ہم میں اور اس میں ——— ہو تو دیے باس کے پھول ہوں ان کی رنگتوں میں ملاحت اور شیرینی ڈھونڈنے والا خود شیر ایسے دقوف ہیں تو بڑی ناپسند ہے ۔ جانے بڑا کھوا تی سی زبان ہے ——— جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ——— اور پھر تو یہ سو درسے

دامن میں لپیٹ لئے۔

اسے یاد آئی اپنی زندگی کی ایک ہی مسکراہٹ، بہار ایک رنگین اور خوشگوار شام۔ شادی کے تیسرے دن وہ جمنا کے کنارے ریت پر بیٹھی تھی۔ فیروز اس کے زانو پر سر رکھے اور دریا کی آغوش میں آہستہ آہستہ بہتی ہوئی ایک کشتی کو دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف رنگینیاں بکھری ہوئی تھیں۔ پانی کی سیمیں دھار غروب ہونے والے آفتاب کی ارغوانی کرنوں سے رنگین ہو رہی تھی۔ ایسے سمے ان کی اپنی قسمت بھی مسکرا پڑی۔ کتنی مسرور تھی وہ اس وقت! انگلی میں پڑی ہوئی خوبصورت انگوٹھی سے جو فیروز نے اسے سہاگ کی رات پہنائی تھی کھیلتے ہو سے وہ تصورات اور مستقبل کے خوشگوار خیالات میں کھو گئی۔

ساکن ندی میں ذرا سی کنکری تو گری تھی۔ پل بھر کو اس نے پر سکون موجوں کو گھبرا دیا تھا۔ یہہ خوشی کا لمحہ بھی اس کی اپنی زندگی میں ایک بار ہی آیا۔ دوبارہ وہ یوں فیروز کے ساتھ فضا کی رنگینوں میں گم نہ ہو سکی —— جمنا کی سیمانہ بدوش فضائیں اس کے فیروز کو راس نہ آئیں —— اسی رات اس کے فیروز کو بخار ہوا —— بوسیدہ فلک کو اس کی مسکراہٹیں نہ بھائیں۔ جانے یہہ تیرطا سپہر جا آسمان کسی کو مسکراتے، ہنستے کیوں نہیں دیکھ سکتا —— ایک ماہ تک اس کا فیروز بخار کے عالم میں بیہوش رہا —— خدا جانے اسے کیا ہو گیا تھا —— ڈاکٹروں کی رائیں بھی مختلف تھیں فیروز کی بیماری کے متعلق —— کوئی کچھ کہتا، دوسرا اس سے اختلاف کرتا —— اور ان ہی اختلافوں کے درمیان ایک دن اس کا اپنا فیروز اس سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا ——

اور جب ہی سے اس کی روح اضطراب و اضطرار کے سکون سوز شعلوں میں جلنے لگی—!!

ناہید:— نہ جانے کیوں خواتین اور لڑکیوں کو اس نام سے محبت ہے ایک عرصہ سے مسلسل تقاضہ ہے کہ پرچہ ناہید علیحدہ شائع کیا جائے۔ شہاب کے خریداروں کو ناہید تو مشترک ملیگا البتہ ناہید کے جو خریدار ہونا چاہیں وہ تین روپیہ سالانہ چندہ بھیجدیں اور ایسی سو درخواست وصول ہوں تو ہم (فوراً) سے ناہید پہلے کی طرح علیحدہ شائع کرنے کیلئے آمادہ ہیں۔

تو گئی لیکن کچھ دبی دبی سہمی سہمی - ڈرتی ڈرتی یہاں چرائے - راستہ بھر دونوں نے کچھ بات نہ کی
جیسے سوچ رہے ہوں دونوں انجان سپنوں کی تعبیریں ڈھونڈ رہے ہوں مچلتی پگڈنڈی کی راہ ہیں —
ادھر فیروز سوچتے سوچتے سوچتا کس قدر شرمیلی ہے یہ لڑکی - اس کی جھکی جھکی شربتی
آنکھوں میں جیسے میخانے بس رہے ہوں — اور یہ مسکراتے ہونٹ جیسے انجانے ہی میں مسکرائے
جا رہے ہوں — ادھر وہ بھی ٹھٹک رہی تھیں - یہ فیروز بھی کتنا اچھا ہے - دوسرے
لڑکوں سے کس قدر مختلف — اور اس نے جھکی جھکی نگاہوں سے اسے دیکھا - مضبوط تندرست
جسم سانولا سلونا رنگ بڑی بڑی آنکھیں جن میں جانے کہاں کی شوخیاں آکر مچل رہی ہیں -
وہ یوں ہی جھکی جھکی نگاہوں سے فیروز کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی کہ یک بارگی اس کی نگاہیں
فیروز کی شوخ نگاہوں سے ٹکرائیں - فیروز مسکرا پڑا اور وہ خود کچھ اس طرح گھبرا گئی جیسے
فیروز نے اسے ایک مجرمانہ حرکت کرتے دیکھ پایا ہو — اور پھر جب وہ رات کو پلنگ پر لیٹی
تو پہلی بار اس نے محسوس کیا کہ اس کی رگ رگ میں جیسے آگ سی بھڑک رہی ہو انجان سی شورش
ایک نامعلوم سی چبھن سارے جسم میں پھیلتی معلوم ہوئی — وہ رات اور جانے کتنی راتیں
ابھی کی - فیروز کے گنگناتے خیالوں میں بسر کیں —
اس دن کی پرستی فضاؤں کے بعد سے وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہی گئے
یہاں تک کہ ایک دن شہنائیوں کے سازوں میں وہ ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے —
ساکن ندی میں ایک ذرا سی کنکری پھینک دینے سے ان گنت موجیں گھبرا اٹھتی ہیں
ایک ہلچل مچ جاتی ہے - ایک ہنگامہ تڑپ اٹھتا ہے - بالکل ایسی ہی تو اس کی اپنی زندگی تھی
سوئی سوئی سی زندگی جس میں نہ کچھ ہیجان نہ کوئی ہلکا سا اتفاقی ہنگامہ ہی — مگر فیروز کو پاتے
ہی اس نے محسوس کیا جیسے اس کی زندگی کی موجیں جاگ اٹھیں ان میں ایک لخت کھلبلی سی مچ
گئی - سپنوں کی ان دیکھی تعبیریں ان تڑپتی موجوں کی اوٹ سے جھانکنے لگیں - اور وہ
مسکرا پڑی ان لچی بھری مسرتوں پر جیسے یہ ابدی ہوں - کتنی احمق تھی وہ جانتے بوجھتے
ہوئے بھی — خدا ہی کنکری کی بھلا حقیقت ہی کیا ہوتی ہے - ذرا سی جان جو خود دوسروں
کا سہارا ڈھونڈے وہ خود کسی کا کیا سہارا بن سکے - کتنی ویران ناچتی موجوں کو پریشان
کرتی - ساکن ندی پھر ایک بار ساکن ہو گئی - یہ کون جانے اس سکون کی تہہ میں اب بھی
کتنی تڑپ کتنے اضطراب چھپا ہوا ہے جو اگر مضطرب ہو جائے تو ایک جہاں کو اپنے

اپنی طرف گھورتے پاتی تو سٹ پٹا کر حیران سی ہو جاتی سہم جاتی - آخر کیوں گھورتے ہیں۔
یہ لڑکے اور وہ حیرانیوں میں الجھی ہوئی نفسیات کی موٹی موٹی کتابوں میں اس کا جواب
ڈھونڈنے لگتی -

اس کی زندگی بس یوہی گذری چلی جارہی تھی۔ خاموش چپ چپاتی زندگی جیسے سوئی
سوئی سی زندگی ہے اس کی - لیکن ایک دن جب بجلیاں کوند رہی تھیں، بادل مچل رہے تھے
اور آسمان سسک رہا تھا تو اس کی زندگی کا رومان شروع ہوا - وہ کالج کے لانبے سے
ورانڈے میں سب سے الگ تھلگ موٹی موٹی کتابیں سنبھالے نوکر کے انتظار میں کھڑی
تھی - مغرور جوانیاں سسکتے آسمان کی پرواہ کئے بغیر ایک دوسرے کے ہاتھ کا سہارا
لیئے وہاں سے نکل کھڑی ہوئیں — اب وہ اکیلی وہاں رہ گئی لیکن وہ کیسے جائے - کس قدر
شرمیلی تھی وہ زندگی کے اس معصوم دنوں میں وہ وہیں دیوار کا سہارا لیئے ان سرکش جوانیوں
کے مغرورانہ انداز پر حیرانی سے جیسے کچھ سوچنے لگی - سوچتے سوچتے جب اس کی سمجھ میں
کچھ نہ آیا تو تھک کر وہیں پڑے ہوئے ایک اسٹول پر بیٹھ کر کتاب دیکھنے لگی - انتظار کی
گھڑیاں کسی طرح گذارنا تو تھیں - آج نہ جانے کیا ہوا تھا نوکر کو - اسے نوکر پر غصہ آرہا تھا۔
اب وہ کب تک یہاں اکیلی بیٹھی رہے پھر خیال آیا - اس بارش میں بیچارا آبھی کیسے سکتا ہے -
ہارن کی آواز پر وہ چونک پڑی اب کون آرہا ہے - ؟ اس نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔
وہ کچھ ابھی سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ پرلی جانب کے کمرے سے فیروز کتابیں سنبھالے باہر
نکلا - وہ یوں ہی چلا جاتا لیکن وہ تو خود اسی کی گود سے کتاب گر پڑی اور فیروز نے پلٹ
کر حیرانی سے دیکھا -

"ارے آپ ابھی تک نہیں گئیں - ؟"

"نہیں - نوکر ابھی تک نہ جانے کیوں نہ آیا — اس نے کچھ گھبرا کر حیران سی نگاہوں سے دور
برستی فضاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا - فیروز نے اسے اپنی موٹر میں آنے کی دعوت دی کہ
وہ کب تک یوں اکیلی بیٹھی رہیگی - بارش کے رکنے میں تو ابھی بہت دیر ہے - اور پھر
جانے نوکر آئے بھی یا نہیں — وہ سوچنے لگی سچ کہتے ہیں - اس کا اپنا نوکر تو ہے نہیں
بڑی بھابی کا نوکر آیا نہ آیا - یوں کب تک بیٹھے - فیروز نے بہت اصرار کیا اور وہ خود
کچھ سوچ کر کہ بھلا پرائے نوکر پر کیا بس کب تک یوں انتظار کرے اس کی موٹر میں بیٹھ

نشیمن بر دوش

جناب اظہر صاحب

یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا یہ ہواؤں کا خروش ایسے [illegible] زدہ فضا میں نشیمن بر دوش
کتنے بیگانے زمیں دستوں میں میرے زہر فروش ہائے جس خواب پہ آوارہ وطن ہوتا تھا
وہ بھی میرا ہی وطن تھا مجھے معلوم نہ تھا

کتنے طوفانوں میں چھیڑا تھا تیری بزم کا ساز
کتنی آہوں نے جلائی تھی تیری شمع نیاز
کتنے ظلمات میں اک صبح کو دی تھی آواز
تھی جہاں صبح کے سورج کو بھی کرنوں کی تلاش
میں وہاں دام فگن تھا مجھے معلوم نہ تھا

یہ کلاہوں کے یہ پیچ و خم یہ امارت کا خمار
ہم نشیں کتنے اجالے ہیں سیاہی بہ کنار
کتنے صیاد ہیں اپنے ہی کمندوں کے شکار
پھول جس خار کے پیوست رگ جاں ہوں لگے
وہ بھی میرا ہی صحن تھا مجھے معلوم نہ تھا

میں سمجھتا تھا تیری خاک ہے غربت کی پناہ
کیا خبر تھی کہ ٹھہرنا بھی ہے رستے میں گناہ
نہ ہواؤں کا بھروسہ نہ فضاؤں سے پناہ
اور افق پر جو جلا تھا سحر سے پہلے
وہ بھی صبحوں کا کفن تھا مجھے معلوم نہ تھا
کیا خبر تھی کہ ہوائیں نہ تیری آئیں گی راس
باغبانوں کی نگاہیں بھی نہیں لالہ شناس
میں نہ سمجھا تھا تیری بزم سے اٹھوں گا اداس
میرے اخلاص کے نغمے میرا آہنگ وفا
میرے ساتھی کی شکن ہے مجھے معلوم نہ تھا

[illegible]

شباب

دنیا کو دیکھنے کیلئے [illegible] برابر [illegible] ہو دنیا کے [illegible] بڑے [illegible] عورتیں کتنی ہیں اور کہاں بستی ہیں؟ کیا تم اس جدید مخلوق کو عورت کہنے کی جرات کر سکتے ہو جو لندن اور نیویارک کے کارخانوں میں پہیہ کی طرح حرکت کرتی ہیں۔ نہ وہ ماں ہیں اور نہ بیوی نہ ان کا سر کسی [illegible] رفیق [illegible] پر ہے اور نہ ان کی گود میں محبت اور نسوانی جذبات کا مرکز ہے وہ محبت اور شفقت کی [illegible] ہوئی [illegible] یا کارخانوں کی ایک [illegible] مزدور یا ایک ایسی مخلوق ہے جو مزدور کی طرح روٹی اور کپڑے کیلئے تکلیفوں اور مصیبتوں میں کود پڑتی ہے۔ مرد محنت اور مشقت اپنے بچوں کیلئے کرتا ہے اور عورت صرف اپنے نفس کے لئے۔ بہر حال وہ کوئی [illegible] عورت نہیں ہے۔ وہ مرد بھی نہیں ہو سکتی بلکہ وہ ایک تیسری ہی جنس ہے جسے خدا کی جگہ [illegible] اور گستاخ انسان نے پیدا کیا ہے

ناکام تمنا

حسین خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے

زندگی کیا ہے فقط خواب ہے دیوانہ کا یہ معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

زندگی تو زلف پریشان میں الجھنے کا نام ہے اور وہ بھی اس ساماں کے ساتھ جسکی تلقین خیام نے اپنے فلسفۂ شاعری میں کی ہے —

کسی محبوب اور شرمندہ چہرہ کا نظارہ سب کچھ سمجھا دیتا ہے۔ حقائق حسن و عشق ایک لذت رکھتے ہیں لیکن دیکھنے والوں کو کب چین آتا ہے وہ دوسروں کی بربادیوں میں اپنی کامیابی سمجھتے ہیں اگر واقف ہوتے تو یونہیں نہ کرتے ...

کچھ آنسو تھے کچھ آہیں تھیں کچھ درد و الم کے قصے تھے
ٹوٹے ہوئے دو دل ملتے تھے دنیا کو گوارا ہو نہ سکا

جس زندگی کو آپ بے کیف کہتے ہیں وہی زندگی دوسروں کے لئے صد ہزار رنگیاں رکھتی ہے۔ دنیا مرکر بھی جینے کی آرزومند ہے۔ اور جینے والے مرنے کی تمنائیں مرتے ہیں اس فلسفہ کو تو بڑے بڑے حکیموں کے دماغ بھی حل کرنے سے قاصر ہیں۔ —

اے شخص کا حسرت ہو دیکھی ہے کبھی تم نے
رو بھی جو نہیں سکتا ہنس بھی جو نہیں سکتا

عورت

(ایک یورپین نقاد)

عورت کو قدرت نے جن فرائض کے انجام دینے کے لئے پیدا کیا ہے انکو وہ کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتی انکی حقیقت اب بھی وہی مسلم ہے جیسی کہ ابتدائی عہد وحشت میں رہی ہے وہ انسان کے ماں بننے کے لئے پیدا کی گئی ہے اسکی نازک اور ضعیف خلقت کبھی بھی ان کاموں کے لئے موزوں نہیں۔ جو گھر کی زندگی کے باہر انجام دے جاتے ہیں۔ موجودہ تمدن نے اس قدرتی حد بندی کو توڑ دیا ہے اور عورت کو گھر کی شہنشاہی سے نکال کر اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے آوارہ گردی کرنی پڑی تاہم اس کا نتیجہ وہی نکلا جو احکام قدرت کی ہر خلاف ورزی کا ہونا چاہئے۔

آج یورپ اور امریکہ میں عورتیں کلرک یا کسی ورزشی کھیل کے میدان میں اول درجہ کا چاندی کا کپ لینے والی ضرور ہیں مگر نہ وہ ایک اچھی ماں ہیں جو بچوں کی پرورش کرتی ہیں اور نہ اپنے نسوانی فرائض ادا کرنے والی بیوی ہیں جن کا میدان گھر سا اندر بنایا گیا ہے!

خلقت انسانی کا وہ حسین و لطیف پیکر جس کا شگفتہ چہرہ کائنات کا اصلی حسن جسکی مسکراہٹ عالم ارضی کی حقیقی مسرت تھی افسوس کہ آج دنیا سے چھینا جا رہا ہے۔ گویا ارادہ کر لیا گیا ہے کہ اب دنیا میں مرد بغیر عورت کے رہینگے اور فطرۃ نے مرد اور عورت کو دو جنس قرار دیے اور اس تفریق کی ضرورت سمجھنے میں ایک سخت غلطی کی تھی جس کی تصحیح سے اب زیادہ غفلت نہیں ہونی چاہئے۔

وہ وقت قریب ہے جب "عورت" کا وجود صرف گزشتہ زمانے کے شعراء کے تخیلات اور عہد قدیم کے صحائف و اوراق سے باہر نہیں ملیگا۔ لوگ آہ سرد بھر کر کہینگے کہ ملٹن نے اپنی نظم میں عورت کے محسوسات بتلائے ہیں۔ یا ڈکنس نے اپنے قصہ میں ایک مشہور عورت کی تصویر کھینچی ہے مگر افسوس اب زمانہ پر عورتوں کا پیدا ہونا موقوف ہو گیا۔

کیا تم اسکو میرا شاعرانہ تخیل کہتے ہو؟ تمہاری دنیا کا ہر باشندہ میری طرح رو سکتا ہے بشرطیکہ وہ

کرو تا اور روزانہ دو گھنٹے لڑکوں کو پڑھاؤں جس کے بدلے ماہانہ دس روپے کتنا عجیب اور دل خوش کن معاوضہ ہے۔
میں نے کہا مجھ سے دو گھنٹے پڑھایا نہ جائے گا اور نہ ہی میں ایک گھنٹے کے لیے راضی ہوں سنیے میں نے کہا میں
تمام مضامین آپ کے لڑکوں کو وقت مقررہ میں پڑھاؤں گا کہ لڑکے انہیں اچھی طرح سمجھ لیں اور وہ اسباق اچھی طرح
پڑھ سکیں۔ کہنے لگے میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ پہلے جس طرح محنت اور انہماک سے پڑھاتے تھے اب وہ کیفیت نہیں
رہی اب بہتر ہے کہ تم ...... وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے میں نے کہا دیکھئے حضرت اگر آپ مجھ سے پڑھوانا نہیں چاہتے
تو نہ پڑھوائیے مگر میری اس محنت کی اس طرح ناقدری تو نہ کیجئے کہنے لگے میں بھی یہی سوچ رہا ہوں میں نے کہا
خدا حافظ

اب پھر بیکار ہوں کٹی ہوئی پتنگ کی سی حالت ہے لیکن ٹیوشن نہیں ملتا۔ فرمائیے کیا ضرورت
ہے آپ کو ایک ٹیوٹر کی میں ایک ٹیوٹر ہوں آپ کے لڑکے کو پڑھاؤں گا۔ راستہ چلتے ہوئے آپ کے شاگرد رشید
کے مکان جاؤں گا اور معاوضہ ...... آپ ہی طے کر دیجئے آخر کچھ معاوضہ .... فقط

رشحات شاکر

پردہ نہ ہو تو چار میں کوئی نظر چرائے کیوں — سامنے کیوں نہ آئے حسن شرم سے منہ چھپائے کیوں
صنعت بت تراش حیف خود ہی بنائے خود بنے — بت جو نہیں بنے ہوئے آدمی بت بنائے کیوں؟
اپنے بھلے برے کی فکر اپنی سمجھ سے کیجئے — اس سے کسی کو کیا غرض اس میں کسی کا کیا گیا کیوں
آپ سے کچھ گلہ نہیں آپ برا نہ مانئے — آپ کی اور بات ہے چرخ ہمیں ستائے کیوں
چھیڑ نہ ہو تو پند گو کس لئے کچھ کہے سنے — اور کہاں سنا معاف کہہ کے یہ پھر سنائے کیوں
ہم کو کسی سے واسطہ ہم سے کسی کو واسطہ — ہم کہیں جائیں کس لئے کوئی ہمیں بلائے کیوں
غم جو نہ ہو تو پھر دیئے غم سے کس لئے — ہم کو خوشی کی کیا خوشی ہم کو خوشی جگائے کیوں
شکوہ بوالہوس فضول اس میں کسی کا کیا گلہ — خود نہ بجھے تو بزم میں کوئی اسے بجھائے کیوں

شاکرہ ذوق بندگی یعنی خوشی کی زندگی
اپنے خدا سے کیوں ڈریں خوفِ خدا ستائے کیوں

ٹیوٹر

جناب سید معین الدین صاحب مغربی

جی ہاں ٹیوٹر جو لڑکوں کو پڑھاتا ہے اور میں ہوں ایک طالب علم ۔ طالب علم ہی تو ہوتے ہیں نا ٹیوٹر ۔ ایک ایسا
طالب علم جس کے والدین اپنے لڑکے کو پڑھانا چاہتے ہیں لیکن پڑھا نہیں سکتے جو خود بھی اپنا درس جاری رکھنا چاہتا ہے
لیکن نہیں رکھ سکتا سوائے اس کے کہ کہیں ٹیوٹر ہو جائے ۔ لڑکوں کو پڑھانے ۔ راستہ ناپتے ہوئے اپنے شاگرد رشید کے
گھر جائے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دماغ سوزی کرے اور اسی طرح یہ عمل ختم ماہ تک اس کا معاوضہ پانچ، سات، دس روپے ہو گئے
ٹیوٹر کی تنخواہیں بھی تو مقرر کر رکھی ہیں مثلاً اگر میٹرک ہو یا میٹرک سے کم تو (۵ تا ۱۰) کا گروہ عنایت ہوتا ہے اگر
ایف اے کامیاب یا بی ۔ اے ہو تو آٹھ یا بیس روپے لیکن اس (۵ تا ۱۰) یا بیس میں ٹیوٹر کو صرف ایک شاگرد سے پالا
نہیں پڑتا بلکہ وہ دو اور تین تین دماغی تفریح کیلئے موجود رہتے ہیں ۔

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف آتا ہے اسی طرح جب کسی شخص کی بدبختی پکارتی ہے تو وہ ٹیوٹر
بنتا ہے لیکن ٹیوٹر بننا بھی کوئی کھیل نہیں ہے سفارش ڈھونڈنی پڑتی ہے سفارش ۔ سفارش ہی پر تو آجکل نوکری کا دارومدار
ہے لیکن کیا کیا جائے کہ بیسویں صدی کا بھی عجیب گل کھلاتی ہے مجھے بھی چند سفارشیں لیجانی پڑیں کیونکہ تعلیم کا سلسلہ رکھنا
تو ضروری تھا نا ۔

ایک دن ہمارے ایک عزیز نے کہا ٹیوشن کرو گے ؟ ہم نے دل میں کہا اندھا کیا چاہے دو آنکھیں تحصیلدار
ہیں ایک لڑکا ہے پڑھا دو ماہانہ پندرہ روپے مل جائیں گے پندرہ روپے میں نے اپنے آپ میں کہا اور تحصیلدار صاحب
کے آستانہ پہ سجدہ ریز تھا ہر روز وقت مقرر کیا ہم نے سفارشی خط [illegible] دیا تقریباً دس منٹ گذر گئے ملازم نے کہا
بیٹھک کے کمرے میں بیٹھا دیا گیا کچھ [illegible] دیکھا چند [illegible] سے تنقیدی نظریں ڈال رہا تھا
بالکل اسی طرح جیسے بارات آتی ہے تو دلہے کو چوری چوری دیکھا جاتا ہے ادھر میں انتظار کر رہا تھا تحصیلدار صاحب
کا ملازم [illegible] گیا تھا ۔

جناب . . . . صاحب

شعر سنانے کا بھی سلیقہ ہونا چاہیئے ۔ بعض وقت شعر اتنا اچھا نہیں ہوتا ۔ لیکن سنانے والے کا سحر
انگیز انداز اسکو خود ایک سحر بنا دیتا ہے ۔ تخیل جھوم جاتا ہے ۔ اور پھر تھوڑی دیر کے لئے ع ہم خود
ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ و[illegible]پائے ہے ۔
حالی نے ایک موقع پر کہا تھا ے

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے　　　کہ زندگانی عبادت ہے تیرے جینے سے

اور پھر حالی نے یہ بھی تو کہا تھا ے

جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　　ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی

کتنا سنگین اور نازک تجربہ ہوا ہے انہیں زندگی کا ۔ کبھی جس زندہ دلی سے انھیں قریب کا تعلق
تھا آج اس کے نہ ہونے سے زندگی زندہ دلی غرض دل کی کوئی بات جیت بھی دوبھر ہو گئی ہے ۔ دل
پر کیا ایسی مصیبت آجاتی ہے نہیں معلوم ۔ سارا کھیل تو یہ دماغ ہی کھیلتا ہے ۔ اسی کے ذہن
میں کوئی بات آتی ہے ۔ سوچنے اور غور کرنے کی آفت بھی اسی کے سر پڑتی ہے ۔ اچھے اور برے
کی تمیز بھی شاید اسی کو ہوتی ہے ۔ پھر یہ دل کی دنیا مفت کیوں بدنام ہو جاتی ہے ۔ کسی کی بات
سے کہتے ہیں "دل دکھتا ہے" ۔ حالانکہ سوچتا اس دکھ کو دماغ ہے اور نام حضرت دل کا ۔ کام
کرے کوئی نام کسی اور کا ہو جائے ۔ ہم ہی صرف ناانصاف نہیں ۔ قدرت خود انصاف نہیں کرتی ۔
ہم پھر بھی دماغ کی اعلیٰ ظرفی کی داد دیتے ہیں ۔ کہ اس کو پھر بھی دل ہی سے ہمدردی ہے ۔ ایک عضو
کو دوسرے عضو سے جتنی ہمدردی ہے اتنی تو ایک انسان کو دوسرے انسان سے نہیں ۔ ہم اٹھتے
بیٹھتے اپنے ملنے والوں کا دل اس آسانی سے توڑتے ہیں جیسے بچے مفت کے کھلونوں پر ہاتھ
صاف کرتے ہیں ۔ شعور رکھتے ہوئے اتنے نکمے ۔ توبہ توبہ ــــ جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد ۔
ہاں تو کبھی کسی حکیم نے کہہ دیا تھا ۔ بیاہی زندگی پھولوں کی سیج بھی ہے اور کانٹوں کا چھپر کھٹ
بھی ہے کہنے کو تو وہ کہہ گیا ہے ۔ اور اس کا یہ فقرہ میرے دماغ میں ابتک محفوظ ہے ۔ بھولنا
بھی چاہوں تو شاید بھلا نہ سکوں ۔ جس کو دیکھا اسی زاویہ سے دیکھا ۔ کسی نے کہہ دیا تمہاری
فلاں سہیلی کی شادی ہو رہی ہے ۔ بس سمند تخیل اس فقرہ کا ہمرکاب بنکر چلا اسکی بارات کے
پیچھے پیچھے ۔ شادی میں شریک بھی نہ ہو سکوں تو کیا ۔ خیال کی دنیا سے مجھے کوئی روک سکتا ہے ؟ ۔
تخیل ہی تو میرا سب کچھ ہے ۔ عمل کی حد تک بالکل صفر ہوں ۔ دل میں جتنی باتیں ہوتی ہیں ۔
دماغ میں جتنے خیالات گھومتے رقص کرتے ہیں ۔ زبان ان میں سے ایک کی بھی تو صحیح معنوں میں ترجمان

۲۲۔ زینت سلطانہ۔ کافی عرصہ تک شہاب میں لکھا گیا انکی تحریروں میں حباب کا عکس نمایاں رہتا ہے ایک عرصہ کے بعد پھر اپنے قلم کو جنبش دی ہے۔

۲۳۔ نکہت نسرین۔ کبھی کبھار صدائے بازگشت کے طور پر انکی آواز آتی ہے اگر مشق جاری رکھیں تو کامیاب ہونگی۔

۲۴۔ نجمہ نجمی۔ یہ شہاب میں بھولے بسرے لکھتی ہیں اگر یہ سلسلہ جاری رکھیں تو مناسب ہوگا۔

۲۵۔ آمنہ لیئق۔ ان کا فسانہ (دھندلے نقوش) نہایت نمایاں رہا تحریر میں دلکشی ہے کہیں ایسا تو [illegible] جذبہ نگارش سرد پڑ گیا ہو۔

۲۶۔ رقیہ عبدالحمید۔ کی پہلی کوشش (کایا پلٹ) دلکش ضرور ہے وہ اس سلسلہ کو نہ چھوڑیں۔

۲۷۔ سعیدہ انصاری۔ ان کی اولین سعی (رکشہ والا) فسانہ نہایت کامیاب رہا دوسرا مضمون (ادھورے سپنے) بتا رہا ہے کہ انہیں ابھرنے اور ترقی کرنے کا مادہ ہے۔ وہ اپنی مشق جاری رکھیں مستقبل کامیابی کا مژدہ سنا رہا ہے۔

۲۸۔ اقبال۔ کا فسانہ (آسیبی گھر) اچھا ہے ترقی مقصود ہے تو اس شغلہ کو ترک نہ کریں اپنی تعلیمی مشاغل کے بعد۔

۲۹۔ رقیہ۔ کا افسانہ (آسیب زدہ گھر) دلکش ضرور ہے۔ فرصت کے اوقات میں اس جانب توجہ کریں۔

۳۰۔ نفیس جہاں۔ کچھ عرصہ سے یہ بھی لکھنے کی جانب مائل ہیں اور اکثر لکھتی ہیں۔

۳۱۔ نورجہاں۔ یہ ایک عرصہ سے لکھتی ہیں ان کے افسانے بیرونی رسائل میں بھی نظر سے گزرے ہیں افسانے کافی طویل اور دلچسپ ہوتے ہیں مکتوبات جمیل لکھنے کا بھی اچھا سلیقہ ہے ایک عرصہ سے خاموش ہیں۔

۳۲۔ نجمہ سمیع اللہ شاہ۔ انہیں ابتدائی سے مضامین نگاری کا شوق رہا رفتہ رفتہ تحریر میں پختگی پیدا ہوتی گئی ایک عرصہ سے شہاب میں لکھنا ترک کردیا ہے حالانکہ بعض سے ابتدا ہوئی تھی اب دوسرے رسائل میں ان کے افکارات نظر سے گذرتے ہیں۔

۳۳۔ ثریا جبین بیگم سلیم۔ ایم۔ اے۔ انہوں نے زیر تعلیم ہی سے مضامین نگاری شروع کی اور کافی عرصہ تک مختلف رسائل میں انکے مضامین کا سلسلہ جاری رہا جب اردو ادبی [illegible] نگاری کا شغلہ ترک کردیا لیکن یہ ایک مفید کام کیا ہے۔ غالب [illegible] اور کافی مقبولیت حاصل کر رہا ہے اسکول کا نصاب موجودہ زمانہ کو مدنظر رکھکر ترتیب [illegible]

نوابین اکثر ان کا پروگرام رہتا ہے ۔

۱۱- سیدہ مہر - ان کے دو ایک افسانے شہاب میں شائع ہوئے ہیں اچھا لکھتی ہیں آئندہ بھی سلسلہ جاری رکھیں۔

۱۲ صغریٰ سلطانہ - یہہ ابتدا ہی سے شہاب کی مضمون نگار رہیں سماج اور اسکی اصلاح گھریلو زندگی پر اچھے مضامین لکھے ہیں شہرت اور ہماہمی سے نفرت ہے خاموش کام کرنے کی عادی ہیں ایسے مضامین کی طبقہ نسواں کو ضرورت بھی ہے ۔

۱۳- وحیدہ نسیم - ان کے مضامین کی ابتدا اسوقت سے ہوئی جبکہ یہہ اورنگ آباد ہائی اسکول میں زیر تعلیم تہیں نظم و نثر دونوں سے لگاؤ ہے مگر طبیعت نظم کی طرف زیادہ راغب ہے آجکل تو یہہ زیادہ تر میزان کو اپنا جولان گاہ بنائی ہیں

۱۴- آصف جہاں بلگرامی - چار ایک سال تک انکے مزاح نگاری کی دہوم رہی ہر سال تہذیب نسواں لاہور سے درجہ اول کے انعام کی مستحق قرار پائیں پہر شہاب میں بھی طبع آزمائی کی انکے مضامین کا مجموعہ (گل خنداں) کافی مقبول ہوا جب سے شادی ہوئی گزاویہ کو جادیہ بنائے بیٹھی ہیں خواتین میں مزاح نگار بہت کم ہیں کاش انکا شوق جاری رہتا ۔

۱۵- ساجدہ احمد محی الدین - یہہ شہاب میں لکھتی ہیں جو کچھ لکھتی ہیں انکی تحریروں میں ہمدردی اور نصیحت کی جہلک رہتی ہے انکا قلم مذموم پیش پا افتادہ فسانوں کی جانب کبھی متوجہ نہیں ہوا ۔

۱۶- مسز عظمت عبدالقیوم خاں - شادی کے بعد انہیں مضامین نگاری کا شوق ہوا کچھ عرصہ تک شہاب میں لکھتی رہیں آجکل خاموش ہیں کبھی کبھی نشرگاہ سے آواز سنائی دیتی ہے ۔

۱۷- شاہین - مزاحیہ رنگ میں یہہ کامیاب لکھتی رہیں اور نہایت شوق سے انکے مضامین پڑہے جاتے تھے شہرت اور کامیابی کے موقع پر افسوس ہے کہ لکھنا چہوڑ دیا - شادی نے انکو بھی اس ذوق سے باز رکھا۔

۱۸- اقبال مہر - نہایت سنجیدہ مضامین لکھا کیں مگر شادی نے انکو اس دنیا سے علیحدہ کر دیا۔

۱۹- معصومہ جنگ بہادر - دو ایک سال تک مزاحیہ رنگ میں گھریلو زندگی پر اپنے مضامین سے گرویدہ بنا لیا تھا لیکن ان کے ذوق کو بھی شادی نے سرد کر دیا

۲۰- صغرا جنگ بہادر - یہہ بھی مزاحیہ رنگ میں لکھتی رہیں مگر آجکل انکی خاموشی کیوں ہے معلوم نہ ہو سکا۔

۲۱- خدیجہ محمد یونس - انکا ادبی ذوق نہایت اچھا تھا ایک زمانہ تک شہاب میں لکھتی رہیں۔ انہیں ترقی کرنیکا اچھا سلیقہ تھا لیکن شادی نے ان کی فطری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا- آجکل یہہ ادبی دنیا سے بالکل دور ہیں ۔

کوئل

کس کی تلاش میں ہے یہ کس کی جستجو ہے
للہ کچھ بتا نا کیا تیری آرزو ہے

نغمہ ہے تیرا دلکش صورت ہے بھولی بھالی
قدرت کے گلستاں میں پھرتی ہے ڈالی ڈالی

کیوں سوز و ساز اتنا دل میں بھرا ہوا ہے
تو درد کی دوا ہے یا درد لا دوا ہے

ہے کوک تیری ایسی لگتی ہے چوٹ دل پر
آنسو مرے رواں ہیں حالت یہ تیری اکثر

تو ڈھونڈھتی ہے جس کو اس کا پتہ بھی پایا
تیرے پیام کا کیا تجھ کو جواب آیا

کچھ مجھ کو بھی سنا دے اپنی ذرا کہانی
مشتاق ہوں میں اس کا سن لوں تیری زبانی

آ۔ راز میں بتا دوں اپنے دل حزیں کا
اک بیوفا نے مجھ کو رکھا نہیں کہیں کا

تیری طرح سے میں بھی سرگشتہ ہوں جہاں میں
باقی نہیں رہا ہے کچھ بھی اثر فغاں میں

تو رستگار غم ہے میں قیدی ستم ہوں
وارفتہ تو ہے بے شک میں مورد الم ہوں

چل۔ آج مل کے دونوں ڈھونڈیں کوئی ٹھکانا
اس کشمکش سے چھوٹیں گاتے رہیں ترانہ

نغموں سے قلب محزوں تیرے سکون پائے
نالوں سے میرے کوئل تجھ کو قرار آئے

(بسمل)

تو تمہاری محبت میں اب مر جاؤنگا
بھی تو تمہاری یاد میں

زبیدہ - اتنی مایوسی تو تمہیں - زیبا نہیں
دیتی -

منوچہر - جس کی امیدیں لٹ جائیں -
جس کی تمنائیں مٹ جائیں وہ زندہ
رہکر کیا کرے -

زبیدہ - مری محبت کو بھول جاؤ -
دل بہل جائیگا کہیں نہ کہیں -

منوچہر - جی ہاں بہل چکا -

بہل رہے ہیں اپنی طبیعت تو ان نصیب
دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا -

زبیدہ - کیسی باتیں کرتے ہیں آپ !

منوچہر - جو باتیں کرتا تھیں کر لیں - اب تو
جیتے جی تم سے ملنے کی توقع ہی جاتی
رہی - خاک ایسی زندگی پہ تم
کہیں اور ہم کہیں ،،

(جرس کی آواز آتی ہے فردوسی
منوچہر زبیدہ سے مخاطب
ہوتا ہے)

فردوسی - منوچہر ——— خدا حافظ

منوچہر ——— فی امان اللہ

قافلہ روانہ ہوتا ہے منوچہر کی آنکھوں
سے آنسو ٹپکتے ہیں زبیدہ مغموم سر
جھکا لیتی ہے منوچہر آپنے آپ
گاتا ہے -

بار فتیم و تو دانی و دل غم خورما
بخت بد تا بہ کجا می برد آبشخورما
فلک آوارہ بہر سو کندم می دانی
رشک می آیدش از صحبت جان پرورما
دردمندیم خبری وہمازسوندورما
دہن خشک - لب تشنہ چشم ترما
روز باید کہ بیاید بسلامت یارم
اے خوش آن روز کہ آید بسلامت برما

پانچوں منظر

قافلہ گذر رہا ہے اور دور سے نغمہ کی آواز آتی ہے
سکھ دیس کو چل ہاں دیر نہ کر - چل چھوڑ چلیں یہ پھوٹ نگر
رکھ تیز قدم بجتا ہے گجر - ہے کتنا مبارک اپنا سفر
جس دیس میں آنی راج نہیں -

اوس دیس میں چل سنسار کریں
واں گردش صبح و شام نہیں
واں خزن نہیں آلام نہیں ،،
آغاز نہیں انجام نہیں ،،
انسان جہاں ناکام نہیں
آنند ہی ہو آرام ہی ہو
اس دیس میں چل سنسار کریں . (باقی آئندہ)

شہاب تمہید کے چند شعر سماعت فرمائیے
کہ این نامہ را دست پیش آورم
ز دفتر بگفتار خویش آورم ،،
زمانہ سراسر پر از جنگ بود
بجویندگان بر جہان تنگ بود
برین گونہ یک چند بگذاشتم
سخن را نہفتہ ہمی داشتم ،،
بو شہم من این نامہ پہلوے
بہ پیش تو آرم گر نغنوی ،،

تاجر جزاک اللہ — چہ ا کس قدر
بلیغ اور کتنے فصیح اشعار ہیں
فردوسی — بندہ نوازی — عزت افزائی —
تاجر — جو وقت آپکی صحبت میں کٹتا ہے
وہ ہماری زندگیوں کا بہترین
حصہ ہے — ہاں تو یہ طے شدہ
بات ہے تاکہ آپ غزنی تشریف
لے چلیں گے —
فردوسی — ذرا غور کر لوں —
تاجر — آپ تامل نہ کیجئے — ممکن ہے کہ
دوبارہ حاضر ہونے کے لئے وقت
نہ ملے — کیونکہ ہمارا کام ختم ہو
چکا ہے — ہفتہ عشرہ میں کوچ ہے
فردوسی — خدا کا فضل اور آپ کی تائید
ہو تو —
تاجر — آپ اطمینان رکھیں — سفر کی منزلیں
نہایت آرام سے طے ہونگی —
فردوسی — انشاء اللہ —
(دونوں رخصت ہوتے ہیں فردوسی
مشایعت کے لئے دروازہ تک جاتا ہے)

چوتھا منظر

(شہر کی فصیل — قافلہ آمادہ سفر ہے
فردوسی — منوچہر — اور زبیدہ کے
ساتھ آتا ہے)
منوچہر — آہ زبیدہ آخر تم باز نہ آئیں —
مجھے تنہا تقدیر پر چھوڑ ہی دیا —
زبیدہ — بتائیے تا کہ میں کر ہی کیا سکتی ہوں
منوچہر — تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے
زبیدہ — یعنی ؟
منوچہر — اپنا ارادہ بدل دو —
زبیدہ — خوب ! اس عالم غربت میں
بھائی جان کو تنہا چھوڑ دوں جبکہ
انہیں — میری سخت ضرورت
منوچہر — دونوں میں سے کسی ایک کو چھو[ڑ]
نا ہی پڑیگا —
زبیدہ — میں نے آپ کو چھوڑا چاہے
میرے دل پر جیسی گذر جائے
منوچہر — زبیدہ جب تم نے مجھے چھوڑ دیا
تو اب جینے کی ہوس نہیں — زندہ [illegible]

تاجر - اظہار حقیقت شرمندگی کا مترادف
ہے تو ہمیں ایسی شرمندگی پر مسرت
ہوتی ہے -
فردوسی - ہاں کچھ سنائیے - امور سلطنۃ کا
کیا حال ہے
تاجر - نہ پوچھیئے کہ کس عیش میں لیل و نہار
کٹتے ہیں - یمین الملت یمین الدولہ شہنشاہ
محمود آج دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے -
باوجود دولت اور قوت کے یہہ
اولوالعزم فاتح نہایت سادہ اور نیک
مزاج ہے - جسکے سلطنۃ کے حدود اربعہ
پنجاب سے لیکر بلخ و عراق تک
پہنچ گئے ہیں - زندہ دلی اور خلق -
اخلاق و شائستگی تو اسکے فطری عنصر
ہیں - صاحب کمال کی قدردانی -
مظلوموں کی حمایت عاجزوں کی
دستگیری اسکے دربار کی نمایاں امتیازات
ہیں - نظر کیمیا اثر خاک کو اکسیر -
خذف کو الماس بنا دے - جسکے
دربار میں علا فضلا کا ایک میلا لگا
رہتا ہے - بادشاہ سلامت خود
شرکت فرماتے ہیں - حوصلہ بڑھا
تے ہیں - جہاں تلوار و قلم ایک ساتھ
پرورش پاتے ہیں - عدل و انصاف
کی آوازیں ہندوستان کی وادیوں

میں گونج رہی ہیں - اقطار عالم سے
علوم و فنون کے ماہر پروانہ وار
اس شمع پر نثار ہو رہے ہیں -
فردوسی - چشم بد دور جو سنا تھا آج اوس پر
ایمان لانا پڑا - جی چاہتا ہے زندگی
میں ایک مرتبہ غزنی اور اوس کے
شہنشاہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں
مگر کہاں!
تاجر - پھر کون امر مانع ہے؟
فردوسی - اتنا طویل سفر - زاد راہ کے لئے
سرمایہ کا طالب ہے -
تاجر - ارادہ کیجیئے تو مشکلیں آسان ہو
جائینگی - آپ کے بلند ارادوں کا
ہمیں علم ہوا ہے اوسکے لئے تو دربار
غزنوی ہی ایک اچھی کسوٹی ثابت
ہوگا - (قدر گوہر شاہ داند)
کیا عجب کہ بخت کی رسائی آپ کو
اس دربار کا ملک الشعرا بنا دے -
فردوسی - لیکن قسمت نے تو ہمیشہ میرے
ساتھ مخالفت ہی کی ہے -
تاجر - ہمت بلند ہو تو قسمت بھی ساتھ
دینے کے لئے تیار ہے -
فردوسی ہمت ہی کے بھروسہ اس اہم
کام کی ابتدا کی ہے (چند اوراق
دکھا کر) حمد و نعت سے گریز کرکے

زر خیزیوں، علم و فضل، صنعت و حرفت
پر جسکی آغوش میں سنگریزوں سے لیکر
جواہر تک پرورش پاتے ہیں ۔
زبیدہ ۔ کاروبار سلطنت کا کیا حال ہے ۔
تاجر ۔ مہام سلطنت ایک ایسے عادل اور
منصف بادشاہ کے ہاتھ ہے جہاں شیر
اور بکری شیر و شکر ہیں داد و دہش بخشش
و کرم کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک شعر پر
شعرا کا منہ موتیوں سے بھرا گیا ہے ۔
ایک ایک قصیدہ پر سیم و زر سے شاعر
کو تولا گیا ہے ۔
زبیدہ ۔ کبھی غریب خانہ تک تشریف لائے ۔
میرے بھائی سے ملیئے ۔ بہت کچھ باتیں
ہو سکیں گی ۔
تاجر ۔ ضرور، مگر وہ کرتے کیا ہیں ؟
زبیدہ انہیں شعر و شاعری کا ذوق ہے آج
سرزمین ایران کو اون پر ناز ہے ۔
تاجر ۔ ضرور شرف نیاز حاصل کرنا چاہیے
زبیدہ ۔ ارادہ فرمایئے نا !
(زبیدہ کا تخیل وہ فردوسی کو دربار غزنوی
میں پیش ہوتا ہوا دیکھتی ہے)

تیسرا منظر

(فردوسی کا مکان ۔ کتابیں اور کاغذات پریشان ہیں)
فردوسی ۔ (کاغذ سے نظر اوٹھا کر) الحمد للہ
حرکت میں برکت بالکل سچ ہے جسکی منزل
کا آغاز اتنا خوشگوار ہو انشاء اللہ
اسکی تکمیل بھی شاندار ہوگی (کچھ سوچکر)
البتہ آنکھیں کسی تائید شاہانہ کی جویا ہیں ۔
(زبیدہ تاجروں کو لیکر آتی ہے فردوسی
تعظیماً کھڑا ہو جاتا ہے)
زبیدہ ۔ بھائی جان آپ تو افغانستان اور ہندوستان
کے قافلوں کی آمد کا حال سن ہی چکے ہیں
(اشارہ کرکے) آپ ہندوستان کے
نمائندہ ہیں اور آپ افغانستان ۔ ایران
کے عجائب خانوں میں اپنی مصنوعات کا
مظاہرہ فرما رہے ہیں ۔
فردوسی ۔ تشریف رکھیئے ۔ کلبۂ تاریک کی رونق
بڑھایئے
تاجر ۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں ۔ ذروں کو
آفتاب سے ٹکراتے ہیں ۔ (دونوں
تاجر بیٹھ جاتے ہیں)
فردوسی ۔ ندامت ہے کہ فرائض مہمانی مجھسے
ادا نہ ہو سکیں گے کہ ایک بوریہ نشین
کیا سوغات پیش کرے ۔
تاجر ۔ ہمارے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ
آپ جیسی ہستی سے شرف نیاز حاصل ہوا ۔
فردوسی ۔ شرمندہ نہ کیجیئے ۔

شہاب

زبیدہ - خیال نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہے
اسلئے موجودہ مسئلہ کے حل کو کسی موزوں
وقت کے لئے اوٹھا رکھنا مناسب ہے —
تاوقتیکہ بھائی جان کو اس بن میں اطمینان
کی ساعتیں میسر نہو جائیں مجھے ایک لمحہ کیلئے
بھی اون سے جدائی منظور نہیں —

منوچہر - کیا مجھے مایوس ہو جانا چاہیے۔

زبیدہ - مایوسی کیوں - خدا سے آس
لگائے رکھو - مگر میں تو اپنا فرض اولین
یہی سمجھتی ہوں کہ زندگی کا ہر لحظہ بھائی
جان کی خدمت اور محبت میں صرف
کردوں - اور اونکی برادرانہ شفقت
کا بوجھ اپنی خدمت گذاریوں سے
کچھ تو ہلکا کر سکوں! آہ بھائی

(فردوسی داخل ہوتا ہے)

فردوسی - (زبیدہ سے مخاطب ہوکر) کیا
باتیں ہو رہی ہیں ؟

زبیدہ - کچھ نہیں زندگی کی کٹھن گھڑیوں
کا سوال درپیش ہے —

فردوسی - آؤ میں تم دونوں کو ایک مژدہ سناؤں
مصیبت کے دن بیت گئے پریشانیوں
کے بادل برس چکے - اب تو خورشید
تمنا طلوع ہونے والا ہے (دونوں
پاس جاتے ہیں)

زبیدہ - فرمائیے !

فردوسی - (پیار سے زبیدہ کے سر پر ہاتھ
پھیر کر) میں ایک عرصہ سے محسوس کر رہا
ہوں کہ طوس کے دریا پر ایک پل بنا دوں
تو کیسا ہوگا - موسم بارش میں اون قافلوں
اور کاروانوں کو کس قدر آرام ملیگا جو
کنارے پڑے ہوئے دریا کو دیکھا کرتے ہیں

زبیدہ - تجویز تو ٹھیک ہے مگر انصرام کے لئے بڑی ضرورت
تو زر ہی بابا کی ہے اور وہی خوش
نصیبی سے ہم سے گریزاں ہے

فردوسی - اس کا بہترین حل میں نے ڈھونڈ لیا
ہے اب تو پختہ ارادہ ہے کہ اپنے
جیتے جی ان آنکھوں سے کاروانوں
کو دریا سے گذرتا ہوا دیکھ لوں -
منوچہر ایک ہوشیار مہندس
(انجینئر) ہے اسکی مستعدی سے
کام چل جائیگا - میری اولین اور
آخری تمنا بھی پوری ہو جائیگی —
اور سفینۂ تاریخ میں میرے نام کے
ساتھ ساتھ اس کا نام بھی چمکتا رہیگا -

زبیدہ - یہ سب تسلیم - مگر "زر"

فردوسی - زر - زر - یہ کوئی دشوار
گذار مرحلہ نہیں —

زبیدہ - (ہنستے ہوئے) بھائی جان آپکی
حالت تو اوس بڑھیا کی سی ہے
جو ایک رسی کے بل پر یوسف کی

ہے وجہ امتیاز مری عشق بازیاں — کیا کیا ہوئیں نصیب مجھے سرفرازیاں
مدت سے آشیاں ہے مرا نیم سوختہ — اے برق کیا ہوئیں تری خرمن نوازیاں
کچھ تو علاج قلب حزیں اے وفور درد — مشہور ہیں جہاں میں تری چارہ سازیاں
میں جوش بےخودی میں دکھاؤنگا ایک دن — برق نگاہ شوق کی حیرت نوازیاں
عنواں کہ ہے حصول مقاصد میں دیر کیا — اے بے نیاز تا بہ کی بے نیازیاں

خداوندا - آرزوئیں جب ناکامیوں کے لئے ہیں
تو پھر آرزوئیں پیدا ہی کیوں ہوتی ہیں -
زبیدہ - (برآمدہ سے نیچے دیکھکر) منوچہر!
منوچہر - (اوپر دیکھکر) زبیدہ
زبیدہ - آؤنا -
(منوچہر اوپر برآمدہ میں آتا ہے)
زبیدہ - کیسا مزاج ہے ؟
منوچہر - کچھ نہ پوچھو -
زبیدہ - کچھ تو کہو -
منوچہر - آخر یہ بے کیف دن کب تک کاٹیں -
جسمیں نہ کوئی رنگینی ہے اور نہ فرحت -
زبیدہ - اگر آپ اکتا ہی گئے ہیں تو چلئے -
گلگشت کریں چشموں میں نہائیں - مرغزاروں کی سیریں کریں
منوچہر - میرا مقصد یہ نہیں ہے -
زبیدہ - پھر آپ چاہتے کیا ہیں ؟
منوچہر - (کچھ سوچکر) میں چاہتا کیا ہوں -
زبیدہ - بتائیے نا ؟
منوچہر - آہ ! میں جو چاہتا ہوں شاید تم نہ چاہو
زبیدہ - خوب ! کہنے سے پہلے جب آپنے
فیصلہ کر لیا ہے تو پھر اس کا نہ کہنا ہی بہتر ہے

منوچہر - بے کہے رہا بھی تو نہیں جاتا -
زبیدہ - آخر کہہ بھی ڈالئے کہ خلش تو دور ہو
جائیگی -
منوچہر - ہاں تو میں (کچھ سوچکر) میں یہ
چاہتا ہوں کہ جو شیریں رشتہ ہے اوسکو عقد
کی گرہ سے شیریں تر بنائیں - زندگی کی دشوار
گذار منزلوں کو باہمی تقسیم سے آسان کریں اور
ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں -
زبیدہ - تو اس سے ہوگا کیا ؟
منوچہر - ہوگا کیا ؟ یہی کہ جو مودت اور محبت
دلوں میں پرورش پا رہی ہے اضافہ ہوگا -
عیش کی ساعتیں مکمل ہونگی -
زبیدہ - ہے تو ٹھیک لیکن بھائی جان جو تنہا
رہ جائینگے !
منوچہر - وہ اب بھی ہیں تب بھی ہمارے
ساتھ رہ سکتے ہیں -
زبیدہ - مگر غور بھی کیا اس مسئلہ پر کہ جب
میری محبت کسی اور جانب منتقل ہو جائیگی
تو پھر بتائیے بھائی جان کا تو اللہ بیلی ہی ہے -
منوچہر - یہ تمہارا خیال ہے -

غزل

جناب محشر

میری منزل جستجوئے جادۂ منزل میں ہے
لطف حاصل ہے مجھے اک سعیٔ لاحاصل میں ہے

بڑھ رہا ہے تلاطم خیز و ناپیدا کنار
مستقل سا اک تفاوت کشتی و ساحل میں ہے

خون دل پھر رنگ لایا ہے باندازِ دگر
پھر نظر زو تڑپ پیدا آسرے نسیں میں ہے

بیٹھے بیٹھے مینا ہے اور منتظر میخوار ہیں
ساقیا بس ایک تیری ہی کمی محفل میں ہے

قیس ہی ہیں اب وہ لیلیٰ سی نہیں وارفتگی
ورنہ اب بھی لیلیٰ پنہاں پردۂ محمل میں ہے

شمع کو معلوم ہوگا صبحدم انجام کار
سرخیٔ بازی کا جو پروانے کا سودا دل میں ہے

میں سمجھتے ہی رہیں مضمر ہے ہر دم راز حیات
کیا ہوا گر آج پھر خنجر کف قاتل میں ہے

کربلا والوں کی قربانی سے ثابت ہو گیا
وہ جو اک طاقت متاع جذبۂ کامل میں ہے

پوچھتے ہیں ہم شب معراج کے راز و نیاز
کون مصروف تکلم پردۂ حائل میں ہے

ایسا اللہ سے رقابت ہو گئی محشر تجھے
صاحب معراج کی تصویر تیرے دل میں ہے

چنانچہ ۱۸۹۸ء میں جرمنی نے شمالی چین کی ایک بندرگاہ کیاؤچاؤ پر قبضہ کر لیا۔ معاہدہ ۹۹ سال رہن کا ہوا تھا مگر اسی سال جرمنی نے اسکو نوآبادی قرار دے دیا۔ انگریز کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔ دوسرے ہی سال انہوں نے اس کے شمال میں ایک بندرگاہ وی ہائی وائی [illegible] پر اپنا قبضہ کر لیا۔

چین پر یورش کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ یورپ کی تجارت میں افیون بے حد مفید اور اہم ثابت ہوئے۔ انگریزوں کو ہندوستان سے افیون کافی مقدار میں مل سکتی تھی اس لئے نظر چین پر گئی۔ پہلے تو خفیہ طور پر وہاں سے افیون لیجاتے تھے مگر حکومت چین نے سختی کی۔ جب اس کی روک تھام شروع کی تو انگلستان نے اپنی فوج جزائر [illegible] کی مدد سے [illegible] بھیجا۔ چونکہ چین کی فوجی قوت کمزور تھی۔ مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ مجبوراً صلح کرنی پڑی۔ ۱۸۴۲ء میں انگریزوں نے ہانگ کانگ پر قبضہ جما لیا۔ اب انگریزوں کو معلوم ہو گیا کہ چین بہت کمزور ملک ہے۔ اس حقیقت سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ رفتہ رفتہ اور بھی مقامات اپنے زیر اثر کر لئے۔ تبلیغ مذہب کے بہانہ سے پادریوں نے چین میں بسنا شروع کیا۔ فرانس نے بھی پادری بھیجے۔ اس سلسلہ میں تعلقات غیر خوشگوار پیدا ہو گئے۔ روس نے پورٹ آرتھر پر قبضہ کر لیا۔ (باقی آئندہ)

[illegible] یہ دنیا جو نفع و سود کی ایک زراعت گاہ ہے۔ کیا اس کا [illegible] نقصان و زیاں کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

کتنی پامالیاں ہیں جو شادابیوں کا باعث ہوتی ہیں؟ کتنی ٹھوکریں ہیں جو استقامت کا سبق دیتی ہیں؟

کتنی ناکامیاں ہیں جو کامرانی کا پیام لاتی ہیں؟ کتنی مایوسیاں ہیں جنکی تاریکی سے امید طلوع ہوتی ہے اور پھر کتنے جانسوز شعلے ہیں جنکی جلائی ہوئی راکھ سے نشوونما کی ابدی زندگی پیدا ہوتی ہیں اور اس دنیائے شہادت زار و فنا آباد میں کتنی تعمیریں ہیں جو تخریب کی [illegible] کی چھپی اختیار کی بے چینیاں اور موت و ہلاکت کے خون کی روانیاں ہیں جو اسی میں طاری ہوتی۔ مگر اقوام کے لئے زندگی اور سلامتی کا آب حیات [illegible] ہے؟

ہو گئی اور فرانس کیساتھ رقابت کا آغاز ہوا۔ ایک اور لڑائی اسی توازن قوت کے سلسلہ میں مصر
ہوئی۔ روس اور بلقان کی ریاستوں نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ انگلستان کا بحری بیڑہ ترکی کو
مدد دینے کیلئے باسفورس میں داخل ہوا۔ آخر کار ۱۸۷۸ء میں برلن کی صلح کے ذریعہ اس کا
خاتمہ اس طرح ہوا کہ تھریس اور مقدونیہ پر ترکی کا اقتدار تسلیم کر لیا گیا۔ اسکے بعد ۱۹۰۴ء
میں روس اور جاپان کے درمیان جنگ ہوئی۔ مشرقی قوم مغربی قوم پر غالب آئی۔ روس کو بری
طرح شکست ہوئی۔ مغربی اقوام کی آنکھیں کھل گئیں۔

انیسویں صدی کے ختم تک تمام افریقہ گورے رنگ کی اقوام کے درمیان تقسیم ہو چکا
تھا۔ سیاہ فام رعایا غلام بن گئی تھی اپنے مفاد کی خاطر یورپ نے ان غریبوں کو خوب دگیدا۔
ساری دولت یورپ چلی گئی۔ رعایا کو دیکھو تو مفلس اور مصیبت زدہ۔ یورپ کی کوئی حکومت
نیک نیت ثابت نہیں ہوئی۔

مصر کی داستان طویل اور دردناک ہے مختصر یہ کہ ۱۸۸۲ء میں انگریزوں نے وہاں اپنا
اثر قائم کر لیا حالانکہ یہ ملک ترکی کے زیر اقتدار تھا۔ انگریزوں کی اس مداخلت کی وجہ سے فرانس
کیساتھ اسکے تعلقات کچھ عرصہ کے لئے کشیدہ ہو گئے مگر بعد کو تقسیم کے ذریعہ صلح ہو گئی۔ افریقہ
کا بڑا حصہ انگلستان اور فرانس نے تھیا لیا۔ صرف مراکش کی آزاد سلطنت باقی رہ گئی تھی مگر
فرانس نے بیسویں صدی کے آغاز میں اس کو بھی نہ چھوڑا۔ سلطان کی حکومت برائے نام
رہ گئی۔ اسی زمانہ میں سب کی دیکھا دیکھی اٹلی نے بھی پاؤں نکالے۔ ترکی سے جنگ کا بہانہ
تلاش کر کے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے اٹلی کو خوش کرنے کیلئے ترکوں کو مصر کے
راستہ سے فوج بھیجنے کی اجازت نہ دی۔ بہرحال ایک مکمل سازش کے تحت تمام افریقہ
یورپ کے زیر اقتدار آ گیا۔ ترکی پر ایک دوسری مصیبت بلقان کی ریاستوں نے نازل
کی۔ اس میں یونان بھی شریک تھا۔ سب نے شریک ہو کر ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔
کچھ عرصہ کی لڑائی کے بعد صلح تو ہو گئی مگر ترکی کا بڑا علاقہ ہاتھ سے جاتا رہا۔

یہ رویہ اور تو یورپ اور افریقہ کی تھی۔ ایسا ہی کچھ حال مشرق بعید کا بھی سمجھئے۔ یورپین
اقوام نے چین و جاپان کو بھی نہ چھوڑا۔ انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں اسٹیم
سے چلنے والے سمندری جہاز چلنے شروع ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ اس قدر ترقی ہوئی کہ دور دراز کا
سفر آسانی کیساتھ طے ہونے لگا۔ اس ایجاد سے مغربی اقوام نے فتوحات میں خوب کام لیا۔

جنوبی افریقہ نے سونا پیش کیا ۔ لطف یہ کہ تمام مال ایک دوسری شکل میں زیادہ تر انہی ممالک نے خریدا
جنہوں نے دیا تھا ۔ تجارت کے اسی گُر نے یورپ کو دولت سے مالا مال کر دیا ۔

سب سے زیادہ فائدہ نو آبادیات سے انگلستان نے اٹھایا ۔ دوسرے نمبر پر فرانس اور تیسرے
پر جرمنی رہا ۔ یہ ناممکن تھا کہ ملک گیری کی یہ بے پناہ ہوس رنگ لائے بغیر رہ جاتی ۔ سیاسیات
کی کشمکش نے ایک نیا سوال توازن قوت کا پیدا کر دیا ۔ اس دنگل کے چار جید پہلوان انگلستان ۔
فرانس ۔ جرمنی اور روس تھے ۔ اٹلی اور آسٹریا ہنگری کا شمار انکے پٹھوں میں تھا ۔ ترکی غریب کو یورپ
کا مریض ناتواں قرار دیا گیا ۔ صوبہ بلقان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں [illegible] کے بکروں کا کام دینے لگیں ۔
[illegible] کے لئے خونخوار کتوں کے سامنے دو ہڈیاں تھیں ۔ ایک بحر احمر کا جس کے ذریعہ مشرق کو سمندری راستہ
تھا ۔ دوسری ہڈی صوبہ بلقان اور ترکی تھا ۔ بالخصوص استنبول کا شہر روس اور جرمنی کے لئے بہت
اہم تھا ۔ مشرق کے لئے بلقان سے بہتر کوئی خشکی کا راستہ معلوم نہ ہو سکا ۔

توازن قوت کی پالیسی کا سب سے پہلا نتیجہ جنگ کریمیا کی صورت میں ظہور پذیر ہوا ۔
روس نے بحر احمر پر اثر قائم کرنے کی خاطر ترکی پر حملہ کر دیا ۔ انگلستان اور فرانس اپنی اغراض کے مدنظر
ترکی کے دوست ہو گئے ۔ دونوں نے ترکی کو فوجی امداد پہنچائی ۔ روس کو ایسی شکست ہوئی کہ کچھ
عرصہ کے لئے استنبول کا خیال چھوڑنا پڑا ۔

اٹلی کا نظام منتشر حالت میں تھا ۔ ۱۸۶۱ء میں متحدہ حکومت قائم ہوئی اور وکٹر ایمونیل پہلا
بادشاہ منتخب ہوا ۔ توازن قوت کی خاطر ایک زبردست جنگ ۱۸۷۰ء میں ہوئی ۔ فرانس
کا بادشاہ نپولین سوم چاہتا تھا کہ جرمنی کے علاقہ پر قبضہ کر کے فرانس کی سرحد کی توسیع کرے
اس زمانہ میں جرمنی کی حکومت منظم نہ تھی ۔ چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں انہی کو جرمنی کہا
جاتا تھا ۔ سلطنت پرشیا کی نظر بھی جرمنی پر تھی ۔ اس وقت پرشیا کا وزیر اعظم ایک غیر معمولی
مدبر اور سپاہی بسمارک تھا ۔ وہ سیاسی دنیا کا ایک روشن ستارہ مانا جاتا ہے ۔ اس نے جرمنی
کو منظم کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا ۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے فوج کی تنظیم کی ۔ نپولین سوم نے
اپنی اور پرشیا کی فوجی قوت کا غلط اندازہ کر کے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ۔
بسمارک کو اچھا موقعہ ہاتھ آیا ۔ فرانس کو ایسی فاش شکست ہوئی کہ پیرس بھی ہاتھ سے
نکل گیا ۔ بالآخر نپولین گرفتار ہو گیا اور فرانس نے صلح کر کے جمہوریت کا اعلان کیا ۔ پرشیا
کا بادشاہ متحدہ جرمنی کا شہنشاہ منتخب ہو گیا ۔ اس تاریخ سے جرمنی ایک مستقل طاقت

پہلی جنگ عظیم سے قبل

جناب مرزا [illegible] بیگ صاحب سابق کلکٹر

اس مضمون میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم سے قبل یورپین اقوام کی خود غرضیاں کس طرح دنیا کو زیر و زبر کر رہی تھیں اور جب جنگ شروع ہوئی تو ان کے باہمی تعلقات کیسے تھے۔

۱۸۱۵ء میں نپولین بونا پارٹ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد یورپ میں سات سال تک تقریباً امن رہا۔ اس زمانہ میں یورپین اقوام کو نئی معاشی اور اقتصادی ترقی کا خیال بہت زیادہ ہو گیا۔ امن کی وجہ سے مردم شماری میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ بہتر طریقہ یہی معلوم ہوئی کہ تجارت کے ذریعہ دولت کمائی جائے۔ اس خیال نے قومیت کا احساس اس درجہ پیدا کیا کہ تمام اقوام ایک دوسرے کی رقیب ہو گئیں۔ اپنے ملک میں روز افزوں آبادی کے لئے گنجائش کم تھی اسلئے مشرقی ممالک پر قبضہ کرنیکی تدابیر پر غور ہونے لگا۔ رسل و رسائل اور خبر رسانی کے ذریعہ میں ترقی کی گئی۔ صنعت و حرفت کے کارخانے قائم ہوئے۔ سائنسی ایجادات کی برکت سے مشرقی اقوام کو مغلوب کیا گیا۔ نوآبادیات کی اس دوڑ میں انگریز سب سے بازی لے گئے۔ ہر قسم کا کچا مال مشرق سے یورپ پہنچایا گیا اور اس کو مختلف صورتوں میں تیار کرکے مشرقی اقوام کے ہاتھ فروخت کیا جانے لگا۔

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی انگلستان کے زیر حکومت تھی جس کے مجموعہ میں صرف ۱۲ فی صدی یورپین نسل کے لوگ تھے۔ بقیہ آبادی افریقہ اور ایشیا کی [illegible] قوم تھی۔ ان غلاموں نے اپنے آقاؤں کو سب کچھ دیا۔ ہندوستان سے تیل، چائے، روئی، کپاس، [illegible] اور [illegible] کافی مقدار میں انگلستان جاتا تھا [illegible] اور مشرق قریب نے پٹرول کے چشمے کھول دیئے۔

بہ بارگاہ رسالت حضرت ختمی مرتبت امی وابی فداہ

جناب مسلم

رباعی

نعت شہ لولاک لما لکھتا ہوں — آتا نہیں کچھ سمجھ میں کیا لکھتا ہوں
خود جس کی ثنا خدا نے کی ہے مسلم — میں اس کی ثنا نام خدا لکھتا ہوں

اے نور پاک حضرت یزدان خوش آمدی — دیر آمدی بمجلس امکان خوش آمدی
از بہر آنکہ خیرہ نگردد نگاہ ما — خوش آمدی بصورت انسان خوش آمدی
ای راز آفرینش و اے [illegible] کن فکان — اے جان خلق و سرور [illegible] خوش آمدی
پژمردہ بود بے تو گل ملت خلیل — اے زندہ ساز رسم نیاگان خوش آمدی
اے جامع کمال رسولان ماسبق — رشک مسیح و موسیٰ عمران خوش آمدی
در سلک انبیائے خداوند ذوالجلال — دُرّ یتیم چشمہ حیوان خوش آمدی
توصیف حسن پاک تو مسلم چسان کند
شرمندہ ساز یوسف کنعان خوش آمدی

م۲/۶/۷

شہاب

جلد ۱۶ اردی بہشت ۱۳۵۷ف مارچ ۱۹۴۸ء نمبر ۶

(مرتبہ)

چندہ سالانہ محمد عبدالرزاق بسمل (للعہ)

نمبر شمار	عنوان	نام مضمون نگار	صفحہ
۱	بہ بارگاہ رسالت حضرت ختمی مرتبت امی لہ فداہ	جناب مسلم	۲
۲	پہلی جنگ عظیم سے قبل	جناب مرزا حسین احمد بیگ صاحب سابق جج ہائیکورٹ	۳
۳	غزل	جناب محشر	۷
۴	فردوسی (ڈرامہ)		۸
۵	کوئل	بسمل	۱۶
۶	خواتین اور ادب	....	۱۷
۷	افکار تازہ	جناب تمنا عمر آبادی	۲۲
۸	ایک خط	جہاں بانو ایم - اے	۲۳
۹	فیوڈ	جناب سید معین الدین صاحب مغربی	۲۷
۱۰	رشحات شاکر	شاکر	۲۹
۱۱	عورت	ایکس یورپین نقاد	۳۰
۱۲	ناکام تمنا	....	۳۱
۱۳	نشیمن بر دوش	جناب ظہیر صاحب	۳۲
۱۴	افسردہ شعلے	اختر محمود بی - اے	۳۳
۱۵	ہماری جاہلیت	خالدہ شمیم	۳۷
۱۶	لرزاں سائے	سلطانہ	۴۰
۱۷	رباعی	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	۴۱
۱۸	جذب دل	صغرا سلطانہ	۴۲
۱۹	زندگی نام ہے اضطراب کا	بلال کلیم شاہد	۴۴
۲۰	آنسو	آنسہ باصرہ	۴۵
۲۱	عورت اہل ایران کے نزدیک	نفیس جہاں	۴۶

انجمن آرٹ پرنٹنگ پریس
چھتہ بازار حیدرآباد دکن

ماہوار

حیدرآباد دکن

انجمن آرٹ پرنٹنگ پریس
چھتہ بازار حیدرآباد دکن

۱۳ / ۷ / ۱۹۱ / ۱

شہاب

جلد ۱۶ امرداد ۱۳۵۷ف م جون ۱۹۴۸ء نمبر ۹

مرتبہ

محمد عبد الرزاق بسمل

چندہ سالانہ (صہ)

آزاد حیدرآباد

"آزادی انسان کا فطری حق ہے اور دوسرے حصول میں بقول مصطفیٰ کمال "قوم کی آزادی چھین لی جائے تو وہ صرف اپنی ہی کوششوں اور سرگرمیوں سے اس نعمت کو واپس لے سکتی ہیں۔"
چہ جائیکہ مملکت آصفیہ کا پرچم آزادی اور خودمختاری دو سو سال سے بلند ہے اوسکی غلط تاویل کرنا سیاست نہیں کہلا سکتا۔

قوموں کی زندگی کا انحصار حوصلوں پر ہوتا ہے چنانچہ آصفی حکمرانوں نے ابتداء ہی سے اپنی آزادی برقرار رکھی اور ملک میں امن و اتحاد کا ایسا دسترخوان بچھایا کہ ہندو و مسلم دونوں نے ایک دسترخوان پر کھایا اور ایک چشمہ سے پانی پیتے آئے ہیں۔

۱۵ر اگسٹ کے بعد تقسیم ہند کے مسئلہ نے اس میں الجھن پیدا کردی آزادی کے نام لیوا جو صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہا انہوں نے اپنے ہمسایہ کو غلامی کی نئی زنجیر میں جکڑنے کا فیصلہ کیا اور وہ خونی کی ہولی کھیلی کہ جسکے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

الحمدللہ کہ حیدرآباد ابتداء ہی سے امن و امان کا گہوارہ ہے اپنے متاع عزیز آزادی کو جو بطور ورثہ چلی آئی ہے دشمن کے دست تعداد نہ ہونے دیگا۔

حال ہی میں دارالعلوم میں امور خارجہ پر مباحثہ کے دوران میں قائد حزب الاختلاف مسٹر آرسے ، سے بینٹر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ حیدرآباد آزاد رہنے کا پورا حق رکھتا اور وہ برطانوی ور ۔ ت عامہ کی رکنیت کا بھی مجاز ہے" اس خیال کی نسبت بہ قانونی وزیر اعظم ڈیٹلی نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ "ہندوستان اور حیدرآباد کے حالات بہتر ہو جائینگے"

ان بیانات کی روشنی میں ہمسایہ حکومت کو چاہیئے کہ حیدرآباد سے دوستی کا ہاتھ ملائے کیونکہ حیدرآباد ہمیشہ سے آزاد تھا اب تو وہ حقیقی معنوں میں "آزاد حیدرآباد" ہیں۔

بلکہ :—— عظیم تر حیدرآباد ہے اور رہیگا۔

قطعہ

مولانا امجد حیدر آبادی

"مولانا امجد کا یہہ قطعہ اس قابل ہے کہ ہر گھر میں آویزاں رہے اور علی الصباح بستر سے اٹھتے ہی نظر پڑے یقیناً یہہ ہمارے حوصلوں کو بڑھانے والا ہے"

کچھ کیے جاؤ لے کے نام خدا
کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے

کامیابی کچھ اور چیز نہیں
کام کرنا ہی کامیابی ہے

مولانا آزاد

یاد ہوگا کہ آج سے ایک عرصہ پہلے سنہ ۱۹۱۳ء میں جبکہ کانپور کے ایک مسجد کی دیوار شہید ہوئی تھی تو الہلال میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ہنگامہ پرور مضامین لکھ کر مسلمانوں کی حمیت اسلامی کو ابھارا تھا۔

آج وہی ابوالکلام ہیں کہ دلی کی مساجد ضبط ہیں لیکن مولانا کا جذبہ ایمانی حرکت میں نہیں آتا۔

مسجد کانپور کا واقعہ سنہ ۱۳ء کا ہے اور دلی کی خونین داستان سنہ ۴۸ء کی ہے کانپور والے واقعہ کے وقت مولانا کے رگوں میں خون کی روانی زیادہ تھی اور سنہ ۴۸ء میں انحطاط لازمی ہے اور پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ خداوندان حکومت ہند کی بارگاہ دولت میں سجدۂ نیاز خم کرنے ہی میں کوئی مصلحت تصور فرماتے ہیں سچ کہا ہے مولانا آزاد نے "پتھر میں سوراخ پڑ جاتے ہیں اور جب دل پتھر کے ہو جائیں تو ان کا پگھلنا محال ہے"

اللہ اللہ کس قدر جذبہ ایمانی اور قوت اسلامی کا مظاہرہ ہے۔ ایک شعر میں ایک ستم ظریف نے کیا خوب تحریف کی ہے:—

جناح کراچی۔ لیاقت ز دہلی نشتر از سرحد
ز خاک مکہ[1] و آزاد این چہ بوالعجبیست

کانپور کے واقعات کے نقوش آپ کے حافظہ میں محفوظ نہ ہوں تو ذیل کے اقتباس سے اپنی یاد تازہ کیجیئے:—

یالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیا!

اما علی الدین انصار و اعوان ؟

---

[1] مولانا آزاد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے فیروز بخت تاریخ پیدائش ہے۔

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن ۔ بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا!
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز ۔ اے روسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

...مالہ پرچہ چھپنے کے لئے جا چکا تھا کہ کانپور کی مسجد کے متنازع فیہ کے بالجبر انہدام کا ٹیلگرام کلکتہ پہنچا:

هٰذَا الَّذِي كُنْتُم بِهِ — یہ ہے وہ نتیجہ تمہارے اعمال اور غفلت کا،
تُكَذِّبُونَ (۲۲:۳۰) — جس کو تم نادانی سے جھٹلایا کرتے تھے!

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نہیں سمجھتا کہ اس واقعہ کی نسبت کیا لکھوں؟ سوا اس کے کہ دعا مانگوں کہ اللہ تعالےٰ مسلمانان کانپور پر رحم فرمائے، اور جو بے غیرتی اور بے حمیتی کی مثال ملعون انہوں نے قائم کی ہے، اسکو اور زیادہ متعدی نہ کرے۔

لیکن کیا اب ہم ایسی خبروں کے سننے کے لئے زندہ رہ گئے ہیں۔ اور کیا یہ سچ ہے کہ اب ہندوستان ہمارے لئے دار الامن نہ رہا، اور شعائر اسلامیہ اور عمارت دینیہ کا انہدام علانیہ شروع ہو گیا؟

کیا اب کرچیں چڑھائی جائیں گی، تاکہ مسجدوں کا محاصرہ کیا جائے؟ کیا فوجیں پھیلیں گی، تاکہ پرستاران الٰہی کو اپنی مساجد کے احترام سے روکیں؟ کیا شہروں کی ناکہ بندی کی جائیگی، تاکہ مسجدوں کے حصے گرائے جائیں، اور ان دیواروں کو جن کے اندر پانچ مرتبہ خدائے واحد کے نام کی منادی ہوتی تھی، جبر و قہر اور آلات و اسلحہ کے زور سے غبار بنا کر اوڑا دیا جائے؟ پھر کیا اسلام کی مسجدیں بے یار و مددگار ہو گئیں؟ اور کیا آج خدا کی زمین پر کوئی نہیں کہ اسکی پرستش گاہوں کی عظمت کو برقرار رکھے؟

الا نفس ابیات لہا ہمم
اما علی الدین انصار و اعوان؟

(ایڈریا نوپل) کی مسجد سلیم کا نوحہ سنکر جو آنکھیں رو رہی تھیں، کاش ان کو کوئی یہ پیام پہنچا دے کہ اب سمندروں کے پار جا کر ماتم کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ ایڈریا نوپل کی مسجد نے اپنے فدائیوں کو چار مہینے تک اپنی حفاظت میں سرگرم جانفروشی دیکھنے کے بعد

اپنے صحن میں کفار و ملاعنہ "بلغار کے جوتوں کی گرد دیکھی" پر ایک مسجد مقدس "کانپور" نامی آبادی میں بھی ہے جس نے اپنی راہ میں بغیر ایک قطرہ خون کے بہے یہ دیکھا کہ اس کے بازوں پر تیشہ ہائے اماں کی ضربیں پڑ رہی تھیں اور ایک آواز بھی نہ تھی، جو اسکے لئے نالہ و فغاں کرتی ہوا

فاہ! اہ! ثم اہ! علی ما فرطتم فی جنب اللہ! و یالیتنی مت قبل ہذا و کنت نسیا منسیا!!

نہ داغ تازہ می کارد، نہ زخم کہنہ می خارد

بدہ یارب دلے کین صورت بیجاں نمی خواہم

پھر اے کانپور کے "وہ اسلام فروش" اور کفر پرست لیڈرو اور اے وہ ناپاک و نجس انسان صورت حیوانوں کہ تمہاری موت تمہاری زندگی سے بہتر ہے، اور تمہاری بربادی و ہلاکت مسلمانوں کیلئے رحمت و برکت الٰہی ہے، بتلاؤ کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد تم کس فکر میں ہو؟ اس فکر میں کہ اللہ کے گھر کی دیواروں کا ایک حصہ تو گرا دیا گیا، لیکن محراب و ممبر تک محفوظ ہیں؟ اگر اسی کا افسوس ہے تو میں تمکو کہ میں نہیں سمجھتا کہ کن لفظوں سے مخاطب کروں۔ تم کو اطمنان دلاتا ہوں کہ غمگین مت ہو کہ وہ وقت بھی کچھ دور نہیں۔ جس قوم میں تمہارے ایسے اجسام خبیثہ و اجساد ملعونہ موجود ہوں، ان کی مسجدوں کی محرابوں اور ممبروں کو بھی اگر کھود دیا جائے تو کچھ بعید نہیں۔

افسوس کہ ہماری اصلی بدبختی یہ نہیں ہے کہ ہمارے اوپر کون ہے، بلکہ بدبختی یہ ہے ہمارے اندر کون ہے؟ ہماری بدقسمتیوں میں ہمیشہ غیروں سے زیادہ خود اپنوں کا دست کفر و نفاق مخفی ہوتا ہے۔ گورنمنٹ اور حکام کو کیا کہئے کہ توقع ہی کسے تھی؟ شکایت تو جب ہونی چاہیئے کہ توقع ہو۔ پس دین الٰہی کی اس اشد شدید بے حرمتی کی ساری ذمہ داری ان بندگان خدا پر ہے جن کے ہاتھ میں مسلمانان کانپور کے معاملات کی باگ ہے یہی دین فروش ہیں جنہوں نے عام مسلمانوں کو عرصہ تک بے خبر رکھا جنہوں نے ان کے جوش و اضطراب کو اپنے وسائس و شرارت سے ہر مرتبہ دبا دیا، جن میں سے بعض ایک طرف تو غریب مسلمانوں کا بھی ساتھ دیتے تھے اور دوسری طرف حکام کے آگے سر بسجود رہتے تھے یہی وہ ذریات ابلیس اور پرستاران شیطان ہیں جنہوں نے ہمیشہ لوگوں کو کام کرنے سے روکا اور کسی نہ کسی فریب سے ان کو باز رکھا۔ اول تو جلسے ہی

نہیں کھئے، پھر بعض لوگوں کے پاس روتے پیٹتے آتے جاتے رہے پھر جلسہ بھی کیا تو مارے خوف و دہشت کے ان کی زبانوں سے آواز نہ نکلی، اور مسلمانوں کو محض رزولیوشنوں، میموریلوں اور عرضداشتوں میں الجھائے رکھا غرضکہ :

الذین یستحبون الحیاۃ الدنیا علی الاخرۃ ویصدون عن سبیل اللہ ویبغونھا عوجا، اولٰئک فی ضلال مبین (۳ : ۱۴)

"وہ لوگ جنہوں نے حیات آخروی پر حیات دنیوی کو ترجیح دی ہے، جو بندگان الٰہی کو اللہ کی راہ سے باز رکھتے ہیں، اور جو اس کی راہ میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو یہی لوگ ہیں جو انتہا درجہ کی گمراہی میں مبتلا ہیں، اور ہدایت ان سے کوسوں دور ہے!"

لیکن یاد رہے کہ گو ان کو اپنے اعمال شیطانیہ کی اس دنیا کے سوا، کسی دوسری زندگی کا تصور کرنے کی توفیق نہ ملی ہو تاہم ایک دوسری دنیا ضرور ہے۔ ایک وقت آنے والا ہے۔ جب کہ جلال خداوندی کا آخری تخت بچھیگا، جب کہ وہ عدالت قائم ہوگی، جس کا فیصلہ کرنے والا خود عالم الغیب ہوگا اور پھر اس وقت ان سے پوچھا جائیگا کہ اے وہ لوگو! کہ ہوائے نفس تمہارا معبود تھا، دراہم و دینار تمہارا قبلہ تھا، حکام کی پرستش تمہاری شریعت تھی، اور اصابع الرحمان کی جگہ "اصابع الشیطان" ہیں تم نے اپنے دلوں کو دیدیا تھا بتلاؤ کہ آج وہ تمہارے معبودان باطل کہاں ہیں جو تم کو میری پکڑ سے بچا سکتے ہیں؟ این شرکاؤکم الذین کنتم تزعمون؟ (۶ : ۱۵) کیا تم ہی وہ نہیں ہو کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے میرے دین کی علانیہ بے حرمتی ہوئی اور میری عبادت گاہ کی دیوار مسمار کی گئی پر تم کچھ نہ بولے بلکہ اپنی بزدلی اور فساد انگیزی سے اس کا سامان کرتے رہے؟؟ تم نے میری راہ سے میرے بندوں کو روکا، اور انکو میرے گھر کی عزت کے لئے اٹھنے نہ دیا؟ پھر کیوں نہ آج میری لعنت تم پر چھا جائے اور کیوں نہ ان لوگوں کے جسموں کے ساتھ وہ سب کچھ عمل میں لایا جائے، جس کو انھوں نے میرے مقدس گھر کے ساتھ گوارا کیا

فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون!!"

بگھی

جناب ابوالکمال

اچھا بچہ جی اگر اس کا بدلہ نہ لوں تو
معین نام نہیں
ایں کیا کہا ؟ تم نے اس وادی کی ایک اور منزل
طے کی یعنی اب خود سے باتیں کرنا شروع کر دیں
بندہ خدا مخلا بالطبع ہو جاؤ پسینہ
پونچھو کیا میں تمہارا وہ مرغوب شعر دہرا دوں

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

ارے یار رہنے بھی دو جب دیکھو مذاق،
کبھی تو سنجیدہ بنو فلسفہ کے طالب علم کو
کبھی ایسا بے فکرا تو نہیں دیکھا۔
واہ جی اب تک تم جنگ سے پہلے
والے زمانے میں ہو۔ یہ جنگ نہیں مردہ دل
فلسفیوں کی لائی ہوئی تھی جنہوں نے دنیا پر
ایک مردنی چھا ڈالی، تنظیم مابعد جنگ میں
زندہ دل فلسفیوں کی ضرورت ہے تاکہ ہر
طرف زندہ دلی ہی زندہ دلی ہو۔
فضل کے اس فقرے پر معین کی مسکراہٹ رک
نہ سکی، کہنے لگا تم جیسے ساتھی کا اس جفاکوشی
کے زمانہ میں مجھے مل جانا میری عین خوش
قسمتی ہے کیا اس سے آپ کا یہ مطلب ہے
کہ میں آپ کے لیئے اس قسم کا بیسوں ساتھی
ڈھونڈھ لاؤں !
کاش ایسا ہو سکے دایک ہلکی سانس لیتے ہوئے:
کیا میں یہ سمجھوں کہ ان سانسوں کا سلسلہ کسی
تازہ واقعہ سے ملتا ہے ؟ ہاں ہاں میں بھول ہی
گیا۔ وہ "بدلہ" والی بات کیا تھی۔
جانے بھی دو مجھے وہ بھی تو اقعہ بھول ہی جاتا
تو پھر اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دل کے
تلاطم کو آنکھوں یا منہ سے بہا دو۔ لگے
آپ فلسفہ بگھارنے۔
اس میں فلسفہ کی بات کیا ہے یہ تو روزمرہ

(م)شاہدہ ہے کہ جب بچہ چیخ چیخ کر رو لیتا ہے
(ا)س کی ضد تھم جاتی ہے۔

تمہاری منطق کے سامنے کس کی چلے۔

ہاں تو پھر سناؤ اپنی روئداد عشق!

خوب! اب آپ ایک تعلق سے ایک غیب
دان بھی ہو گئی۔ اس میں غیب دانی کی کیا
(ب)ات ہے! تھوڑی سے شئے لطیف کی ضرورت
ہے، آپ کا چہرہ، البشرہ، کھوئی کھوئی سی کیفیت
(ع)لم کھلا کہہ رہا ہے کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
ہمت ہو تو اس سے انکار کرو

جنگی مجرموں کو اقبال جرم کے لئے آپ پاس
بھجوانا چاہیے

جنگی مجرم! مجرم دونوں بھی فاتح بھی اور
مفتوح بھی،

شاید یہ فلسفے کی کوئی جدید تحقیق ہو۔

پرانی بات ذرا سی نئے طریقے پر کہو تو تم
لوگ چراغ پا ہو جاتے ہو، جسکی لاٹھی اسکی
بھینس کو تو سمجھتے ہو نا؟ کیا اسکے بعد بھی
تشریح کی ضرورت ہے

بات کہاں سے کہاں نکلی۔

واقعی وہ آپ کی دلچسپ کہانی تو رہ گئی۔

پھر وہی چھیڑ، کھانے کا وقت ہو رہا ہے چلو
ڈائننگ ہال چلیں

اگر یہ راز سربستہ ہے اور اس کا زبان پر آنا
افشا ہونے کے مترادف ہے تو پھر اسکو رہنے دو
ہو گئے ناراض! سناؤں گا ایک شرط پر یعنی
یہ کہ میری ہنسی نہ اڑاؤ۔

یہ سب پیش بندیاں کیوں، پھر تو ہے کوئی
مزیدار قصہ سناؤ بھئی اب کسی پیشگی تمہید
اور تعارف کی ضرورت نہیں۔

قصہ وصہ تو کیا ایک واقعہ ہو گیا بلکہ
حادثہ!

کیا تعجب ہے، زندگی نام ہے مسلسل حادثات کا
آج دوپہر میں شہر جاتے ہوئے میں نے تم سے
کہا تھا کہ چلو کوئی سینما دیکھیں مگر تم نے اسکو
سنی ان سنی کر دیا اور انہوں کہکر کتاب آنکھوں
سے لگا لی

بات یہ تھی کہ کوئی اچھا فلم نہ تھا جس کیلئے
تکلیف کیجاتی اور پھر رضی الدین صدیقی کی
کتاب فلسفہ مکاں و زماں ہاتھ لگی تھی جسکو بغیر
ختم کیے یہ کمرہ کہاں چھوڑتا۔

تو پھر میں تنہا تبقدیر روانہ ہوا ابھی دو چار قدم
بھی نہ پایا تھا کہ ایک اشتہار پر نظر پڑی جلی
حرفوں میں لکھا تھا "چترلیکھا" سمجھا کہ سال
گزشتہ کا اشتہار ہو گا قریب جاکر دیکھا
تو آج ہی کی تاریخ تھی اور آغا پورہ کے ٹورنگ۔

تاکیز میں دکھلایا جا رہا تھا، نہ پوچھو کہ میرا
دل کس قدر تیز حرکت کرنے لگا وقت کم تھا
نہ معلوم میں نے کس رفتار سے بائیسکل چلائی
کہ دیکھتے دیکھتے وہاں پہنچ گیا۔

بندہ خدا مجھے یہ بتلایا ہوتا کہ تم چترلیکھا
دیکھنے جا رہے ہو۔

جناب کی حاضر دماغی کی داد دیجئے میں کہہ
رہا ہوں کہ علیدرو ڈپیر میں نے اس کا اشتہار
دیکھا۔ مگر پھر بھی تم نے مجھے اس لذت سے
محروم رکھا، تعجب نہیں کہ تم ایک رقیب
کی موجودگی کو برداشت نہ کر سکتے تھے

اور جو وہاں جناب جیسے پانچ سو ساٹھ اور
متنفس تھے۔

وہ کیا جانیں کہ چترلیکھا، کیا کھیل ہے، کچھ
نیم عریاں نظارے انہیں دعوت نظارہ دے
تو دیں میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص اپنے اپنے نقطہ
نظر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کہانی اچھی
ہے مکالمہ بہترین ہے۔ گانے دلکش ہیں،
ادا کاری اعلیٰ درجہ کی ہے سٹنگ نظر افروز
ہے غرض کہ اس میں کسی چیز کی کمی نہیں جسکی کسی
شخص کو تمنا رہ جائے

مجھے تمہارے لفظ لفظ سے اتفاق ہے
تم نے ساری تصویر میری آنکھوں کے سامنے
پھیر دی۔ "یہ ان تصویروں میں سے ایک ہے
جن کو حافظہ فراموش کرنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے
شروع ہو کر کبھی ختم نہیں ہوتیں اور سامنے آکر
کبھی واپس نہیں جاتیں" یہ ہزاروں جلووں کی ایک
بے پناہ تصویر ہے اور ہزار رنگینوں کا ایک
دلکش مرقع"

یہ تعریف تو ہم نے بیگم، کے بارے میں سنی تھی۔
غلط سراسر غلط اس ایک تصویر کے سوا کسی
اور کی تعریف کرنا بدتمیزی ہے۔

یہ تو اپنی اپنی پسند ہے آپ کون خدائی فوجدار
بندہ خدا کیا اس سے انکار کرو گے کہ اس تصویر
کا آغاز آنکھوں کو مسحور کرتا ہے اور انجام دل
کو اسکو دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ
کوئی حسین خواب دیکھا ہے ایسا خواب جو
بیداری میں بھی دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے"
مجھے کب اس سے انکار ہے، جب ہی تو میں نے
چھٹی دفعہ اسکو دیکھا ہے۔

کیا یہ پوری تصویر "جذبات کی حسین قوس قزح
نہیں جس میں آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے رنگ
بھرے گئے ہیں بالکل درست۔

کیا گرودیو کی زندگی کے جزر و مد کا غیر فانی نقش
نہیں؟ کیا یہ ظاہر اور باطن کی نظر فریب تصویر نہیں"
ہے اور ہزار بار ہے۔

م میرا مذاق اڑاؤ مگر سچ بتاؤ چترلیکھا اور
ساونت سچ گٹ جی کی ایک بات اس رات کی
صویر نہیں جس کی شام سینکڑوں بیچین تمنائیں
س کا شباب امید و یاس کے طوفان اور جسکی
سح بجھتے ہوئے چراغ کی سی ادا سی رکھتی ہے"
خر تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو -
ہی کہ جب چترلیکھا ہنستی ہے تو فضا میں زندگی
ی لہر دوڑ جاتی ہے روتی ہے تو دنیا کراہتی
ہوئی معلوم ہوتی ہے، گاتی ہے تو کائنات
ی ہر چیز پر مدہوشی طاری ہو جاتی ہے اسکو
دیکھ کر دل میں اسکی آرزو کے سوا اور کچھ
باقی نہیں رکھا جا سکتا "

اچھا تو یہ بات ہے یہ معلوم نہ تھا کہ جناب
چترلیکھا کے جو مہتاب کے روپ میں آئی ہے
س قدر عاشق زار ہیں - غلط یکسر غلط،
چترلیکھا کا حسن بھی فانی تھا اور مہتاب
ابھی میری نظر میں اس سے بلند و بالا ہیں
پ کی دوڑ تو بس بارڈر تک غور کرو کیا یہ
تصویر "اس مقام کی نشاندہی نہیں کرتی
جہاں آرٹ اور سحر کی راہیں مل جاتی ہیں یہ
بہار کو عمر جاودانی عطا کرتی ہے اور
جوانی کو آب حیات پلاتی ہے "
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ پر

ایک نشہ طاری ہے
ہاں کیونکہ اس کے ہر نقطے سے مستی اسی طرح
جھلکتی ہے جسطرح کسی لب بلب ساغر سے
شراب - اور کچھ -
بصیرت والوں کے لئے بہت کچھ ہے آتی پر
کشش کہ روح سمٹ کر آنکھوں میں آجائے
ایسی حسین کہ ناظر کا دل نقطہ تمنا بنکر رہ جائے"
اور بصارت کے لئے -
بصارت کے لئے حسین بھی ہے نظر فریب
فریب بھی موثر بھی ہے اور دل خوش
کن بھی "

سماعت کے لئے بھی کچھ ارشاد ہے
کیوں نہیں وہ تصویر جس میں بہار نغمے گنگناتی
ہوئی اور کلیاں مسکراتی ہوئی نظر آتی ہیں "
شاید یہاں مسکراتی کی جگہ کھکھلاتی زیادہ
موزوں ہوتا -

یہ اپنا اپنا ادبی ذوق ہے -
میں سمجھتا ہوں کہ صبا کمپنی کے اشتہار کے لئے
کافی مواد جمع ہو گیا ہے -
دنیا میں کس چیز کا اشتہار نہیں - ہوتا، موت
اشتہار ہے زیست اشتہار ہے بزم اشتہار
ہے اور رزم اشتہار ہے نیکی بھی اشتہار ہے
اور بدی بھی -

معلوم ہوتا ہے کہ اس فلسفہ کو جناب نے چترلیکھا
کی کہانی ہی سے اخذ کیا ہے۔

یہ تو ایک روزمرہ کا مشاہدہ ہے جو میں بیان
کر رہا ہوں۔ بات کہاں سے کہاں پہنچی میں نے
بڑی بکواس کی ارے یار سناؤ تو وہ اپنی
آپ بیتی۔

تمہاری اس عالمانہ اور فلسفیانہ گفتگو کے بعد
بہتر تو یہی ہے کہ کوئی اور گفتگو ہی نہ ہو مجھے
ٹالنے کا یہ ایک بہانہ ہے تو یوں ہی سہی۔

تمہارا یہ خیال ہے تو پھر میں اسکو سناتا ہوں۔
میٹنی شو تھا۔ تماشائیوں کا ہنگامہ اور ہجوم
ڈیرے میں اندھیرا کیا ہو سکتا، میں سمجھا یا کہ
کیوں میں نے بیوقوفی کی مگر جب کھیل شروع
ہوا ہے تو ایک سناٹا تھا اور معلوم ہو رہا
تھا کہ بس اندھیرے میں کھیل ہو رہا ہے تصویر
بتلائی جا رہی ہے۔ ڈھائی تین گھنٹے کس طرح
گزرے پتہ نہ چلا اور میں نے وہ سب کچھ
محسوس کیا جسکو آپ نے بیان کیا ہے۔

اب ہو رہا ہے اعتراف گناہ!

ایک نشہ کی سی کیفیت میں باہر نکلے اور بائیسکل
پر ہاتھ رکھکر مجذوب کی طرح وہیں کھڑے ہو گئے
جب تمام سیکلیں نکل چکیں تو محافظ نے نمبر دیجیے
ساب کہکر چونکایا نمبر دیکر سیکل پر سوار
ہونیکا ارادہ کیا تو پیسے ساب کی آواز آئی،
بہت خفیف ہو کر بجائے ۲ پیسے کے ایک آنہ حوالہ
کیا اور اپنی دانست میں یہ سمجھے کہ اس چوک کی
کافی تلافی کی ہے۔ ایک اندرونی فخر کے ساتھ
بائیسکل پر سوار ہو کر سمنٹ روڈ پر روانہ ہوا کہ سامنے
کے ہجوم میں سے ایک شخص جادو جادو تم بھگوان بنے
انسان بنو تو جانوں کو ویسے ہی گا رہا تھا جس طرح
کہ فلم میں رام دلاری نے گایا تھا، بائیسکل کی رفتار
خود بخود کم ہو گئی اور مجھے اس راگ کا لئے انتہا
لطف آنے لگا۔

واقعی گانا ہے بھی ویسا ہی اس سے خوابیدہ روح
میں ارتعاش ہونے لگتا ہے۔

کمبخت ایسے میں پیچھے سے ایک آواز آئی ہٹ
جاؤ بازو او سائیکل والے صاحب، پوری
طرح ہٹنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک بگھی بازو سے نکل
گئی، اس بدتمیزی پر مجھے بڑا غصہ آیا اور قہر
آلود نگاہوں سے بگھی کی طرف دیکھا چلمن میں
سے حسن بے پناہ کی ایک جھلک نے نہ صرف غصے
کو کافور کیا بلکہ مجھے موم کی طرح پگھلا دیا۔

حسن رہگزر سے لطف اندوز ہونے میں
برائی کیا ہے۔

ابھی سرو د ہمسایہ سے لطف اندوز ہو رہا تھا
کہ حسن رہگزر سے سابقہ پڑا واقعی تم خوش

قسمت ہو کہ دنیا بھر کی نعمتیں آج تمہیں ملیں
کاش ایسا ہوتا ۔
کیوں خیر تو ہے پھر ہوا کیا پہلی ہی نظر میں
دل حوالے کر دیا
سنو تو اب قوت سامعہ پر قوت باصرہ غالب
آچکی تھی اور میری بائیسکل خود بخود بگھی
کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی ۔
ہونا چاہیئے ۔ عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا
میری صرف ایک خواہش تھی کہ اس بے مثال
حسن کو جس کی میں نے صرف ایک جھلک دیکھی
تھی بے پردہ دیکھ لوں ۔ اچھا تو یہ آپ
کا وداں دواں کوہ طور تھا ۔
جو کچھ بھی کہیئے میں تو اپنی آرزو کی تکمیل میں
ساتھ ہو لیا ۔
ارے میاں! آرزوؤں کی تکمیل اس قدر آسانی
سے ہو جائے تو پھر یہ دنیا جنت نہ ہو جائے
سچ ہے ۔ کبھی چلمن آدھی اٹھتی اور کبھی چہرے
کا یہ حصہ دکھائی دیتا کبھی وہ، میں یہ نہ
سمجھ سکا کہ ریشمی دستی سے منہ کیوں چھپا لیا
گیا تھا، شاید وہ اپنی مسکراہٹ کو ظاہر
نہ ہونے دینا چاہتی تھیں، مگر ان کو کیا معلوم تھا
کہ انکی نرگسی آنکھیں اس کی غمازی کر رہی ہیں
ان کی ستواں ناک درخشندہ پیشانی جھکے

سامنے چاندنی تھرا سے میرے دل پر بجلیاں
گرا رہی تھی ۔ فضلی یقین مانو اگر گھوڑے کے
ٹاپوں کی آواز سیمنٹ کی سڑک پر اس قدر
زور سے نہ نکلتیں تو مجھے یقین ہے کہ میرے دل
کے دھڑکنے کی آواز انکو ضرور سنائی دیتی یہ آواز
تو ریڈیو کی سوچ میں تبدیل ہو کر جاتی ہے ۔
انہوں نے اسکو سنا ہو گا اور ضرور سنا ہو گا
شاید ایسا ہی ہو کیونکہ ایک منٹ کے لیئے بھی
انہوں نے اپنی توجہ مجھ سے نہیں ہٹائی سیدھا
ہاتھ تو منہ پر تھا خوبصورت نازک انگلیوں
میں چمکدار انگوٹھیاں بالکل اسی طرح دکھائی
دے رہی تھیں جیسے کسی جوہری کے اشتہار میں
جواہرات سے زیادہ ہاتھ کو خوبصورت
دکھایا جاتا ہے بایاں ہاتھ دروازے کے
پٹ پر تھا اس میں بھی انگوٹھیوں کی نمائش
اسی طرح تھی، اور انگلیوں میں حرکت اس قسم
کی ہو رہی تھی کہ مجھے ساتھ ساتھ چلنے کے لیئے
اشارہ ہو رہا ہے ۔ فضلی تمہیں بتاؤ کہ تم میری
میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے وہی کرتا جو تم نے
اب تک کیا اور آئندہ جو کرو گے ۔
ایک منٹ کے لیئے بھی میری نظر اس چلمن سے
نہ ہٹی، مجھے پتہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور
کہاں جا رہا ہوں ۔ اچنبھے کی کیا بات ہے،

ہونا تو یہی چاہیے تھا۔
بگھی لیکا یک رکی تو پچھلی طرف کے بائیں پہیے
سے ٹکرا کر ہم چاروں خانے چیت ہو گئے
توقع تھی کہ کچھ ہمدردانہ الفاظ سنونگا
مگر اس کے برخلاف ایک تیز قہقہہ نے مجھے
اور کھسیانا کر دیا ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ
پیچھے سے ایک موٹر اس طرح گزری کہ
ٹکر ہوتی ہوتی رہ گئی اپنے چاروں طرف
نظر ڈالی تو وہ نیا پل تھا نہ جانے اس
وقت کیوں یہ غیر معمولی میلہ لگا ہوا تھا
میلہ کیوں نہ ہو جب سڑکوں کی آمد و رفت
کو اس ایک تنگ سے پل پر سے گزرنا پڑتا ہے
جسکی آزمائش پل صراط سے کم نہیں، خدا جانے
اس کی توسیع کے لئے کس اچھے دن تاریخ
کا انتظار ہے بلدیہ کا خیال ہے کہ کلاک
ٹاور کا اوپری نصف حصہ ڈھا دینے
سے اس کی توسیع ہو چکی - اس لئے کہ
آمد و رفت کا بہت سا حصہ ٹاور کے بقیہ
حصے پر گزرتا ہے۔
دونوں نے قہقہہ لگایا۔
ہاں بھئی پھر کیا ہوا
ہوا کیا، نیلی شیروانی پر گرد زیادہ
بیٹھ جاتی ہے اس کو اچھی طرح جھٹکنا
پڑا اسکے بعد سامنے جو دیکھتا ہوں تو بگھی
بمشکل سو گز بڑھی ہو گی مگر چلتی پر نگاہ
پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک فٹ سے
اونچی اٹھتی ہو گی پوری گردن دروازے سے باہر
نکالے ہوئے مجھے ہی دیکھ رہی ہیں، نہ پوچھو
فضل کرا اس وقت میرے دل کا کیا حال
تھا کمبخت اس قدر زور سے دھڑک
رہا تھا کہ سانس رک جانے کا اندیشہ ہو رہا
تھا، جس طرح مقناطیس ایک سوئی کو اپنی
طرف کھینچتا ہے بالکل اسی طرح میں بھی
کھنچا کھنچا رہا، کیوں نہ ہو
دل تابع عشق تھا کشش تابع جمال
میں نے محبت آپ کی ہاں فرو کی
آنکھ جھپکتے ہی پھر میں بگھی کے ساتھ
تھا ایک مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم
کیا گیا مگر منہ پر سے دستی نہ ہٹانا میرے
لئے کچھ تکلیف دہ ضرور تھا لیکن میں با آسانی
تصور کر سکتا تھا کہ ہونٹوں کی جگہ دو گلابی
پتیاں ہونگی اور دہانہ غنچہ شگفتہ ہوگا
دستی کہیں ناک پر تو نہ تھی کہ تمہارے پسینہ
کی بدبو سے وہ پریشان ہو رہی تھے۔
خوب۔ بگھی اتنی معطر تھی کہ مجھے گلبہار
کیسی معلوم ہو رہی تھی۔

یعنی آپ کے پسینہ کی بو پر وہ غالب تھی
پھر تو یہ ہو گا کہ چلمن اٹھانے سے جو گرد و غبار
اندر آرہا تھا اس سے بچنے کے لئے ایسا کیا ہو گا
میں بھی یہی سمجھا۔ جب اس قدر التفات
کی بارش ہو رہی تھی تو التجا کرتے کہ مصحف رخ
پوری طرح دکھلائیں۔ چار مینار سے
آگے بڑھنے کے بعد جب آمد و رفت میں
کچھ کمی ہوئی تو دبی لہجے میں اس قسم کی التجا
بھی کی۔ تو پھر بات بنی کچھ ؟ التجا کرے
اسکا جواب ایک گہری مسکراہٹ سے ملا
آنکھوں میں چمک اور بڑھ گئی ڈورے
زیادہ سرخ ہو گئے، جسم اسطرح بل کھا
گیا جیسا کہ کسی نے گدگدایا ہو۔ بڑی
خوش قسمت ہو یار کہ ایسے نظارے
نصیب ہوئے۔ سنو تو، اسکو ایک
انداز معشوقانہ کے سوا اور کیا سمجھا۔
اس میں شبہ کی کیا گنجائش تھی۔ یہ جادہ
جا ہم لال دروازہ پہنچے اور یہاں کوچوان
نے ہٹ جاؤ موڑ پر سے کی ایک آواز لگائی
یہاں بھی گنگر ہوتے ہوتے بگھی فوراً بریک
لگا کر زمین پر پاؤں ٹیک دیا مگر اپنی خفت
کو مٹانے کے لئے چابک کو عید آگرا کر پھر چڑھا
نے لگا۔ بگھی کی طرف جو نظر ڈالی تو اسکی رفتار
کافی سست پڑ گئی اور جب میں نے یہ دیکھا کہ
مجھے علانیہ ہاتھ سے آنے کا اشارہ کیا جا رہا ہے
تو میں نے اسکو واہمہ کا فریب خیال کیا مگر
مسلسل اشارے نے اس طلسم فریب کو توڑ کر
میرے ہاتھ پاؤں میں لرزہ پیدا کر دیا یا سیکل
کا اتنا اچھا سوار ہونے کے باوجود اس پر چڑھنا
مشکل ہو گیا، بمشکل تمام کچھ لڑکھڑاتا کچھ ترچھی
چال چلتا بگھی کے قریب پہنچ گیا اس وقت تک
بگھی ایک دروازے کے سامنے رک گئی تھی
اس تصور سے کہ میری محنت کا ثمرہ ملنے کو ہے
بلا مبالغہ میرا دل میرے سینے سے باہر نکل
پڑ رہا تھا اتنے میں بگھی کا پٹ کھلا اور سلام علیکم
معین کی آواز نے مجھے موت مارا دیکھتا
ہوں تو ہمارے پروفیسر ایوب صاحب بگھی
میں سے اتر کر گھر میں داخل ہو رہے ہیں
فضل نے اتنے قہقہے لگائے کہ اسکی آنکھوں میں
آنسو آگئے اور وہ ہنستا ہی رہا۔ میں نے
جھنجھلا کر کہا۔ یکے نقصان مایہ دیگر شماتت
ہمسایہ اسی کو کہتے ہیں۔
نہیں یہ بات نہیں میں اپنے پروفیسر کی
زندہ دلی کی دل ہی دل میں داد دے رہا ہوں،
کیوں نہ ہو فارسی تو ان کی گھٹی میں پڑی
ہوئی ہے۔ ایرانی مذاق ان کے دل و دماغ

پر چھایا ہوا ہے اور پھر علیگڈھ کی زندگی نہیں
پوراتر نده دل نبایا۔ معین کیا تم بتاسکتے ہو کہ
اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کیا کرتا۔
یہی کہ اپنی بھاری بھرکم تن و توش کے زعم
میں ایک جانثار سید کر کے اپنا بدلہ لیتے۔ ہرگز
نہیں قطعاً نہیں بلکہ پروفیسر کو اس قدر روز
سے گلے لگاتا کہ انہیں علیگڈھ یاد آتا اور مجھے
میری محنت کا صلہ مل جاتا اچھا یہ بتاؤ کہ تم
نے کیا کیا۔

میں کیا کرتا، وہاں سے میں اس تیز رفتاری سے
فرار ہوا کہ شاید میں نے بائیسکل کا عالمی ریکارڈ
قائم کیا ہے اہر وقت یہی خیال آتا ہے کہ وہ
پروفیسر بچہ میرا تعاقب کر رہا ہے اگر اس کا
بدلہ نہ لوں تو معین نام نہیں۔
ذرا ستا تو لو حواس درست تو کر و پھر ٹھنڈے
دل سے غور کر سکتے ہو کہ کیا کرنا چاہیے۔
سات میل کا راستہ سوچتے آیا ہوں اب سوچنے
کی گنجائش نہیں۔
معین کو بہت ہی براانگیختہ اور برہم دیکھکر
فضل نے سکوت اختیار کیا۔
دوسرے دن اول وقت فضل پروفیسر
ایوب کے کمرے میں داخل ہوا، پروفیسر صاحب
کو معلوم تھا کہ معین فضل کا گہرا دوست

اور ہم کمرہ ہے، فضل کو دیکھتے ہی وہ بے
ساختہ ہنس پڑے اور وہ فوراً سمجھ گئے
کہ یہ واقعہ کی اصلیت معلوم کرنے تشریف
لائے ہیں، فضل سے پروفیسر صاحب کو بے
تکلیفی تھی اس نے بلا تمہید کے کہنا شروع
کیا کہ میں آپ کے مذاق کی داد دینے آیا ہوں
مگر یہ تو بتلا ئیے کہ آپ کو گوشے پردے میں
ایسا طول طویل سفر کرنے کی ضرورت کیوں لاحق
ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے جواب دیا کہ
وہ سیدھی سادھی بات تھی میں اپنی بھاوج
کو آصف نگر میں بھائی کے پاس چھوڑ کر واپس
ہو رہا تھا تو میں نے کہا کہ اب چلیں کہاں اٹھاؤں
ویسے ہی بیٹھ جاؤں اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھر
پہنچ جاؤں، راستہ میں شامت کے مارے
آپ کے دوست کا ساتھ ہوا۔ دونوں
کے بے تحاشہ قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

براہ کرم تبدیل پتہ سے
دفتر کو اطلاع دیجئے

لمعات

نیر امرتسری

ذوق ہے یہ لذت بیداد کا — پوچھتے پھرتے ہیں گھر جلاد کا

تیرا شیدا کوستا ہے چرخ کو — یہ بھی اک اسلوب ہے فریاد کا

چھینتے ہیں بت مرا ایمان و دین — یا الٰہی وقت ہے امداد کا

سن کے وہ آمادۂ بیداد ہوں — مدعا یہ ہے مری فریاد کا

پر بھی ہیں اور طاقت پرواز بھی — بار ہے لیکن نمک صیاد کا

کیا خدا اب حاضر و ناظر نہیں — حشر کے دن کیوں ہے وعدہ داد کا

قتل کر کے بھی وہ پچھتائے نہیں — کیا کلیجہ ہے مرے جلاد کا

آسمان پیرواز ہے فکر بلند — فیض ہے جبریلؑ کے استاد کا

ڈھونڈتے ہیں آپ نیّر کو جناب
کیا ٹھکانہ خانماں برباد کا

خواب

حمید الدین ابو الفیض فخر

لندن سے واپسی کے بعد جامعہ اٹوپیا میں مجھے کیمیا کی پروفیسری مل گئی جب مجھے جامعہ میں کام کرتے ہوئے پانچ سال سے زاید کا عرصہ ہوگیا ہماری جامعہ میں تحقیقاتی کام کے لئے بہت سہولتیں، اعلیٰ سائنسی آلات اور اس کے ساتھ قابل اساتذہ بھی موجود تھے جن کے تحت اور نگرانی میں کام کرنا قابل فخر بات سمجھی جاتی ہے۔ ملک کے ہر گوشہ سے اور بیرونی ممالک کے طالب علم بھی ہماری جامعہ میں نظر آتے تھے۔

توسیعی تقاریر کے سلسلہ میں میں کسی اور جامعہ میں مدعو تھا وہاں میرے دیرینہ دوست پروفیسر کیمیا نے ایک طالب علم کی خاص طور پر سفارش کی کہ وہ میرے تحت تحقیقاتی کام کرنا چاہتی ہے میں نے اپنے ہم جماعت دوست کی گذارش کو بخوشی منظور کر لیا اور انھوں نے طالب علم کا تعارف دوسرے دن کرانے کا وعدہ کیا۔

میں پروفیسر موصوف کے مکان ہی میں ٹھیرا تھا دوسرے دن شام میں ایک لڑکی سے میرا تعارف کرایا گیا کہ یہی وہ ہونہار طالب علم ہے جس کو تحقیقاتی کام کرنے کی خواہش ہے۔ معلوم ہوا کہ رضیہ بانو نے اپنی تعلیمی زندگی میں ہر وقت درجہ اول میں امتحان کامیاب کیا ہے مجھے پہلے تو ذرا تعجب ہوا کہ ہمارے ملک کی لڑکی اور کیمیا میں تحقیقاتی کام کرنا چاہتی ہے مگر اسکے ساتھ ساتھ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ملک کی عورتیں بھی سائنس کے میدان میں اپنا حصہ لے رہی ہیں۔ اور میں نے وعدہ کر لیا کہ وہ ہماری جامعہ میں ضرور شرکت کر سکتی ہیں۔

جامعہ واپس ہونیکے بعد میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ایک روز صبح میں مجھے

ایک خاتون کے آنے کی اطلاع ملی - میں سمجھ گیا یہ رضیہ بانو ہی ہوگی - میں نے چپراسی کو کہا کہ انھیں کمرے میں بھیج دے سرسری بات چیت کے بعد جامعہ کا تجربہ خانہ اور تحقیقاتی کمروں کو تفصیلی طور سے دکھایا چند طالب علموں اور مددگاروں سے بھی تعارف کرایا جو ہمارے شعبہ میں تحقیقاتی کام میں مصروف تھے - رضیہ بانو کے چہرے پر خوشی اور رامنگ کے آثار موجود تھے - میں نے کل آنے کے لئے کہا جب کہ ابتدائی کام کے متعلق نظام العمل تیار کیا جائیگا -

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ رضیہ بانو کے والد فوجی افسر تھے اور انکا انتقال رضیہ کی کمسنی میں ہوگیا تھا والدہ جو گرلز اسکول کی صدر معلمہ تھیں وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں جبکہ رضیہ بانو - یم - یس - سی ابتدائی میں تھیں - رضیہ بانو کو سرکاری امداد ملتی تھی مگر میرے دوست جاوید نے اس ہونہار لڑکی کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا - جب رضیہ نے یم - یس - سی کا امتحان درجہ اول میں امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا تو جاوید کو خیال ہوا کہ رضیہ کو اور اعلیٰ تعلیم کیلئے ہماری جامعہ میں روانہ کرنا چاہیئے -

باقاعدہ تحقیقاتی کام شروع کرنے سے پیشتر بعض چھوٹے مسایل رضیہ بانو کے ذمہ کئے گئے جسکو بخوبی حل کیا اور اسی طرح وہ تجربہ خانہ میں ایک قابل مددگار ثابت ہوئیں - مجھے رضیہ بانو کی غیر معمولی دلچسپی اور مستعدی سے بڑی خوشی ہوئی - رضیہ بانو کے کام کی رپورٹ صدر شعبہ کے پاس روانہ کی گئی تو انھوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کی سفارش کی اور معقول وظیفہ بھی مقرر کیا - وہ ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کیلئے جو مسئلہ دیا گیا اسکے حل کرنے میں بہت منہمک رہیں اور مجھے نگرانکار پروفیسر مقرر کیا گیا - دو سال بعد رضیہ بانو کے مقالہ کی خاص ستائش کی اور جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر طلائی تمغہ دیا گیا اور یہ پہلی عورت تھی جو کیمیا میں ڈاکٹریٹ اور پھر خاص امتیاز سے حاصل کیا ہو مجھے رضیہ بانو کے اخلاق و کردار کا قریبی مشاہدہ کرنے کا کافی موقع ملا تھا اور مجھے کافی انس ہو چلا تھا کیونکہ وہ میرے ہی نگرانی میں تقریباً تین سال تک جامعہ میں تحقیقاتی کام کر رہی تھیں - میں نے اپنے دوست جاوید سے جو اس لڑکی کے ولی بھی تھے

اپنے دل کی بات کہہ دی جسکو انھوں نے بخوشی منظور کرلیا۔

رضیہ اب میری شاگردی کی بجائے میری رفیقۂ حیات بن گئی۔ اور ہم دونوں ایک ہی ساتھ تحقیقاتی کام انجام دینے لگے۔ میری تحقیقات ایک نئی دھات دریافت کرنے کی طرف سرتکز تھی۔ رضیہ کی مدد بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ اس نئی دھات کی تحقیق میں کافی عرصہ سے کام کر رہا تھا مگر نتیجہ صیفر ہی رہتا۔ میری ہمت بھی کچھ پست ہونے لگی لیکن رضیہ نے ہر مرتبہ میری حوصلہ افزائی کی اور تجربہ کو جاری رکھنے کے لئے عملی امداد دیتی گئی اور اس کی یہی مدد نے آخر مسیحائی کا کام کیا۔

پانچ سال کی مسلسل متفقہ محنت کے بعد ہم اسی نتیجہ اسکی حقیقت صرف خواب کی حد تک محدود ہے دھات کا جوہری عدد ۸۷ اور وزن جوہر ۲۲۵ ہے اور یہ گروہ دوم میں سوسٹ کے بعد پائی جاتی ہے۔ پہلے تو ہماری اس نئی دھات کے متعلق علمائے کیمیا کو تشفی نہ ہوئی کیونکہ اس ضمن میں ناکام تحقیقات ہوچکی تھیں۔ مگر ہمارے تجربوں کا تفصیلی مقالہ اور اعداد وغیرہ شایع ہونے کے بعد اس دھات کی تصدیق کردی گئی۔ اس دھات کا نام ہمارے ہر دلعزیز فرمانروا کے اسم گرامی سے (عثمانیم OSMANIUM) رکھا گیا۔

وہ کالی تھی

سلطان عالی

رات کا ایک بج رہا ہے فضا پر اداسی چھائی ہوئی ہے تارے اپنی آنکھیں ٹمٹما رہے ہیں مانو انہیں نیند آ رہی ہے۔ ساری دنیا محو آرام ہے لیکن میں جاگ رہا ہوں۔ اکیلا بیٹھا اپنی زندگی کے مستقبل پر غور کر رہا ہوں۔ میں آج کی رات نہیں سو سکتا۔ آج کی رات میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہوں ذرا سی چوک مجھے قعر مذلت میں دھکیل سکتی ہے۔ مجھے سوچنا ہے ہر پہلو سے غور کرنا ہے میں نہیں سو سکتا مجھے نہیں سونا چاہیے۔ اگر میں سو گیا تو یہ نیند میری موت کی نیند ثابت ہوگی۔ نہیں نہیں میں نہیں سوؤنگا۔ آج کی رات میری زندگی کا فیصلہ سنائے گی۔ اسی رات میری خوشی اور غم کا انحصار ہے۔

وہ کالی ہے!! اُف بھیانک رات سے بھی زیادہ کالی۔ اسی لئے تو آج کی رات مجھے اُس کی یاد دلا رہی ہے۔ کیا میں اُسے قبول کر سکونگا۔ اس نے جو خالی جھولی میرے سامنے پھیلائی ہے کیا میں اُسے پر کر سکونگا اپنا دل اُس کی نذر کر سکونگا ارے یہی تو مجھے سوچنا ہے آج کی رات لیکن۔ اگر میں نے ایسا کیا تو اپنی زندگی کی مسرت اور خوشی بھینٹ کرنی ہوگی۔ لیکن آخر کیوں۔ کالی چیز کو لوگ برا کیوں سمجھتے ہیں شاید اس وجہ سے کہ کالا رنگ بدی کا امتیازی نشان ہے۔ کالی رات کی تاریکی میں لوگ گناہ کرتے ہیں یہی تاریکی انہیں دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنا دامن گناہ کی آلائش سے آلودہ کر لیں دوسری طرف بلیک مارکٹ گو یہ بذات خود کالا نہیں لیکن خواہ مخواہ دل لفظ بلیک پر چمکتا ہے غریبوں کا خون چوسنے والا بلیک مارکٹ انسانیت کا جنازہ

بردار دوہ روں کی پرواہ نہ کرنے والا شیطنیت کا ایک ذلیل حربہ کیوں کیا اس لفظ بلیک نے
اُس کا تانیہ بدل دی ہے شاید اور بلیک روٹ بھی تو ہے۔ بلیک، بلیک، بلیک چاروں طرف
سے آوازیں آنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوراین میرا مذاق اُڑا رہی ہیں اُف میں پاگل
ہو جاؤں گا ہاں مجھے پاگل ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ میں اس جھنجھٹ سے آزاد ہو جاؤں گھڑی نے
دو بجائے اور ابھی میں سوچ رہا ہوں میرا دماغ آرام چاہتا ہے آج سگریٹ بھی تو دماغی سکون
کو واپس بلانے میں ناکام رہا ہے۔ وہ دیکھو وہ پھر میرے دماغ پر چھانے لگی وہ مجھے ہنس ہنس
کر لبھانے لگی وہ اُس نے انگڑائی کے لیئے ہاتھ اُٹھائے اور مجھے دیکھ کر لجا گئی لاحول ولا قوہ مجھے
آج باتیں رعور رعو لرکیوں یاد آرہی ہیں۔ شاید اُس میں اور رات میں کچھ مناسبت ہو یاں وہ
اسرارات کی طرح بڑی پُراسرار ہے۔

کیا میں اُسے شریک زندگی بناؤں میں پھر سوچنے لگا بنا تو سکتا ہوں لیکن وہ کالی
ہے ہر کالی چیز بری ہے۔ اور وہ بھی بری لیکن نہیں نہیں ایسا نہیں ہے۔ زلفیں جتنی زیادہ کالی ہوں
اتنی ہی قابل تعریف سمجھی جاتی ہیں۔ سیاہ آنکھیں ہندوستان کی خوبصورتی کا معیار ہیں معشوق
کے سیاہ تل پر لوگ سمرقند و بخارا بھی بخشنے کو تیار رہتے ہیں یہ بھی تو آخر کالی ہیں پھر کیوں نہ
میں اُسے پسند کرلوں وہ تو صرف کالی ہے مجموعی حیثیت سے بُری نہیں مگر... کالی رہنا بذات
خود گناہ ہے کالا آدمی۔ انگریز بھی تو ہندوستانیوں کو حقارت سے کالا آدمی کہا کرتے تھے
حقارت، مسلسل حقارت، مجسم حقارت نہیں نہیں میں اُسے نہیں قبول کر سکتا۔

کالے بال اور سیاہ آنکھیں دنیا پسند کرتی ہے اس وجہ سے کہ بال اور آنکھوں کی خوبصورتی
یہ ہے کہ وہ کالی اور سیاہ ہوں لیکن عورت!!!! ہاں عورت کے لیئے کالا ہونا ایک ناقابل
معافی گناہ ہے دنیا اس گناہ کو معاف نہیں کرسکتی۔ عورت کی خوبصورتی اُس کا گورا ہونا ہے
جزوی حیثیت سے اُس کے بال اور آنکھیں سیاہ ہوں لیکن وہ مجسم بلیک ہول آف کلکتہ نہ ہو۔

میں سوچ رہا تھا کہ دفعتاً میری نگاہ سامنے رکھی ہوئی سیاہی کی بوتل پر پڑی اُس پر لکھا
ہوا لفظ "بلیک" میرا منہ چڑانے لگا میں جھنجلا اُٹھا میں نے بوتل کا رخ پھیر دیا اور پھر سوچنے
لگا زندگی ایک مسلسل جدوجہد اور کشمکش کا نام مجھے بھی اپنی بقا اور خوشی کے لئے جدوجہد

کرتی ہے میں اپنی خوشی اُس لڑکی کے لئے تباہ نہیں کرسکتا میں مصمم ارادہ کرلیا اور نو پانچ بھی بج گئے میں خوش تھا مطمئن تھا میں ارادہ کرلیا کہ میں اُس بلیک ماہ جبین کی یاد کو اپنے دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دونگا میں مسکراتا ہوا اُٹھا لیکن دفعتاً ایک آواز آئی لیلیٰ بھی کالی تھی میں اُٹھتے اُٹھتے بیٹھ گیا اب در و دیوار مسلسل شور کررہے تھے لیلیٰ بھی کالی تھی مجنوں اُس کا عاشق آخر کیوں - میں لاجواب ہوگیا میری بوکھلاہٹ پر ساری کائنات مسکرا اُٹھی ستاروں نے اپنی آنکھیں جلد جلد جھپکنا شروع کردیا میں مجبور ہوگیا مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا میں پھر مجسم سوچ بن گیا تو کیا مجھے اُس حسینہ سے پیمانِ وفا باندھنا ہی پڑیگا نفظ "بلیک" اِس وقت نہ جانے کیوں میرے دماغ میں نہ آیا خیر میں اُسے قبول کرلونگا آخر اُس کا بھی تو ننھا سا دل ہوگا میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر اُسے قبول کرلونگا اور اُسے اپنے .....
ایک چھوٹی سی چوہیا میرے سامنے ناچنے لگی میرے وجود سے قطعی لاپروا شاید میرا بدمذاقی اور بدذوقی کا مذاق اڑانے آئی ہے ارے کمبخت وہ بھی تو کالی تھی میں جھنجلا اُٹھا میرے سارے خیالات رفو چکر ہوگئے میں زوردار آواز میں چیخ اُٹھا میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں لیکن ایک کالی عورت کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا کبھی نہیں یہ میرا آخری فیصلہ ہے پھر آواز آئی لیلیٰ بھی تو کالی تھی مجنوں اس کا عاشق تھا میں نے اطمینان سے لیمپ بجھاتے ہو کہا مجنوں بیوقوف ہوگا، اندھا ہوگا مجھے اُس سے کیا - مجھے اپنی زندگی پر اختیار ہے میری لیلیٰ کالی نہیں ہوگی -

خوش رنگ پرندوں کی آوازیں میرے لئے نیند کا پیام لیکر آئیں نسیم سحر کے جھونکے چلنے لگے اور مجھے نیند آگئی -

اہل قلم حضرات

اپنے مضامین صاف اور واضح خط میں روانہ کریں - ورنہ دفتر کسی غلطی کا ذمہ وار نہ ہوگا -

گھر دامادی

جناب حمد الدین صاحب

ہماری معاشری زندگی کے جہاں دیگر ہزار ہا خصوصیات ہیں وہاں "گھر دامادی" کی خصوصیت بھی آپ اپنی جگہ نمایاں ہے۔ یہ امر بڑا ہی مشکل ہے کہ اس خصوصیت کو ایک رسم قرار دیں یا محض ایک اتفاق۔ بہر حال "گھر دامادی" ایک بڑا دلچسپ عنوان ہے۔ آئیے اس کے چند پہلوؤں پر غور کریں۔

"گھر دامادی" کی نوبت ایک تو اس وقت آتی ہے جب کہ داماد "نہ گھر کا ہو نہ گھاٹ کا" لڑکی والدین پر بوجھ ہی تو ٹھیری۔ بے یار و مددگار داماد ہی سہی، بہر حال لڑکی کی شادی تو ہو جائیگی دنیا یہ تو نہ کہیگی کہ جوان لڑکی کو گھر بٹھائے رکھا ہے۔ اور پھر فلاں معتمد یا فلاں ناظم رشتہ دار جو ٹھیرے۔ آج لڑکا بیروزگار سہی مگر کل جو سفارش ہوگی تو دیکھتے ہی دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ جائیگا۔ غرض شادی ہو جاتی ہے۔ ادھر دولھا میاں خوش کہ ٹھکانہ مل گیا اور ادھر ان کا سسرال مطمئن کہ لڑکی کی شادی ہو گئی۔

اکثر بیویاں اپنے سسرال میں ساس سسر کی ماتحتی گوارا نہیں کر سکتیں۔ انہیں یہ پسند نہیں کہ ان کی آزادی کسی کی پابند ہو جائے۔ اور ادھر انکے شوہر ایسے کہ بیوی کے اشاروں پر بالآخر بیوی شوہر کو اپنے میکہ گھسیٹ لے آتی ہیں شوہر جو خوددار ہو (گو ایسا کم ہوتا ہے) تو بڑی شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ لیکن جو یہ نہیں تو سسرال کی خاطر مدارت کا تصور کر کے پھولا نہیں سماتا۔ پھر بعض تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو ذرا سی بات پر سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کی برابر خاطر نہیں ہو رہی ہے اور خاطر مدارات انکا حق ہے۔ بس کسی وقت روٹھ جاتے ہیں۔ دنوں

ہوٹلوں کی خاک چھانتے رہتے ہیں اور گھر نہیں آتے لڑکی کا معاملہ ہی تو ٹھیرا انہیں اس طرح ناراض کس طرح کیا جاتا ہے بالآخر منت سماجت کر کے انہیں گھر آنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ داماد صاحب موقع کو غنیمت جان کر جلد ہی مَن جاتے ہیں اور پھر وہ اور ان کا سسرال اور پھر وہی ٹھاٹ۔ ادھر انکے سسرال والے ان کی خاطر داریوں سے بیزار خاطر نہ کرو تو ایک مصیبت اور اگر کرو تو ایک اور جو سسرال پہلے ہی سے کثیر العیال ہو اور مصیبت اور اس پر تنگ دست ہوں اور غضب۔ غرض یہہ معاملہ بھی "الادو لد ادو" کا ہو جاتا ہے۔ ہمارے رسم و رواج کے تحت ایک تو بیٹی کی شادی کیا کم ستم کہ اس پر گھر دامادی۔ اس طرح بیٹی کا بوجھ نہ صرف قائم بلکہ اس میں داماد کا اضافہ۔

بعض مرتبہ جب شادی ہوتی ہے تو پہلی شرط گھر دامادی کی ہوتی ہے اس کی وجوہات پر غور کریں تو متعدد ہیں۔ مثلاً یہہ کہ لڑکے کو اپنے قابو میں رکھا جا سکے اور اس کے چال و چلن پر نگرانی رہے جہیز کا سامان دوسری جگہ منتقل نہ ہونے پائے بلکہ گھر کا گھر ہی میں رہے۔ ساس کے متعلق یہہ خبریں گرم ہوتی ہیں کہ بد مزاج ہے اور بڑی سخت۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس میں اور مصلحت اس وقت ہوتی ہے جب کہ مقامی نہیں بلکہ کسی دور دراز کے علاقہ سے گھیر کر لایا جاتا ہے جاگیر کا لالچ ملازمت کی امید، غرض ہر طرح کی رشوت دیکر اس کو گھر دامادی پر آمادہ کر لیا جاتا ہے اور اس طرح گھر دامادی کا سودا ہوتا ہے اور میاں داماد اپنا وطن اپنے عزیز و اقارب غرض سب کچھ چھوڑ کر بیوی کے قدموں پر پڑے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بعض بیویاں تو ایسی ہوتی ہیں جن کا ہاتھ گھر سنبھالنے کو نہیں ہوتا۔ کہاں ایک طرف بچوں کو سنبھالیں اور کہاں دوسری طرف باورچی خانہ کو۔ کیوں نہ میاں کو سسرال کھینچ لے چلیں حرص میاں پہلے تو پس و پیش کرتا ہے بالآخر بیوی کے ورغلانے میں آ ہی جاتا ہے اس طرح بیوی (مع بچوں) میاں کو سے میکہ اڑ جاتی ہیں۔

یہہ عجیب بات ہے کہ اکثر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے بعد لڑکے کو اپنے والدین کا بوجھ بنے رہنا گوارا نہیں ہوتا لیکن تعجب ہے کہ سسرال میں پڑے روٹیاں توڑنے پر شرم نہیں آتی اور نہ حجاب ہوتا ہے۔

گھر دامادی اکثر ایک تو لڑکے کے والدین کے لئے مفید ہو جاتی ہے اور ان کا مقصد پورا

ہوتا ہے یعنی بہو بیٹے کا بوجھ دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے اور دوسرے ساس بہو کی ناچاقی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے گو یہ ممکن ہے ظاہر نہ ہو ساس کو گمان ہونے لگتا ہے کہ بہو، بیٹے کو اس سے چھڑا کر الگ کر رہی ہے اور ادھر بیٹے سے یہ شکایت کہ چھوٹے سے بڑا ہوا ماں کے طفیل اور جب شادی ہوئی تو بیوی کی گانے لگا حیف ایسی اولاد پر۔ اس قسم کی فطرت کی بہتات ہے۔ ادھر شادی ہوئی اور ادھر میاں بیوی کے دیوانے اور اکثر محض اس بنا پر ماں باپ بھائی بہن سے بدگمان کے بیوی نے کان کچے کر دیئے داماد گو فطرت شناس قیافہ شناس سب کچھ ہوتے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں فوری اور صحیح رائے قائم کر لیتے ہیں لیکن جب بیوی کی فطرت پر نظر پڑتی ہے تو بے عیب ہوتی ہے خواہ دنیا اسکے متعلق کچھ ہی خیال کرتی ہو اور وہ درحقیقت کیسی ہی ہو۔ بہرحال بیوی کے گانے والوں کی کمی نہیں ان کے لیئے اس کا ہر استدلال بجا اور مشورہ قابل قبول ہوتا ہے اور اس طرح گھر دامادی کی اس کی رائے ہے۔

اکثر ساس سسر کی تمنا رہی ہے کہ داماد ان کے گھر پر رہے کہ اکلوتی بیٹی نظروں سے دور نہ رہ سکے۔ اس کے لئے ایک تو یہ صورت ہوتی ہے کہ ابتدا ہی سے لڑکے کو اپنے پاس رکھ لیا جاتا ہے یا پھر بعد میں بلا لیا جاتا ہے۔ ایک اور صورت یہ کہ اگر کوئی خوددار داماد اس پر تیار نہ ہو تو مختلف طریقوں سے اس کو مجبور کیا جاتا ہے چالیں چلی جاتی ہیں، بیٹی کو اشارہ کر کے داماد کو اکسانے پر تیار کیا جاتا ہے غرض کسی نہ کسی طرح اسکو مجبور کر کے گھر داماد بنا لیا جاتا ہے اس کی خاطر مدارت کی جاتی ہے اور بالآخر وہ اپنے گھر کی آسائشوں کو بھول جاتا ہے اور اس مصنوعی محبت کے دھوکہ میں آ کر سسرال ہی کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے محبت داماد سے نہیں بیٹی سے ہوتی ہے اور بیٹی کی بنا پر داماد کا خیال و لحاظ، محض اس رشتہ کی بنا پر جو شادی سے پیدا ہوتا ہے ورنہ ادھر اتفاق سے بیوی سے تعلق چھوٹا اور ادھر ساس سسر کی مہربانیاں ختم اور پھر وہی غیرت جو شادی سے پہلے تھی۔ اس حقیقت کے باوجود بھی آج داماد سسرال ہی کا ہو جاتا ہے یہ تھے گھر دامادی کے مختصر پہلو ورنہ یوں تو سینکڑوں ہیں۔ ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن یہ پہلو دلچسپ نہیں بلکہ اپنے میں معیوب حقائق رکھتے ہیں ضرورت ہے کہ ہمارے ملک سے اس بدترین رواج کو یک لخت اٹھا دیا جائے تنگ نظری اور پستی کی یہ بھی علامت ہے اس سلسلہ میں ضرورت ہے کہ ہم خود بھی اپنے آپ میں غیرت، خودداری اور احساس پیدا کریں۔ چاہیئے رضامندی سے ہو یا نارضامندی سے سسرال کو اپنی زندگی کا سہارا نہ بنائیں۔ بیوی کی اتنی نہ گائیں کہ اسکی برائی، برائی نہ معلوم ہو۔

محبت کیا ہے

جناب احمد علی صاحب قدوائی

ابھی میں یہہ سوچ رہا تھا کہ محبت کیا ہے؟

یہہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ مشکل - آسان ان کے لئے جو مجاز اور حقیقت دونوں سے واقف ہیں جو فن نفسیات کے طالبعلم ہیں اس لطیف جذبہ کے جوان میں صنف لطیف کی کشش سے پیدا ہوا ہو - مگر اس کشش میں بھی ایک راز پنہاں ہے وہ راز اتنا لطیف ہے کہ اسکو آسانی سے محسوس نہیں کیا جا سکتا - اسے محبت کہا جائے یا حسن سے تعبیر کیا جائے تو بجا ہے اس جذبہ کی خوبی یہہ کہ وہ انسان میں ایک جوش پیدا کر دیتا ہے جو جنون اور خود فراموشی سی کیفیت طاری کرتا ہے جہاں پر انسانی ہستی کا طلسم رکھا ہے یہی نسوانیت کا انداز و تغافل ہے - اس مقام پر عاشق شاعر اور فلسفی یہہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ معشوق کے جور و جفا تجاہل و تغافل یا بے اعتنائی جوشش محبت ہے۔

ہر فرد و بشر کو بالخصوص اس صدی میں عاشق ہونے کا حسن ظن پیدا ہو گیا ہے اور یہی حسن ظن ہر عاشق ہرجائی کو مجنون صفت یا فرہاد پیشہ بننے پر مجبور کر رہا ہے وہ یہہ نہیں سمجھتے کہ وہاں عاشق کے ساتھ معشوق کی بے پروائی، سنگدلی معراج محبت کی وجہ سے تھی اور یہاں بے اعتنائی، سنگدلی، لاپروائی عاشق ہرجائی کی جنون بننے کی خواہش پر نفرت سے ہے یا پھر کسی مقصد کے تحت بندہ - میں اس طول بحث میں جانے سے قبل ہی یہہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ محبت کسی مقصد کے تابع نہیں ہوتی ہوس کا اس میں عنصر ذرہ برابر بھی شامل نہیں رہتا مگر ہوس کو کبھی نکاح اور فی الواقعی نکاح سے جدا رکھے - بس اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ کہیں

محبت کی لطافت کی توہین نہ ہو جائے یا شیرینی مفقود نہ ہو جائے ۔

ہاں اس کی ابتدا کیفیات وجدانی یا خیالات کثیف سے ہوئی اور پھر اقبال کے اس مصرعہ کے مصداق

ع ہوس چھپ چھپ کر سینہ میں بنا لیتی ہیں تصویریں

کثیف خیال اور کیفیت میں بھی روح پیدا ہو جاتی ہے اور بہو کہ دینے والا تو دام فریب میں آجاتا ہے بس یہی محبت ہے ۔

جذبات شوق

تمنا عمرآبادی

ان کی نگاہ خاص جو یوں عام ہو گئی — اب زندگی بھی باعث آلام ہو گئی

برہم ہوئی جو زلفِ سیاہ دوش یار پر — ہر صبح مثل تیرگی شام ہو گئی

جوش شباب رہنے بھی دے اپنی چھیڑ چھاڑ — بیمار غم کی عمر لب بام ہو گئی

مجھ کو خمار بادہ کی حاجت ہو کس لئے — انکی نگاہ شوق ہی جب جام ہو گئی

سربستہ رازِ عشق نہ کیونکر ہو آشکار — خود ہی نگاہ ناز جو پیغام ہو گئی

انکے خرام ناز کا انداز ہائے ہائے — مہتاب کی روش بھی سبک گام ہو گئی

اللہ رے سرنگیندگی کائناتِ دل — انگڑائی لی جو آپ نے بس رام ہو گئی

صہبا پرست از ابد شب زندہ رہے — لغزش ہماری مفت میں بدنام ہو گئی

مجھکو مٹا کے انکی نظر خوش کہاں رہی — خود بھی اسیر گردشِ ایام ہو گئی

جذبات شوق اپنے ہوئے موجزن جہاں — سمجھا یہی کہ بارش الہام ہو گئی

فیضانِ عشق کیوں نہ تمنا کہیں اسے — دل کی خلش جو باعثِ آرام ہو گئی

غزل

جناب شاکر نائطی

کیجئے ہم سے درگذر مست و خراب جان کر
چوم لیا ہے آنکھ کو جام شراب جان کر

کار عبث اسے اگر کوئی کہئے تو کیا کہیں
ہم نے تو کی ہے عاشقی کار صواب جان کر

ذوق نوا سے آشنا بزم جہاں ابھی نہیں
کیا رگ جاں کو چھیڑئے تار رباب جان کر

سوء ادب تھا غیر سے ذکر نیاز عاشقی
میرے تو ہوش اڑگئے وجہ عتاب جان کر

آتش آہ گرم کی بے اثری تو دیکھئے
کھیل رہا ہے آسماں جسکو شہاب جان کر

غیر سے ہمکلام تھے آپ تو ہاں خطا ہوئی
میں نے جواب دے دیا مجھ سے خطاب جان کر

اپنی پسند کو بھی کچھ دخل ہے جبر عشق میں
ہم نے لیا یہ درد دل جان عذاب جان کر

ساقی میکدہ کو دیکھ شکوۂ دور جام چھوڑ
زہر کا بھی پیالہ پی بادۂ ناب جان کر

کھل بھی گئی تو ہر کلی پردۂ حسن ہی رہی
فکر کشود تھی ہمیں بند نقاب جان کر

اس کی بھی لاج رہ گئی فتنۂ حسن یار سے
حشر جو اٹھ کھڑا ہوا دور شباب جان کر

دیکھ کے زیست کا فریب سے گئے زیست کو خبر
ہم نے بھی آنکھ بند کی عالم خواب جان کر

قلب حزیں سے شاکر اب واسطہ کچھ نہیں ہمیں
گھر سے دیا نکال اسے خانہ خراب جان کر

بدحواسیاں

تحریری۔ تقریری۔ بدحواسیاں اکثر اوقات بڑی پر لطف ثابت ہوتی ہیں اور زندگی میں ہر انسان کو کچھ نہ کچھ اس سے سابقہ پڑتا رہتا ہے (اور یہ کوئی تعجب خیز مقام نہیں)۔ اور اس طرح مجلسیں نام میں بھی بڑی بڑی جدتیں ہونے لگی ہیں ایک صاحب نے اپنے نام شوکت علی میں کوئی کشش نہیں دیکھی چنانچہ ترقی پسند کی ریس میں اچھے خاصے نام کو سوکٹ نے بنا دیا۔

اس طرح اگر کلب علی کو (کلا بی) لکھا کرے تو ہمکو آپ کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا اگر ابراہیم جلیس کو (ابراہام جلیسوف) پکارے تو کوئی گنہ نہیں۔

غوث صاحب چچا کا ہو ٹو ہیا گا، اس جملہ کی طوالت سے گھبرا کر کسی نے یوں تصغیر کی (غچھوٹو ہیا گا) اسکی صحت اور اختصار میں ہنسی نہ آنی چاہیئے۔

اکبر کے دور کا بیاں، اس کو کوئی (اکبر کے۔ دو۔ رکا بیاں) پڑھے تو بتائیے یہ بے معنی تو نہیں ہوگا۔ دکھنیوں میں محاورہ ہے اگر تنخواہ بر آمد ہو جائے تو اوسکو کہیں گے (سرکار پر دو مہینہ کی تنخواہ چڑھی ہوئی ہے) اس کو کوئی قابل شخص بلیغ فارسی میں یوں ترجمہ کرے تو اوسکی لیاقت پر کوئی حرف کیوں آنے چلا (تنخواہ دو ماہ بندہ بر سرکار سوار شدہ)

اگر کوئی شخص رعب گانٹھنے کیلئے یوں کہے کہ (میں اونچا پورا آڑا چکلہ ہوں) تو آپ کی تصور میں اوس کے ڈیل ڈول قد و قامت کا نقشہ کھنچ جائیگا اگر جملہ کو کوئی یوں دہرائے (میں او نچا چکلہ آڑا ہوں) تو آپ کو بے ساختہ ہنسی کیوں آتی ہے۔

اکثر حضرات کو بغیر نکتہ لگائے لکھنے کی عادت ہے چنانچہ ایک تحریر تھی (دستہ کبوتر سہ حال) ایک کار فرما نے اس کو یوں پڑھا (دستہ کبوتر سہ جال) حالانکہ وہ عبارت

درحقیقت دسمبر اکٹوبر سنہ حال) تھی یوں بھی دیکھا گیا کہ ایک نے اپنے نام کا املا (بناب خان) لکھا دیکھنے والے حیران کہ املا آخر ہے کس نام کا دوسرے نے وضاحت کی یہ (نن یب خان) کا اختصار ہے

ورنہ صندوق کو (ص۔س۔ت) سے لکھا تو روزمرہ ہوگیا ہے جبکہ اس کی صحت کا ثبوت یوں دیا جائے صندل کی لکڑی سے ہو تو صندوق (ص) سے صحیح ہوگا اگر ساگوانی ہو تو (س) سے اگر دودیہ کا ہو تو (ث) سے

ورنہ کاتب کے لیے (نسوانی) کو (سوزانی) چکی کو (چسکی) جنگ جو کو (چنگیز) لکھ دینا ایک ادنا سا کرشمہ ہے —

نقش خلیل

کوہ سوار خلیل شاہپوری

اب نہیں تیرا حسن خو باقی — پھول تو ہے نہیں ہے بو باقی
دل نہیں ہے مگر جہاں دل تھا — ٹیس ہے ایک فتنہ خو باقی
مہر و الطاف کے وہ دن نہ رہے — یاد ہے ان کی ہو بہ ہو باقی
مجھ سے محشر میں چپ رہا جاتا — تیرے دامن پہ تھا لہو باقی"
آج وہ دن نہیں نہیں نہ سہی — یاد اب بھی ہے ہو بہ ہو باقی
آرزو تجھ سے تھی وفا کی کبھی — اب کہاں کوئی آرزو باقی

نہیں مایوس لطف تجھ سے خلیل
دل میں اب تک ہے آرزو باقی

خوش باش دے

جناب مرزا اشکو بیگ صاحب

جو کر سکتا تو اتنی التجا کرتا کبوتر سے
میں لاغر ہوں بجائے خط مجھی کو باندھ لے پر سے

کہا مجنوں کے گھر سے دوست نے لیلیٰ کے فادر سے
نسب کو چھوڑو عہد دیکھو شادی کر دو ڈاکٹر سے

غلامی کر کے ساری عمر یہ سیکھا ہے دفتر سے
خدا بگڑے بگاڑا جا نہیں ہے اپنے افسر سے

یہی نعرہ کبھی دل سے نکل کر دل ہلا یا تھا
مگر اب بیٹھ جاتے ہیں گلے اللہ اکبر سے

ترقی اس کو کہتے ہیں سگار اپنا جلانے کو
طلب کرتا ہے اب شاگرد ماچس اپنے ٹیچر سے

نظر اسکی کہیں ڈھونڈے سے بھی ملتی نہیں ہم کو
کہ فالوور ہمارے ویسے ہیں ہے شارٹ لیڈر سے

گھر بیٹھے بٹھائے حضرت مرزا یہ کیا سوجھی
ادھورے بن گئے لیڈر جو تم پورے پلیڈر سے

مریض کی ڈائری

جہاں بانو

مجھے کل شام ایک مذاق سوجھا۔ جھوٹ موٹ بھی اپنی مرنے کی خبر اڑا دی۔ کہ دیکھوں اس دھوم سے نکلتے جنازے میں کون کون شرکت کرتا ہے ؎

قتل کیے کا غصہ کیا ہے، لاش میری اٹھوانے دو
جان سے اپنی جا چکے ہم تو، آؤ تم بھی جانے دو!

کون کون آتا ہے۔ دوست تو دوست ہی ٹھہرے سنتے ہیں دشمن بھی جنازے میں شریک ہونا اپنا اسلامی فرض سمجھتا ہے۔ اس خبر نے جنگل کی آگ کی طرح پھیل کر بہت سوں کو کھینچ بلایا۔ ہم چادر تانے چپ چاپ ایسے پڑے رہے جیسے مردہ ہوتا ہے۔ کسی کو ابھی چہرہ دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی کسی کی آواز آئی۔ شاید انور تھا۔ جانے کتنی آرزوئیں کفن سے لپٹی ہوئی ساتھ جائینگی۔ کسی نے کہا۔ ایسا مرض تو نہ تھا جس نے یوں بیٹھے بیٹھے جان ہی لے لی۔ کسی نے مصرعہ معیسر شروع کی چپکے چپکے۔ کچھ کہے جاتے تھے۔ ظفر کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس کے دل کو سب سے زیادہ ہی ٹھیس لگی تھی۔ اس کو مجھ سے ایک عجیب سا خلوص تھا۔ میں کب تک دم روکے پڑا رہتا۔ چادر منہ پر سے میں نے سرکا دی۔ دم گھٹ رہا تھا۔ سب کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ کسی نے مجھے بھوت سمجھا۔ کسی نے سخت جانی شبابا کہا دی۔ دوستوں نے آکر لپٹا لیا۔ ظفر اب بھی چپ چاپ کھڑا تھا۔ مسرت کی ایک لہر اس کے اترے ہوئے چہرہ پر دوڑ گئی وہ خوشی سے جھوم گیا میرے پائنتی بیٹھ کر مجھ سے پوچھنے لگا یہ کیا حماقت تھی اس کی آواز مسرت و غم کے ملے جلے احساس سے بھرآئی تھی۔ مظہر ایک مباحثہ میں مجھ سے روٹھ گیا تھا۔ وہ بھی اس زندہ لاش کا تدفینہ

سمجھ میں آیا تو مجھے اپنی کامیابی پر ناز ہونے لگا ۔ کہ کیسے کیسے تپتے پانی ہو چکے ہیں ۔ کتنے دل میری
یاد میں دھڑکتے ہیں ۔ مجھے تو آج تک کسی سے دشمنی نہ ہوئی لوگ بیکار ہی مجھ سے خفا ہو جاتے
ہیں ۔ روٹھنے کو منانا تو آج تک مجھے نہ آیا ۔ بس یہی ایک ترکیب سوجھی تھی ۔ جو کامیاب ہی
ثابت ہوئی ۔ اور اسان باطنی کیفیت میں کہنے لگا تم نے شیشہ کو ٹھیس ہی نہیں لگائی بلکہ چکنا چور
کر دیا ہے ۔ میرا دل میرے قبضہ میں نہیں ۔ جانے کتنے دن لگیں اس کو سنبھلنے کے لئے ۔ تمہاری
موت نہ بسبب دشمنی کسی کے لئے ایک معمولی اور فطری واقعہ ہو تو ہو ۔ میرے لئے ایک
حادثہ ہے ۔ تم کو اس کا احساس نہیں جانے دو ۔ آؤ آج ہم عید منائیں ۔ تم نے نیا جنم لیا ہے
تمہاری زندگی میری زندگی ہے ۔ وہ کہے جا رہا تھا کہ راستہ پر ایک ہنگامہ کی آواز آئی سب
کی نظریں اس طرف متوجہ ہو گئے ایک مٹی کی لاری سے ایک موٹر سیکل کی ٹکر ہو گئی تھی
ان لاریوں کو تو ستھر خون معاف ہیں تا پھر کیا ہے ۔ کوئی مرے یا جیئے ۔ ان کی بلا سے یہاں
موٹر سیکل پرزے پرزے ہو گئی تھی ۔ سوار کا اس تصادم سے حلیہ بگڑ گیا تھا ۔ اسکے
پاؤں کی ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ۔ خون بہہ رہا تھا ۔ سر کو زبردست صدمہ پہونچا تھا ۔
راستہ پر دیکھتے دیکھتے ایک ہجوم ہو گیا ۔ یہ تو خیر موٹر سیکل ہے ۔ اس کو تو فٹ پاتھ پر چلنا
نہیں ہے ۔ راہگیر بھی تو راستہ پر فٹ پاتھ رکھتے ہوئے بھی اس شان سے چلتے ہیں ۔ جیسے یہ
ان کے اپنے گھر کا صحن ہے ۔ موٹروں کو آتا ہوا دیکھتے ہیں اور اس طرف سے اس طرف نکل جانے
کی کوشش ہوتی ہے ۔ نتیجہ یہ ہو جاتی ہے ۔ اب کون بتائے کہ قصور کس کا ہے کچھ دام کھوٹے کچھ
جوہری کا کھوٹا ۔ لیکن زیادتی عوام سے ہی ہوتی ہے کمبخت جاہل ہوتے ہیں ۔ عقل برائے نام
بھی شاید ان میں نہیں ہوتی ۔ جان کا خوف تو ہوتا ہوگا ۔ لیکن اپنی آن کا یوں بے ڈھنگا
اظہار بھی ہوتا ہے کہ جان پر بن جاتی ہے ۔ جب تک عوام راستہ کی ان بنی ہوئی پگڈنڈیوں
پر چلنا نہ سیکھیں گے اس وقت تک اس نوعیت کے حادثے تو ہوتے ہی رہیں گے ۔ اکبر الہ آبادی نے
شاید اسی کو دیکھ کر یہ نشتر لگایا ہے ۔

مجھ کو تو سب یہ کہتے ہیں کہ نیچی رکھ نظر اپنی
کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر!

پولیس کہاں تک ان کے ساتھ چل کر انھیں پاؤں پاؤں چلنا سکھا سکے گی۔ متمدن ممالک سے ہم اگر اپنے شہر کی اس تنظیم کا مقابلہ کریں تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد — !

کل مجھ سے ندیم ملنے آیا تھا۔ اس نے ایم۔ اے کیا ہے۔ اس پر بھی اسکو ملازمت نہ مل سکی۔ کسی بڑے آدمی سے اسکا رشتہ ہی نہیں۔ کیسے ملجائے غریب کو ملازمت۔ آخر تھک ہار کر اس نے ایک مختصر سی دکان کھول لی ہے۔ تجارت تو ہم مسلمانوں کا پیدائشی حق ہے لیکن فی زمانہ اس کا سہرا اغیار کے سر ہی رہا۔ وہ کامیاب ہوئے۔ اسلئے کہ وہ لین دین کے کھرے ہیں۔ جبتک جیب میں رقم نہ ہو وہ کسی دکان پہ سودا کرنے نہیں جاتے اور ہم ادھار کے عادی ہیں۔ حالت تو یہ ہے کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں [illegible] اور بازار چلے خصوصاً کوئی "اپنا" اگر سوداگری کا قصد کرے۔ تو ادھار زیادہ مزے آتے ہیں۔ آئے دن ضروری اور غیر ضروری چیزیں خریدیں۔ ظاہر ہے کہ دینے کا ابھی ارادہ نہیں۔ اکاؤنٹ میں لکھوا دیا ہے۔ اور اس اکاؤنٹ میں اتنی بے قاعدگی ہوتی ہے کہ انھیں کے دن جانتے ہونگے جنھوں نے اس نوعیت کی دکانیں کھول رکھی ہیں۔ اب سوداگر بغیر سرمایہ کے کس طرح مال منگوائے۔

ندیم نے بھی اسی قسم کی ایک دکان کھولی ہے۔ جہاں نقد کم بکتا ہے۔ ادھار زیادہ وہ اب رہزن کو دعا دیتا ہوا ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے۔ اچھا ہی ہوا

نہ لٹتا دن کو تو کیوں رات کو یوں بے خبر سوتا

چین سے نیند تو آتی ہے۔ اس کو اپنے دوست احباب کی بے [illegible] کی شکایت ہے کہ مال تو لیجاتے ہیں۔ لیکن رقم نہیں دیتے۔ واقعی ہم لوگ گرتے کو اور دھکیل کر لطف اٹھاتے ہیں۔ کسی گرتے کو کبھی سنبھالا نہیں کسی کو اپنے قدموں پر کھڑا ہوتا دیکھ کر کبھی خوش نہیں ہوتے۔ اپنے ہی فایدہ کی ہم کو سوجھ رہی۔ خواہ اس فائدہ میں دوسرے کا نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہ ہمارا شعار ہے۔ اور یہی ہمارا وقار [illegible]۔

نہ تو دیں کے لئے ہیں نہ جہاں میں

یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا!!

گناہوں کی طرح قرض بڑھتا رہا۔ دیکھیئے ایک دن یہ فاقہ مستی کیا رنگ لائے۔
غالب نے عارف کے مرثیہ میں اس پر ایک طنز بھی کیا ہے اخلاقی حیثیت سے بھی یہ شعر صدیوں تک زندہ رہیگا ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد وستد کے
کرتا ہے ملک الموت تقاضہ کوئی دن اور!

سودا نے خسیس اور بخیل کی تو ہجویں لکھی ہیں۔ لیکن اس موضوع پر اس نے کبھی قلم نہیں اٹھایا۔ ورنہ اسکی ہجو سے کچھ تو اصلاح ہو جاتی۔ نظم زیادہ موثر ہوتی ہے نثر کے دفتر دن پر بھی بھاری ہوتی ہے۔ لیکن پڑھتا کون ہے۔ جو پڑھتے ہیں ان سے اس قسم کی بہت بد تو اسیاں ہوتی ہیں۔ اور جو زندگی کا شغل صرف خرید و فروخت کی حد تک محدود رکھے ہیں۔ ان کو مطالعہ کی کہاں فرصت۔ صبح ہوئی اور "شاپنگ" کا نشہ چڑھا۔ خود خریدے۔ دوست احباب کی ضرورتیں پوری کردیں۔ مہینہ پر بل آتی ہے۔ تو سرکار سو رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ مہمان گئی ہیں۔ وہ کل ایسی ہوتی ہے جو آج تک کامیاب نہو سکی۔ یہہ قوم کیسے زندہ رہ سکتی ہے؟ احکام ربانی سے گریز۔ اور پھر دعوئے آزادی۔
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں۔

کوئی ہمارا نہ رہا

حمیدہ بانو

گرمی کا موسم ۔ رات کا وقت ۔ تنہائی کا عالم بھرپور چاند کا موسم آسمان پر تارے بکھرے ہوئے جیسے کسی ننھے شریر نے اپنی غلیل کے لئے مٹی کی گولیاں بنا کر سوکھنے کے لئے دھوپ میں بکھیر دی ہوں ۔ پھر ان گولیوں میں وہ روشنی کہاں جو ان تاروں میں جھلملایا کرتی ہے ۔ جیسے کسی حسینہ کے سلمہ ستارے ٹکے دوپٹہ پر روشنی پڑنے سے جوت پھوٹنے لگے ۔ سارے دن کے کام سے تھک کر میں پلنگ پر لیٹ گئی ۔ لیکن دماغی کام کے بوجھ سے اعصاب جھنجھنا اٹھے تھے اور نیند جیسے کہیں کھو گئی ۔ دماغ میں خیالات کا ایک ہجوم اٹھا اور اسی وقت دور کہیں کسی کے گانے کی آواز آئی ۔ ہاں پیاری ماں ۔ اور میرے تھکے ہوئے دماغ میں درد کی ٹیسیں سی اٹھنے لگیں ۔ ہائے ماں کیا ماں ایک ایسا لفظ ہے کہ اس کے لئے ہر جاندار ہستی تڑپا کرتی ۔

ماں ۔ میری ماں ۔ بعض وقت تمہاری یاد مجھے کچھ اس طرح بے چین کر دیتی ہے کہ آنکھیں گھنٹوں اپنی حسرت پر آنسو بہایا کرتی ہیں ۔ اور اس لمحے میں آنسو بھری آنکھوں سے تمہارا تصور کرتی ہوں تو ایک مدہم سی تصویر بنکر بگڑ جاتی ہے اور میں یاس و حسرت سے اس تصویر کے مٹتے ہوئے نقوش میں تم کو ڈھونڈتی رہ جاتی ہوں ۔ کیا یہی میری ماں ہے ۔ کیا میری ماں ایسی ہی ہوگی ۔ ہائے اللہ کوئی ڈھنگ کی شکل میری شعوری سطح پر نہیں ابھرتی ۔ جو تصویر تمہاری بنتی ہے اسے خود میرا تصور بگاڑ دیتا ہے ۔ ممکن ہے میری ماں ایسی تھی ہو ۔ اور پھر تمہاری تصویر میرا دماغ کیسے بنا سکتا ہے جب کہ تمہیں اس دنیا سے رنگ و بو سے گذرے ایک زمانہ ہوا ۔ سمجھ بوجھ کی راہیں بھی مجھے نہ ملی تھیں کہ تم تڑپتا روتا مچلتا چھوڑ گئیں ۔

مرنے والے مرجاتے ہیں اور تڑپنے والے شاید یوں ہی تڑپا کرتے ہیں۔ سوچتی ہوں یہ لوگ مرتے کیوں ہیں۔ پر ہائے رے یہ فنا اور بقا کی الجھن کس سے سلجھی ہیں۔ شاید سے

حیات راز سکون پا گئی، اجل ٹھیری
اجل میں تھوڑی سی لرزش ہوئی حیات ہوئی

یہ بات ہے۔ جب کبھی تمہارا ذکر سنتی ہوں تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے کاش میری ماں بھی زندہ ہوتی۔ اف میری قسمت کی بدقسمتی۔ میں نے کونسی غلطی کی ہے کونسا گناہ مجھ سے سرزد ہوا جسکی پاداش میں یہ سزا ملی کہ میری ماں کی گودی مجھ سے چھین لی گئی۔ اور اس وسیع دنیا میں یکہ و تنہا یاد حوادث کے تھپیڑے کھانے کے لئے چھوڑ گئیں۔

جب کسی کو ماں پکارتے سنتی ہوں تو دل بے اختیار تڑپ اٹھتا ہے۔ مچل جاتا ہے خود بھی ماں پکارنے کے لئے۔ مگر کس کو پکارے۔ کسے اس پیارے سے لفظ سے مخاطب کرے۔ کاش میں اس لفظ کو پکار سکتی۔ مگر نہیں ستم کیا گیا۔ لفظ ماں کو بھی ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب ماں کسی کو نہیں پکار سکتی۔ میری ماں مجھ سے چھین لی گئی یہ شوریدہ سر دل بے اختیار ہو اٹھتا ہے۔ اور دل میں یہ تمنا تڑپ جاتی ہے کاش ایک ہی دفعہ ماں کہکر پکاروں۔ پر ہائے رے یہ تمنا۔ جب تم ہی نہ رہیں اماں تو پھر کون کسی کا۔

کوئی ہمدم نہ رہا کوئی سہارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا

ہم تو کہتے کہتے عاجز آ گئے آپ کی تغافل شعاریوں کا وہی عالم ہے کیونکہ چندہ ختم ہونے کی اطلاع ایک مہینہ پہلے دی جاتی ہے کہ اس عرصہ میں آئندہ کیلئے آپ تصفیہ کریں لیکن کوئی توجہ نہیں کی جاتی اور وی پی بلا تکلف واپس کر دی جاتی ہے آخر کب تک ہم آپ کے ان تغافل شعاریوں کا شکوہ کریں

سورت کی شادی

عائشہ نکہت

تمہارے وہ تیز جملے جب کبھی یاد آتے ہیں ایک محویت سی چھا جاتی ہے کھو سی جاتی ہوں ان میں — کچھ تو حقیقت ہوگی ہے نا! بے خود کو میری دعائیں دو۔ اسی اختیاری حالت میں اپنا کیا قصور جانتی ہو نا ہار میں جیت ہوتی ہے یوں ہی سہی! ہاں میں خطا شعار سہی — ورنہ سہی کیا کہا یہ تمہارا خواہش — ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" اسی کے سہارے ہی تو زندگی کی ناؤ آگے بڑھ رہی ہے۔ تاحال تمنا نت نئی خواہش پوری ہوتی ہی جائیں تو پھر رہ کیا جائے گا زندگی میں تمہاری — بلکہ انسانیت کا تقاضہ تو یہ ہے —

اُسے جو سے آب بشکر ہو دریا تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کٹھن راہیں بے پناہ تلخیاں ہی تو زندگی کو اُجاگر کرتی ہیں پگلی — اچھا تو سنو پچھلی گرمیوں میں سورت کا پروگرام تھا بابا کے عزیز دوست کے بیکوتے صاحبزادے کی شادی کا — بس یہی لفظ شادی ہی تھی جو مجھے وہاں جانے سے روک رہی تھی۔ اور کچھ نہیں جانے کیوں یہ لفظ شادی سے مجھے نفرت و اسطہ کا بیر ہے وہ طوفان خیز ہنگامہ ، رنگ برنگی آوازیں ، وہ زرق برق لباس ایک نہیں بھاتے مجھے — پر مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے نا بہر حال ایک سہانی صبح ہم بمبئی کے اسٹیشن پہنچے سورت کو جانے والی گاڑی شام کے ۵ بجے ملتی تھی اس لیے تمام دن بمبئی میں ٹھہرنا لازمی تھا۔ وہ ہنگامہ آرائیاں وہ چہل پہل وہاں کی کچھ دیر بھلی معلوم ہوئیں لیکن جوں جوں دن گزرتا جا رہا تھا مجھ سے دل بھرتا جا رہا تھا

خدا خدا کر کے "سورت" کو جانے والی گاڑی میں سوار ہوئے ابھی کچھ دیر گذری تھی کہ ہوا کے
خنک جھونکوں نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ صبح جب آنکھ کھلی ہے تو بس ایک ہنگامہ
تھا ہر ایک کمپارٹمنٹ سے اترنے کی سعی میں مشغول۔ یہہ تھا "سورت" کا اسٹیشن دلہن والوں
کا گاؤں (KATHORE) یہاں سے کچھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہہ ایک نہایت ہی
اچھی جگہ ہے۔ میں اُسکی شادابیوں میں شادی کی تلخیوں کو بھول سی گئی۔ یہہ چھوٹے سے گاؤں کے
بسنے والے نہایت ہی ملنسار اور خوش مزاج ہیں۔ ہر چیز پر یہاں کی ایک انوکھاپن ہے۔ ایک
دلفریب رنگینی!! خصوصاً ندی "تاپتی" کا شفاف لہراتا ہوا بہتا ہوا پانی کبھی بھی نہیں بھلایا
جاتا۔ وہ جوش و خروش کے ساتھ ایک نامعلوم منزل کی طرف بڑھی چلی جارہی ہے یا بعض وقت
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک حسین شہزادی نزاکت کا جامہ پہنے اپنی پوری شان و شوکت کے
ساتھ ایک مستقل عزم لئے بڑھ رہی ہو۔ میں مچل سی جاتی اس کو دیکھکر میرا زیادہ وقت اسی کے نذر
ہوتا۔

جس دن سے ہم کٹھور گئے تھے ہمارا اہتمام انتظام دلہا والوں کے سر تھا۔ یہہ رعایت صرف
ہمارے ہی ساتھ نہیں تھی بلکہ یہہ وہاں کا قاعدہ ہے۔ پردہ وہاں نام کو نہ تھا۔ شادی میں
پانچ روز اور باقی تھے آئے دن کچھ نہ کچھ رسومات ہوتے رہتے تھے۔ لیکن ان رسومات کو زیادہ
تر دلہا والے ہی انجام دیا کرتے تھے۔ اور دلہن والے ان سے بالکل بری۔ دوسری بات یہہ
ہے کہ دلہا والے ہی جس قدر امکان میں ہے دلہن کو زیور کپڑے اور نقد روپیے وغیرہ دیتے
ہیں لیکن دلہن والوں کو یہہ لازمی نہیں ان کی اپنی مرضی پر منحصر ہے دیں یا نہ دیں کتنی اچھی ہے یہہ رسمت
[illegible] کاش گھر گھر میں یہہ رائج ہوتی۔ تو والدین کو اپنی بیٹیوں کی شادی میں اتنی دقتیں
پیش [illegible] ہیں۔ جن سے کہ ان کی زندگیاں تلخ ہوکر رہجاتی ہیں۔ شادی کے ایک روز پہلے "مایوں"
کی رسم تھی [illegible] کا مکان مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور دلہن۔ زرین سبز ساڑی میں
ملبوس اپنی ان گنت سہیلو[illegible] بیٹھی اور باتوں میں مصروف۔ یہہ دیکھکر دلہا کی والدہ
ماجدہ کا رنگ فق ہوگیا۔ ٹھیک ہی تو [illegible] بھلا وہ بے چاری کاہے کو دیکھنے چلی تھی ایسی دلہن
غرض کہ [illegible]ی کا وہ مبارک دن بھی آگیا جس [illegible] یہہ سب تیاری ہورہی تھیں۔ گاڑیاں وہاں

تمام کو نہ تھیں اس لئے مہمان عورتیں چھوٹی چھوٹی گلیاں پار کر کے دلہن کے مکان پر پہنچ جاتی تھیں۔ تین بجے کے قریب دلہا کی دو بڑی بہنیں چند دوسری عورتوں کے ساتھ زیور کی تجوری لئے دلہن کے گھر پہنچ گئیں دلہن کی والدہ کو وہ تجوری دے کر واپس آگئیں۔ پھر گاؤں کی چودہ پندرہ برس کی لڑکیاں ایک ایک کپڑوں کے جوڑوں کا تھالہ لیئے خراماں خراماں باجوں کے سائے میں گشت کرتی ہوئی دلہن کے مکان پر پہنچ گئیں۔ تقریباً تعداد میں پچاس تھالے تھے اس کے بعد دلہا کی دو چھوٹی بہنیں سفید پھولوں کی چادر جس میں گلاب کے سرخ پھول ٹکے تھے اور جس کے بازوں پر زرین گوٹہ لگا تھا اوڑھ کر آئیں۔ دلہن وہ نیلے زرین کپڑوں میں آسمانی حور سے کم نہ تھی اس کی وہ رسیلی شرمیلی آنکھیں کاہے کو تبدیل ہونے چلی تھیں!! دلہن بات بات پر کھل جاتی تھی۔ کیوں نہ کھلتی شادی کے معنی خوشی کے جو ہیں۔ آخر کار ۷ بجے کے قریب نکاح ہو گیا۔ نکاح کے ہوتے ہی مبارک باد کی صدائیں گونجنے لگیں۔ اور سب دلہا والے اپنے مکان واپس آئے پھر دلہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنی محترمہ خوشدامن صاحبہ کو سلام کی غرض سے آئیں اور سلامی لیکر چلی گئیں۔

رات کے کوئی بارہ بجے ہونگے تمام دلہا والے کھانا وغیرہ سے فارغ ہو کر دلہن کے مکان پر تھے تاکہ محفل رقص و موسیقی میں شریک ہوں۔ ایک بات بڑی دلچسپ تھی نہ کسی کو دلہن کی فکر تھی اور نہ دلہا کی۔ ہمیں رقص و سرود میں اس وقت کیا مزہ آتا۔ دلہن کے رنگین تخیل نے ہمیں وہاں سے اٹھنے پر مجبور کیا خیر تیز تیز قدم بڑھاتے دلہن کے کمرے میں جو پہنچے تو وہاں دلہن حسب معمول سادے کپڑوں میں ملبوس حتیٰ کہ چوڑیاں تک غائب اپنی چند مخصوص سہیلیوں کے ساتھ خواب راحت کے مزے لے رہی تھیں دلہن اس وقت تک دلہا کے گھر نہیں آتی جب تک کہ وہ دلہا والوں کے ساتھ یکسانیت نہ محسوس کرلے کس قدر اچھا ہے یہ طریقہ! یہ ادا تو سورت والوں کی مجھے بے حد پسند آئی۔ لیکن رونا نہ! اپنے یہاں کی دلہن جانے کونسا جرم کی تھی بے چاری جس کی سزا میں اس کو ایک لال گٹھری میں لپیٹ کر ایسی بھنور میں گھری کشتی میں چھوڑ دیا جاتا ہے جس کا کوئی ملاح ہی نہ ہو شادی کے دوسرے روز دلہا والوں کا یہ کام ہوتا ہے کہ دلہن کی جتنی بھی سہلیاں ہوں ان سب کو مٹھائی کھلائیں جن کے ساتھ دلہن بھی ہوتی ہے مٹھائی کھا کر وہ سب اپنے گھر چلی جاتی ہیں لہذا سسرال جانے کا دار و مدار صرف دلہن کی اپنی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ ایک دلچسپ بات سنو دلہا والوں کے

مختلف اعتراضات نے دلہن کو آنکھیں بند کرنے پر مجبور کیا وہ معصوم چپ چاپ آنکھیں بند کیئے بیٹھی تھی۔ کہ کسی نے ازراہ ہمدردی آہستہ سے کہا کہ بیچاری دلہن کو گرمی ہو رہی ہوگی بس یہ سننا ہی تھا کہ دلہن جھٹ سے گھونگھٹ الٹ مسکرانے لگی اس پر دلہا والوں کا جو کچھ حال ہوا سو ہوا لیکن ہم تو ہنستے ہنستے نڈھال سے ہو گئے۔

پسند آئی تمہیں سورت کی شادی! ڈر ہے کہیں اسکی بھول بھلیاں میں گم نہ ہو جاؤ۔
تمہاری وعدہ ادھوری آرزو کا ایک حصہ پورا ہوا اور دوسرا پھر کبھی۔

حسن بیمار

کیا نباہی آگئی ہے حسن پر
ایک گل کا نزا ہوا ہے سوکھ کر

ہاتھ پاؤں سے نقاہت ہے عیاں
کہنیوں تک جارہی ہیں چوڑیاں

عارض رنگیں میں تابانی نہیں
ماہ میں یعنی درخشانی نہیں

آتشیں رنگت ہوئی ہے زرد سی
دن کو ہو جیسے دیئے کی روشنی

تو جھلس دے پنکھڑی کو جس طرح
تپ سے ہیں سب ہونٹ ہو گئے اطرح

وہ چمک آنکھوں کی بھی اب کھو گئی
واقعی بیمار نرگس ہو گئی

آنکھ سے غائب ہیں کاجل کے نشاں
تیر سے اس وقت ہے خالی کماں

اس قدر کڑوی دوا پینا پڑی
کہ لب شیریں پہ تلخی آگئی

ڈاکٹر صاحب نے انجکشن دیا
ایک کانٹا سا رگ گل میں چبھا

منتشر ہیں چار سو تکیے پہ بال
جس طرح سے ہوں پراگندہ خیال

ہیں حواس خمسہ سارے منتشر
آنکھ ہے لیکن کسی کی منتظر

حسن بیماری میں بھی کب ماند ہے
بادلوں میں بھی منور چاند ہے

وحیدہ نسیم۔ بی۔ ایس سی عثمانیہ

یہ شیطان

ساجدہ احمد محی الدین

پتے سرسرانے لگے اور میں نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ نانی اماں بھی عجیب ہیں اس بیسویں صدی میں پندرھویں صدی کی باتیں کرتی ہیں۔ فلاں قصر میں شیطان تھا۔ اُس جنگل میں جن رہتے تھے۔ فلاں مرشد نے بلیوں کے روپ میں جن پال رکھے تھے۔ اور واقعی مجھے اب اپنی سفید ریشمی بالوں والی بلی بھی جن ہی نظر آنے لگی۔ خدا جانے یہ جن کن کن کے روپ میں بستے ہیں ہمارے بھی نانی اماں تو کہتی تھیں کہ ان میں بڑی طاقت ہوتی ہے وہ جس کا بھیس چاہے بھر لیں جس جگہ چاہیں پہنچ جائیں۔ ایک قدم مشرق میں رکھیں تو دوسرا مغرب میں ڈال دیں۔ بلا کی قوت ہوتی ہے شیطانی قوت۔ اللہ بچائے ان شیطان کی مار سے خدا نہ کرے جو مجھے بھی نظر آجائیں۔ اف اللہ۔ میں نے سب طرف نظر دوڑائی کہیں اس گھپ اندھیرے میں کوئی جن یا شیطان تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ یہ کمرہ۔ یہ کالی کالی ناگن جیسی رات اس ناگن نے اپنی سیاہ زلفوں میں سب کچھ لپیٹ رکھا ہے۔ ساری کائنات چھپالی ہے۔ کہتے ہیں گرگٹ کے پیٹ میں بھی شیطان رہتا ہے جب ہی تو انسانی آنکھوں جیسی چمک اس کی آنکھوں میں ہوتی ہے پتے سرسرانے لگے۔ چر چر۔۔۔ چر چر۔ دور صحن میں بندھی ہوئی بھینس کے چھپر پر کوئی کود پڑا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں پہلے ہی یہ خاموش سکوت اور اندھیرا اور اب تو آنکھیں بند ہوتے ہی بھیانک بھیانک تصویریں پردہ چشم پر گھومنے لگیں۔ یہ دیکھتے ہی دیکھتے لوٹ پلٹ کر عجیب ڈراونی شکل میں تبدیل ہو گئی کمرہ اور کمرہ کی ہر چیز بدلنے لگی۔ میز، کرسی، ڈریسنگ ٹیبل، الماری سب دیو ہیکل کالے کلوٹے شیطان بنے منہ چڑانے لگے۔۔۔ ہی ہی ہی۔ ہا ہا ہا۔ کمرہ کے در و دیوار مجھ پر قہقہہ لگا رہے تھے۔ میں نے

گبھرا کر آنکھیں کھول دیں۔ مشرقی دریچے سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے شروع ہو گئے۔ میں نے دریچے کے باہر غور سے دیکھا کہ کہیں سفید سفید جن جیسی چیز تو نہیں ہے۔ مگر وہاں تو حد نظر تک اندھیرا بھیانک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کمبخت چاندنی بھی تو ٹھیک نہیں جاتی۔ نانا ابا سنتے ہیں چاندنی ہی میں جن اپنے سفید لباس میں صاف نظر آجاتے ہیں اور یہ شیطان اندھیری راتوں میں۔ میں اس سے زیادہ کچھ سوچ نہ سکی۔ دماغ میں مختلف قسم کی شکلیں بن رہی تھیں۔ بلی نما کتا، مچھلی نما انسان، جس کا آدھا جسم انسان کا اور آدھا مچھلی کا۔ اور وہ کا بک سے نکلے ہوئے کبوتر ٹپاپٹ ٹپاپٹ لوٹ لوٹ کر کالے کلوٹے، لمبے لمبے دانتوں چوڑے چھکلے ہاتھوں، شعلہ جیسی آنکھوں اور الٹے الٹے پاؤں جیسے شیطان بن رہے تھے۔ اور پھر پٹ پٹ ٹپا کی آواز نے دل کی دھڑکن کو تیز تر بنا دیا۔ سوچا للو کو چیخیں مار کر اٹھا دوں کمبخت کس بے فکری سے پڑی خر خر خراٹے بھر رہی تھی جیسے گھوڑے بیچ کر سو رہی ہو۔ جی چاہا کہ سب کو جگا کر کے لمبی لمبی ڈکاریں مارے۔ دل چاہا کہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخوں اور سارے گھر خصوصاً نانی اماں سے کہہ دوں کہ مجھے ان شیطانوں اور جنوں کی لعنت سے بچا لیں مگر سب کچھ بیکار الفاظ جیسے حلق میں پھنس گئے جسم پر پھریری آنی شروع ہوئی۔ وہی آواز بار بار کانوں میں گونجنے لگی پٹ پٹ ٹپا۔ ادھر غسل خانہ میں کوئی صراحی سے پانی انڈیل رہا تھا اب تو میرا دماغ چکرا گیا ایک دفعہ نانی اماں کے غسل خانہ میں بھی کسی شیطان نے سارا پانی انڈیل ڈالا تھا۔ بس میری روح فنا ہی تو ہو گئی بے اختیار زبان سے نکلا شیطان۔ جن شیطان۔ میں مسلسل چیخ رہی تھی۔

"کیا ہوا رنو" بھائی نے میرا کاندھا پکڑ کر ہلایا۔ میرے دانت بج رہے تھے۔ سارا جسم برف ہو رہا تھا۔ اور میں مسلسل چیخے جا رہی تھی۔ شیطان تھوڑی دیر میں سارا گھر جاگ اٹھا اور میرے اطراف حلقہ بندھ گیا۔ جب ذرا ہوش آیا طبیعت سنبھلی تو میں نے سارا قصہ بیان کیا اس پر بھائی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"الو بس اتنی سی بات تھی۔ ارے بیوقوف میں تو ابھی سیکنڈ شو سے واپس آ کر غسل خانہ میں پانی پینے گیا تھا۔" اور پھر ایک مسلسل قہقہہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ بھیا نہیں ہیں کوئی جن یا شیطان ہے جو بھیا کے روپ میں مجھ پر قہقہہ لگا رہا ہے۔

پخت و پز

آپ کے لب و دہن کے ذائقہ کے لئے دو ترکیبیں ایک میٹھا اور دوسرا نمکین پیش
ہے بشرطیکہ آپ بھی اپنے تجربات بھجواتی رہیں — ناہید

تاس کباب گوشت — آلو — ٹماٹر — پیاز — گھی — کالی مرچ کا سفوف —
پاؤ سیر — ۱۰ تولہ — ۱۰ تولہ — ۵ تولہ — ۱۰ تولہ — چمچہ چائے۔
کباب چینی کا سفوف — شاہ زیرہ — ادرک لہسن پیسا ہوا — الائچی — زعفران
نصف چمچہ چائے — نصف چمچہ — ایک چمچہ — ۸ عدد — حسب ضرورت

ترکیب — پہلے گوشت کو دھو لیا جائے — ادرک لہسن لگا کر تھوڑی دیر رکھ دیں — آلو — پیاز ابالیں
چھیل کر گول پہانکیں کاٹ لیں نیز ٹماٹر پیاز کو بھی تراش لیں — پھر گھی چوڑے منہ کے پتیلہ میں ڈ
جب اچھی طرح گرم ہو جائے تو اتار لیں — پھر گوشت میں نصف چمچہ سیاہ مرچ کا سفوف ملا دی
اور گھی کے اوپر گوشت کے قتلے جما دیں پھر ٹماٹر کی ایک تہہ دیں اور سیاہ مرچ بھر برا دی
اسی طرح سب اشیا تہہ بہ تہہ جما دیں البتہ آلو کی تہہ سب سے اوپر رہے پھر نصف سیاہ مر
چھڑک کر نیچے اوپر دھیمی آگ سے دم دیں۔

دم کی مغزیات میدہ — گھی — کھوپرا — بادام — پستہ چرونجی — کشمش — الائچی
۲۰ تولہ — نصف سیر — ۱۰ تولہ — ۱۰ تولہ — ۵ تولہ — ۵ تولہ — تولہ
مغز خربزہ — مغز تربوز — مغز کدو — مغز اخروٹ — مغز چلغوزہ
۲ تولہ — ۱ تولہ — ۲ تولہ — ۲ تولہ — ۲ تولہ
مغز کاجو — شکر — جملہ مغزیات کو ہم وزن شکر کرکے ان سب کو ایک جان کر کے آپ تنگ برتن میں دم دی
۲ تولہ

امکبنہ آرٹ پرنٹنگ پریس

۲۱/۴/۸/۷/۱۳۵۷

شہاب

جلد ۱۶ تیر سنہ ۱۳۵۷ف م مئی سنہ ۱۹۴۸ء نمبر ۸

مرتبہ

چندہ سالانہ محمد عبد الرزاق بسمل (صہ)

غزل

جناب مسلم

مرا مژدۂ وصلِ یار آمده
بشاخِ دلم برگ و بار آمده

چو آن فتنۂ روزگار آمده
تغییر بہ لیل و نہار آمده

بہ باغِ دل زارِ من عاقبت
نگارم چو جانِ بہار آمده

تغافل ازین بیشتر خوب نیست
حیاتم چو رقصِ شرار آمده

چہ شور است در مذہبِ صوفیاں
مگر مسلمِ بادہ خوار آمده

پہلی جنگ عظیم سے قبل

(بسلسلۂ اردو ہفتہ)

جناب مرزا احسن بیگ صاحب سابق جج ہائیکورٹ

یورپین اقوام کی دست درازیوں سے چین میں بڑا ہیجان پیدا ہوگیا۔ نفرت کی آگ اس قدر بھڑکی کہ چینیوں نے یورپین لوگوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ دیسی عیسائی بھی مارے گئے یورپین اقوام کے لئے یہ بہانہ بہت اچھا تھا۔ فوراً اس سے مستفید ہوئے۔ چین کے دارالحکومت پیکنگ میں جب یورپین سفارتوں پر حملہ ہوا تو ایک متحدہ یورپین فوج نے چڑھائی کی۔ سفارت خانوں کو بربادی سے بچانیکے علاوہ بیش قیمت دولت بھی لوٹی۔ یہ واقعہ ۱۹۰۰ء کا ہے۔ چار سال بعد روس نے منچوریا پر عمل دخل کر لیا اور انگلستان نے تبت پر چڑھائی کی۔

جاپان = جاپان ایک زمانہ سے گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ سولہویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانہ میں سب سے پہلے کچھ پرتگالی وہاں پہنچے اور عیسائی پادریوں نے تبلیغی کام شروع کیا۔ جاپانیوں نے گرمجوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ تبلیغی اور تجارتی کاروبار میں کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ مگر بہت جلدی جاپانیوں کو محسوس ہوگیا کہ یورپین اقوام دوستی کے لائق نہیں ہیں۔ دیسی عیسائیوں نے غرور اور گستاخی کا نمونہ پیش کیا۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یورپین آپس میں رقابت رکھتے ہیں۔ اور عیسائیوں میں متعدد فرقے ہیں جو ایک دوسرے کی جڑ کاٹتے رہتے ہیں۔ جاپانیوں کی نفرت کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپین اقوام کا داخلہ جاپان میں بند کر دیا گیا دو سو سال تک جاپان دنیا سے الگ رہا۔ نہ تو کوئی جاپانی ملک سے باہر جا سکتا تھا اور نہ کوئی یورپین وہاں قدم رکھ سکتا تھا۔ اس قانون کی پابندی ا۔۔۔ اسقدر سختی کیساتھ ہوتی تھی کہ کوئی جاپانی ایسا جہاز نہیں بنا سکتا تھا جو دور دراز کا سفر کر سکے۔

جاپان پر یورش = ۱۸۵۳ء میں دوبارہ جاپان پر یورش ہوئی چار امریکن جنگی جہاز حدود ممنوعہ میں کئی روز تک کھڑے رہے۔ تجارتی گفت وشنید کامیاب نہ ہوسکی۔ دوسرے سال دس امریکن جہاز اسٹیم سے چلنے والے پہنچے ان پر بڑی بڑی توپیں لگی ہوئی تھیں۔ اس جدید نوعیت کے جہازوں نے جاپانیوں کو بہت مرعوب کیا۔ پانچ سو امریکن ساحل پر اترے اور جاپان کیساتھ معاہدات تحریری حاصل کر لئے پھر تو انگریز۔ فرانسیسی۔ اور ڈچ لوگ بھی پہنچنے شروع ہو گئے۔ روس نے بھی ڈورے ڈالنے شروع کئے ۱۸۶۵ء میں ایک ناخوشگوار واقعہ نے یورپین اقوام کو مداخلت کا موقعہ دیا۔ شمونوسیکی کے ساحل پر کچھ غیر ملکی جہازوں پر گولہ باری کی نتیجہ اس اشتعال کا یہ ہوا کہ ایک مشترک بیڑہ۔ انگلستان فرانس۔ ہالینڈ اور امریکہ کا پہنچ گیا۔ سب نے ملکر گولہ باری کی اور جانی نقصان بھی پہنچایا اسوقت جاپان کمزور تھا مجبور ہوکر یورپین اقوام کا داخلہ منظور کر لیا۔

جاپان کا عروج = اس صورت حال سے جاپانی قوم نے بہت اثر لیا۔ اور جان توڑ کوشش کی کہ کسی طرح یورپین اقوام کی برابری حاصل ہو جائے چنانچہ دنیا کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ ۳۵ - سال کی قلیل مدت میں کسی قوم نے ایسی ترقی کی ہو جیسے جاپان نے حاصل کرلی ۱۹۰۰ء میں جاپان ایک بڑی قوت بن گیا ۱۸۹۴ء میں جاپان نے اسقدر قوت پیدا کرلی تھی کہ چین کیساتھ وہ ایک کامیاب لڑائی لڑا مگر یورپین اقوام نے حسد ایسا کیا کہ اس فتح سے زیادہ فوائد حاصل نہ ہو سکے۔ روس۔ فرانس اور جرمنی نے مواضعات پیدا کرنے شروع کئے۔ دس سال تک جاپان بالکل خاموش رہا اس عرصہ میں اپنی فوج کی تنظیم کرلی اور روس کیساتھ مقابلہ کے لئے تیار ہوگیا۔

روس وجاپان کے درمیان جنگ کے اسباب

دنیا کی مشہور جنگ جو روس و جاپان کے درمیان ہوئی مشرقی اقوام کے لئے باعث فخر ہے اس لڑائی کے اسباب مختصر طور پر یہ ہیں کہ مشرقی ایشیا میں ملک گیری کی ہوس یورپین اقوام کو دیوانہ بنائے ہوئے تھی۔ جاپان بھی اس کوشش میں تھا کہ اپنے اقتدار میں توسیع کرے اسکے لئے سب سے بہتر میدان مشرقی ایشیا کا تھا۔ چنانچہ جزیرہ نما کوریا جاپان سے صرف ۱۲۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہوا ہے۔ مختلف اقسام کی دھاتوں کی وجہ سے یہ ملک بہت زرخیز مانا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم سے چین نے اس پر اپنا اقتدار قایم کر رکھا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی کے آخر زمانہ میں جاپان نے اس پر یورش کی مگر کامیابی نہ ہوسکی ۱۸۷۶ء میں کوریوں نے ایک

جاپانی جہاز کو نقصان پہنچایا۔ کوئی سخت کارروائی کرنے کے بجائے جاپان نے مصلحت کے پیش نظر نرم طریقہ اختیار کیا۔ کچھ رقم ہرجانے کے طور پر وصول کی۔ کچھ تجارتی مراعات حاصل کئے اور اپنی ایک مختصر فوج وہاں رکھنے کا انتظام کر لیا۔ یہ صورت حال چین کے منشا کے خلاف تھی۔ چنانچہ دونوں اقوام کی رعایا میں کشمکش پیدا ہو گئی ۱۸۹۴ء میں چینی نمائندوں نے کوریا کے ایک معزز آدمی کو قتل کر دیا۔ مقتول جاپان کے اقتدار کی تائید میں تھا۔ اس واقعہ نے دونوں ممالک کے درمیان جنگ چھیڑ دی۔ جاپان کی فوج منظم اور تربیت یافتہ تھی۔ چین کی شکست ہوئی۔ امید نہ تھی کہ شرائط صلح نرم ہونگے۔ مگر چین کی خوش قسمتی سے کانفرنس کے دوران میں ایک پرجوش جاپانی نے چین کے ایک نمائندہ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ جاپان کی قدیم روایات کی رو سے دشمن کیساتھ اعانت کرنا لازمی ہو گیا۔ بہرکیف نتیجہ یہ ہوا کہ پورٹ آرتھر کا مشہور قلعہ جاپان کے تصرف میں آگیا۔ اسکے ماسوا جزائر فارموسا وغیرہ بھی حاصل ہوئے۔ کوریا ایک آزاد ملک تسلیم کر لیا گیا۔ منچوریا میں جاپان نے اپنے حق سے دست برداری کر لی۔ روس۔ فرانس اور جرمنی سے چین کے تعلقات دوستانہ قائم ہو گئے۔ لیکن جاپان کی روز افزوں ترقی ان ممالک کو پسند نہ آئی۔

چین کیساتھ صلح کے سلسلہ میں جو فوائد جاپان کو حاصل ہوئے تھے ان کو زائل کرنیکی کوشش شروع ہو گئی۔ روس۔ جرمنی اور فرانس نے مشترک طور پر حکومت جاپان کو مطلع کیا کہ وہ مستقل طور پر ان فوائد سے مستفید نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ صورت حال مشرق بعید کے امن میں خلل انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چین کی لڑائی نے جاپان کو کمزور کر دیا تھا اب اس میں اتنی قوت نہ تھی کہ یورپ کے ان تین ممالک کا مقابلہ کر سکے۔ لازمی طور پر جھکنا پڑا۔ جاپان کے لوگوں کو بڑا تعجب جرمنی کے طرز عمل پر تھا کیونکہ اس سے تعلقات خوشگوار رہ گئے تھے۔ مگر بعد کو یہ راز کھلا کہ جرمنی بھی جاپان کی ترقی سے خائف تھا۔ اس متحدہ کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورٹ آرتھر کا قلعہ روس کے حوالہ کر دیا گیا اس واقعہ کے بعد سے جاپانی جرمنی کے خلاف ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم تک یہ مخالفت جاری رہی۔ چنانچہ جاپان جرمنی کے خلاف جنگ میں شریک ہوا۔

۱۸۹۸ء میں پورٹ آرتھر کو چین نے روس کے پاس رہن کر دیا۔ جاپان تخلیہ پر مجبور ہو گیا۔ روس نے اس قلعہ کو خوب مضبوط بنایا۔ سائبیریا کی ریل اسی قلعہ پر ختم ہوتی ہے

ظاہر ہے کہ جاپان کیلئے رُسوائی اس معاملہ میں ہوئی وہ بھولنے کے لائق نہ تھی۔ البتہ جاپانی مناسب موقع کے انتظار میں رہے۔ انتقام کا جذبہ قائم رہا۔ اسی زمانہ میں جرمنی نے کیاؤ چاؤ پر قبضہ کیا فرانس اور انگلستان نے بھی جنوبی چین میں اثرات پیدا کئے۔ یورپین اقوام کی دوستی کا معاوضہ چین نے اس قدر قیمتی دیا کہ ابتک اس کو رو رہا ہے۔

۱۹۰۰ء میں پھر یورپین اقوام کو مداخلت کا موقع ملا جس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں اس دفعہ روس نے عارضی معاہدہ کی بنا پر منچوریا کو اپنے زیر اثر کر لیا۔ عارضی قبضہ کی شرط برائے نام تھی۔ اس قبضہ نے مستقل صورت اختیار کر لی۔ جب جاپان نے دیکھا کہ کوریا۔ منچوریا دوامی طور پر روس کی جاگیر بنے جاتے ہیں تو مداخلت اور تدارک کا خیال پیدا ہوا۔

۱۹۰۳ء میں روس نے ریلوے کی توسیع کوریا کے علاقہ میں شروع کی۔ جاپانی حکومت نے اعتراض کیا مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ اب جاپان روس سے ٹکر لینے کے لئے تیار تھا۔ لیکن روس میں سرمایہ داروں کی ایک جماعت منچوریا اور کوریا میں سرمایہ لگا کر دولت کمانے کی فکر میں لگی ہوئی تھی۔ جاپان کی فوجی قوت کا اس کو صحیح اندازہ نہ تھا۔ اس کے ماسوا روس کے بعض فوجی عہدہ دار بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ جاپان کسی حال بھی روس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یورپ کے دیگر ممالک بھی یہی سمجھتے تھے کہ اگر جنگ ہوئی تو روس کامیاب رہیگا۔ یہ حقیقت فراموش کر دی گئی کہ جاپانی قوم میں ایک ایسا اتحاد پیدا ہو گیا ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ دوسرے یہ کہ لڑائی کے مرکز سے جاپان بہت قریب ہے اسکی فوج تو آسانی کیساتھ نقل و حرکت کر سکتی ہے۔ اس کے خلاف روس کی یورپین فوج کو اپنے مرکز سے دور دراز کا سفر اختیار کرنا پڑیگا۔

جنگ کا آغاز:۔ جاپان نے پہلے تو یہ کوشش کی روس کے ساتھ کوئی تصفیہ ہو جائے۔ مثلاً منچوریا روس کے زیر اثر رہے اور کوریا میں جاپان کا اقتدار قائم ہو جائے۔ لیکن روس نے اس تحریک کو پسند نہیں کیا۔ آخر کار مجبور ہو کر ۶ / فروری ۱۹۰۴ء کو جاپان نے اپنے سفیر مقیم سینٹ پیٹرس برگ کو واپس بلا کر سیاسی تعلقات منقطع کر لئے روس نے بھی اعلان کیا کہ سیاسی تعلقات باقی نہیں رہے۔ البتہ کسی حکومت نے باقاعدہ جنگ کا نوٹس نہیں دیا۔

۸۔ فروری کو جاپان نے اچانک طور پر روسی بیڑہ مقیم پورٹ آرتھر پر حملہ کر دیا تین روسی جہاز فوراً ڈوب گئے جنگ کا باقاعدہ اعلان ۱۰ / فروری کو کیا گیا۔

اس جنگ کے سلسلہ میں ایک بحث الٹی میٹم کی پیدا ہوئی۔ روسی حکومت نے شکایت

کی کہ جاپان نے باقاعدہ اعلان جنگ کے قبل جو حملہ کیا وہ بین الاقوامی دستور کے خلاف تھا۔ سیئے جاپان دغا کا مرتکب ہوا۔ بین الاقوامی قانون کے ایک ماہر مسٹر لاورنس نے اس معاملہ میں یہ رائے ظاہر ہوئی کہ گذشتہ دو سو سال سے جو لڑائیاں ہوتی رہی ہیں ان میں کسی سلک نے ابھی جنگ کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا۔ اس لئے یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا کوئی بین الاقوامی قانون موجود ہے جسکی خلاف ورزی کی گئی بلکہ جاپان نے اپنے سفیر کو طلب کر کے یہ واضح کر دیا تھا کہ تعلقات دوستانہ باقی نہیں رہے۔ ایسی صورت میں روس کو ہر بات کے لئے تیار رہنا چاہئے تھا

منچوریا اور کوریا میں فوج اتارنے کیلئے لازمی تھا کہ جاپان سمندر پر قبضہ کرے خوش قسمتی سے جنگ موسم سرما میں شروع ہوئی۔ بندرگاہ ولاڈی وشاک میں روسی بیڑہ موجود تھا لیکن وہاں کا سمندر یخ بستہ ہونیکی وجہ سے وہ فوراً کام نہ دیسکا۔ جاپان نے سرعت کیساتھ پورٹ آرتھر پر حملہ کر دیا۔ روسی جہازوں کے ڈوبنے کی وجہ سے جاپان کو موقع ملا کہ حسب مرضی اپنی فوج کو میدان جنگ میں منتقل کر سکے۔ کوریا کا بادشاہ روسی اشرارت میں تھا۔ اس نے چاہا کہ غیر جانب داری کا اعلان کر کے جاپان کی مداخلت کو روک دے۔ مگر اس کا احتجاج غیر موثر رہا۔

زمین پر پہلی لڑائی کوریا میں ہوئی۔ روس نے شکست کھا کر کوریا کا تخلیہ کر دیا۔ منچوریا کے درمیان دریائے یالو حد فاصل ہے۔ اس دریا پر پہلی زبردست زمین کی لڑائی چار پانچ روز تک ہوتی رہی۔ جاپان فتحیاب رہا۔ اب منچوریا میں اسکے قدم مضبوطی کیساتھ جم گئے۔ چند ہی روز بعد اور ایک بڑی لڑائی سولہ گھنٹوں تک ہوتی رہی۔ اس میں بھی جاپان کامیاب رہا اور کنچاؤ کے اہم مقام پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس لڑائی کے بعد ہی پورٹ آرتھر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ روسی بیڑے نے محاصرہ توڑ کر نکلنے کی کوشش کی۔ ایک بڑا جنگی جہاز غرق ہو گیا۔ جاپانی بیڑہ کو بھی کچھ نقصان پہنچا۔ بحری کارروائی روک کر جاپان نے خشکی کی طرف سے محاصرہ تنگ کر دیا

تاریخی بحری جنگ = ۱۰ اگست کو ایک تاریخی بحری جنگ ہوئی۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ جدید قسم کے جنگجو جہازوں سے سمندر میں زور آزمائی ہوئی۔ سائنس کی ایجادات کا ایسا مظاہرہ سمندری لڑائی میں دنیا نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھا تھا۔ بندرگاہ ولاڈی وسٹاک خطرہ میں تھا۔ روسی بیڑہ نے وہاں سے بھاگ کر جان بچانیکی کوشش کی۔ جاپان نے اسکو کھلے سمندر میں آنیکا موقع دیا۔ روسی بیڑے کے متعدد جہازوں کو نقصان پہنچا۔ جاپان کا کوئی جہاز بھی غرق نہ ہوا البتہ جانی نقصانات کافی ہوئے اسی طرح ایک اور بحری لڑائی میں جاپان کو کامیابی ہوئی۔

خشکی پر لڑائی = سمندری لڑائیاں جیتنے کے بعد جاپان نے خشکی پر آزادی کے ساتھ کارروائی شروع کی۔ مقابلہ روس کے مشہور جنرل کروپاٹکن سے ہوا۔ روسی فوج دو لاکھ کے قریب تھی۔ جاپان کے پاس کوئی چالیس ہزار سپاہی زیادہ تھے۔ یہ لڑائی دس روز تک ہوتی رہی۔ روسی فوج کے بیس ہزار سپاہی کام آئے اور مالی نقصانات شدید ہوئے۔ جاپانی فوج کو بھی معقول نقصان اٹھانا پڑا جنرل کروپاٹکن بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنی فوج کو بربادی سے بچا کر مکڈن کی طرف لے گیا۔

پورٹ آرتھر کی فتح = پورٹ آرتھر کے لئے ایک مہینہ تک شدید لڑائی ہوئی بالآخر روسی جنرل نے ہتھیار ڈالنے کا تصفیہ کر لیا پہلے اپنے جنگی جہازوں کو سمندر میں غرق کر دیا تاکہ دشمن کے ہاتھوں میں جانے نہ پائیں۔ اسکے بعد ۲ جنوری کو قلعہ جاپانیوں کے حوالہ کر دیا۔ چالیس ہزار سے اوپر قیدی جاپان کو ملے۔ سامان جنگ کثیر مالیت کا اسکے علاوہ تھا۔

مکڈن کی تاریخی جنگ = پورٹ آرتھر سے فارغ ہونیکے بعد پھر جنرل کروپاٹکن سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کی گئیں۔ کروپاٹکن مکڈن میں امدادی فوج جمع کر رہا تھا۔ سائبیریا کی ریل اچھی حالت میں نہ تھی۔ فوجی سامان اور سپاہیوں کی نقل و حرکت میں روس کو بڑی دشواری کا سامنا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ کروپاٹکن کے پاس چار لاکھ سے زیادہ سپاہی جمع نہ ہو سکے۔ جاپان نے اس کا مقابلہ پانچ لاکھ کی فوج سے کیا۔ دنیا کی خونریز لڑائیوں میں مکڈن کی لڑائی کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ ایک ماہ کی مسلسل لڑائی کے بعد روس کو شکست فاش ہوئی۔ ڈیڑھ لاکھ کے قریب جانی نقصانات ہوئے۔ فوجی سامان کثیر مالیت کا جاپان کے ہاتھ لگا۔ جاپانی سپاہی پچاس ہزار کے قریب ضائع ہوئے۔

بحری جنگ = مکڈن کی مشہور لڑائی کے بعد پھر جنگ شروع ہوئی۔ روس کا بالٹک بیڑہ یورپ سے روانہ ہوا مگر شروع ہی میں شگون خراب ہوا۔ بحر شمالی میں مچھلی پکڑنیوالے کچھ انگریزی جہاز اپنے کام میں مصروف تھے۔ روسیوں پر جاپان کا ایسا خوف بیٹھا ہوا تھا کہ وہ ان جہازوں کو دشمن کی تارپیڈو کشتیاں سمجھے۔ فوراً گولہ باری شروع کر دی۔ ایک انگریزی جہاز غرق ہو گیا۔ دو آدمی ہلاک اور کچھ زخمی ہوئے اس واقعہ نے انگلستان میں کھلبلی ڈال دی۔ معلوم تھا کہ اس وقت روس پریشان ہے اس لئے دباؤ میں آجائیگا۔ فوراً نوٹس دیا گیا کہ معافی مانگو اور ہرجانہ ادا کرو۔ اسکے ساتھ بحری بیڑہ بھی بھیجدیا گیا کہ اگر جواب تشفی بخش نہ ملے تو خاطی بیڑہ کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے روس کی حکومت نے جواب

دیا کہ گولہ باری دانستہ نہیں ہوئی بلکہ غلط فہمی کا نتیجہ تھی ۔ انگلستان نے اس معاملہ کو بین الاقوامی پنچائت کے سپرد کر دیا ۔ اندیشہ تھا کہ ایک دوسری جنگ شروع ہو جائے لیکن پنچائت کے فیصلہ کو روس نے تسلیم کر لیا اور (۶۵۰۰۰) پونڈ ہرجہ دیکر جان چھڑائی ۔

بالٹک بیڑے کا ایک حصہ جنوبی افریقہ کے راستہ سے اور دوسرا نہر سوئز کو عبور کرکے ہندی چینی سمندر میں پہنچا ۔ یہاں بقیہ بیڑے کا انتظار کیا گیا ۔ اس سمندر پر فرانس کا اثر تھا ۔ اس نے روس کی طرفداری کرکے کوئی اعتراض نہیں کیا ۔ جب روس کا مکمل بیڑہ ایک جگہ جمع ہو گیا تو کچھ دنوں تک اس پر غور کیا گیا کہ دشمن پر حملہ کس طرح کیا جائے ۔ بالآخر روسی امیرالبحر نے یہ طے کیا کہ را . . . حملہ کرکے تصفیہ کن جنگ کی جائے ۔ تعداد کے لحاظ سے روسی بیڑے کو برتری حاصل تھی لیکن محض جہازوں کی تعداد سے جنگ میں کامیابی حاصل نہیں ہوا کرتی بڑا دارومدار جنگ لڑانے والوں پر ہوا کرتا ہے ۔ روسی جہازران جاپان کے مقابلہ میں آزمودہ کار نہ تھے ۔ جاپانی امیرالبحر کی قابلیت کا بہت چرچا ہو رہا تھا ۔ ساری دنیا کی نظر بیچینی کے ساتھ اس جنگ کی طرف لگی ہوئی تھی ۔

۲۷ ۔ مئی ۱۹۰۵ء کا دن دنیا کی بحری لڑائیوں کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جب دونوں بیڑوں کا مقابلہ ہوا تو سورج اور ہوا کا رخ روسی بیڑے کے خلاف تھا ۔ اس قدرتی تائید کے علاوہ جاپانی سپاہیوں نے بھی کارروائی کا غیر معمولی ثبوت دیا ۔ امیرالبحر ٹوگو کی تاپیر جنگ غالب آئی ۔ پون گھنٹے کی لڑائی کے بعد ہی معلوم ہو گیا کہ نتیجہ روس کے خلاف رہیگا ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ روسی جہازوں کو شدید نقصانات کا سامنا کرنا پڑا ۔ جانی نقصان بھی امید سے زیادہ رہا ۔ صرف قیدیوں کی تعداد سات ہزار سے کم نہ تھی ۔ جاپان کا نقصان نسبتاً بہت کم تھا ۔ اس شکست نے روس کی کمر توڑ دی ۔

صلح کی گفتگو = دنیا کا عام خیال تو یہی تھا کہ اب اختتام جنگ کا اعلان ہو جائیگا ۔ مگر سوال گوری قوم کی ساکھ کا تھا ۔ روس اس پر آمادہ نہ تھا کہ صلح کی درخواست میں پہل کرے ۔ یورپینی اقوام کو قدرتاً روس کے ساتھ ہمدردی تھی ۔ آخرکار قیام امن کے بہانہ کی آڑ میں امریکہ پیغام صلح لیکر آیا ۔ اصل منشا تو یہی تھا کہ ایک یورپین قوم کو مزید ذلت سے بچایا جائے مگر کہا یہ گیا کہ دنیا میں امن قایم ہونا چاہئے ۔ پریسیڈنٹ روزولٹ نے شخصی طور پر صلح کے لئے اپیل کی ایک امریکن جہاز پر روس اور جاپان کے نمائندوں کے درمیان

تعارف کرایا گیا۔ اسکے بعد امریکہ کی سرزمین پر دونوں ممالک کے نمائندے شرائط پر غور کرنیکے لئے بیٹھے۔ دنیا بڑی دلچسپی کے ساتھ مشاہدہ کر رہی تھی کہ کالوں اور گوروں کا یہ جھگڑا کس نہج پر طے پاتا ہے۔

ریویو

المعرب۔ اردو عربی۔ ایک عرصہ سے ایسے لغت کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جن میں اردو کے محاورات کو عربی الفاظ میں صحیح طور پر بیان کیا جائے چنانچہ یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ پروفیسر سیف بن سلطان حسین ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی اور پروفیسر احمد بن ناصر العیری عثمانیہ ٹرننگ کالج نے اسکی تدوین کا کام شروع کر دیا جو نمونہ ارباب ذوق کے سامنے پیش کیا ہے وہ نہایت جامع ہے اردو دان حضرات کے لئے قرآن شریف کی تفہیم میں نہایت آسانی پیدا ہو جائیگی جنکو ہم روزانہ بغیر معنی مطالب کے پڑھتے آئے ہیں یقیناً یہ ایک ایسی خدمت ہے کہ سہولت کار کے سوا ایمانی جذبہ بھی کار فرما ہے۔ محاورہ و الفاظ کے ساتھ ساتھ جہاں ضرورت محسوس کی گئی تصاویر سے بھی واضح کیا گیا ہے۔

ضرورت مند حضرات احمد بن ناصر العیری علیہ استاذ العربیہ عثمانیہ ٹرننگ کالج تربیت آباد دکن سے رجوع ہوں

لندن کی تقسیم

جناب مسعود عابدی (از لندن)

(۱) ویسٹ اینڈ (۲) ایسٹ اینڈ

ویسٹ اینڈ کو اگر آپ سماجی ـ ثقافتی ـ تمدنی اور معاشرتی ـ مرکز قرار دیں تو بیجا نہو گا ـ یہاں امرا کے عالیشان ایوان ـ خوبصورت تفریح گاہ تہیٹرز ـ سینما ـ شاندار شاہراہیں اور بازار آراستہ ہوٹلیں ـ رسٹورنٹ دکہائی دینگے ـ

سٹی آف ویسٹ منسٹر کو بھی ایک ذیلی حصہ قرار دیا جاسکتا ہے یہاں آپ شاہی محل وزیر اعظم کا رہائش گاہ تمام سرکاری دفاتر پائینگے ـ اس کے مقابل آپ کو ایوان ہائے پارلیمنٹ ملینگے ـ

تجارتی مرکز آپ کو ایسٹ اینڈ کے علاقہ میں نظر آئیگا جسے وہاں (City) کہتے ہیں ـ اسٹاک اکسچینج بنک آف انگلینڈ ـ ریزرو بنک آف انڈیا ـ امپریل بنک آف انڈیا وغیرہ نیز گلڈ ہال بھی اسی حصہ میں واقع ہیں مختصر یہ ہے کہ کارہائے صنعتی مراکز ـ تجارتی مرکز وغیرہ آپ کو ایسٹ اینڈ کے حصہ میں ملینگے میرے ساتھ میرے چند احباب جن میں قابل ذکر مس سلطانہ مس پنجتن ـ مسٹر اکبر ـ مسٹر شوکت ـ مسٹر وہاب ـ مسٹر حبیب ہیں برمنگھم چلنے کیلئے تیار ہو گئے مسٹر نظام الدین مددگار ناظم معدنیات حکومت سرکار عالی اپنی ٹریننگ کے سلسلہ میں برمنگھم میں مقیم ہیں اسی لئے اونہیں ہوٹل میں رہائش کے انتظام کے لئے تار دیا گیا اور چار بجے کی ٹرین سے ہم روانہ ہو گئے اور سبھوں نے لنچ شفیع رسٹورنٹ میں کھایا چونکہ بالعموم (Week-End) ہر گاڑیوں میں زیادہ ہجوم رہتا ہے اسی لئے جگہ نہیں ملی مگر خواتین کے لئے بیٹھنے کا انتظام کر کے ہم (Paddington) میں بیٹھ گئے کوئی سات بجے (Snow Hill) اسٹیشن پہونچے وہاں ٹیکسی لیکر ہوٹل روانہ ہوئے جہاں مسٹر نظام الدین کو منتظر پایا ـ ان سے بڑی دیر تک دلچسپ گفتگو رہی ڈنر کے بعد ہم (New Street) روانہ ہوئے رات کے کوئی بارہ

بجے ہوٹل واپس ہوکر سو رہے —

ناشتہ کے بعد ہم گھومنے نکلے یہ بہت وسیع اور گنجان شہر ہے جسکی آبادی دس لاکھ ہے اس
شہر کا ایک (ہے one way traffic system) یہاں پر [illegible] جسکی
وجہ سے اجنبیوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے اس شہر کو (Black Country) کہتے ہیں
راستے اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ایک مقام کو پہونچنے کے لئے بہت سا وقت صرف کرنا پڑتا ہے
بات یہ ہے کہ گاڑیوں کی آمد کے لئے ایک راستہ ہے اور انکی واپسی کے لئے دوسرا راستہ اسی لئے
چکر کھا کر راستے طے کرنا پڑتے ہیں۔ یہاں متعدد کارخانے ہیں جیسے (B.S.A) کارخانہ بہت
مشہور ہے جنگ کے دوران میں چونکہ یہاں سے ضروری اشیاء جو جنگ میں کارآمد ہوں تیار ہوکر
محاذ پر روانہ ہوتی تھیں اسلئے یہ بمباری کا زبردست ترین نشانہ تھا۔ برمنگھم کے بیشتر حصہ کو
کھنڈر کی صورت میں دیکھیں گے —

ہم برمنگھم میوزیم دیکھنے گئے، جسکے مختلف شعبوں میں مختلف وضع کی آثار قدیمہ کی
اشیاء محفوظ تھیں (Fine Arts) کے شعبہ میں ہم نے بہترین اور قدیم کانچ چینی،
ہاتھی دانت وغیرہ کی قیمتی اور نایاب اشیاء دیکھیں اس شعبہ میں آپ کو چین، ہندوستان
اٹلی اور یونان سے لایا ہوا سامان ملیگا تصاویر کے سلسلہ میں ہم نے فن کے اعلیٰ ترین نمونے دیکھے چند
مجسمے بھی یہاں موجود تھے ڈاکٹر ٹیگور، اور بدھ کا مجسمہ قابل ذکر ہے (James Watt)
کا بھی مجسمہ نظر آیا۔ نباتی شعبہ میں مختلف درخت و پودے دیکھے اسکے بعد حیوانی شعبہ کی طرف
روانہ ہوئے بھس بھرے ہوئے متعدد جانور نظر آئے یہاں چھوٹے سے چھوٹے پرندے سے لیکر
شیر ببر ہاتھی وغیرہ بھس بھرے دیکھینگے اور ایک خوبی نظر آئیگی کہ سب بھس بھرے ہوئے
چرند و پرند کو بالکلیہ قدرتی مناظر اور ماحول میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ سمکیات کے شعبہ میں ہمیں
ہزاروں قسم کی مچھلیاں اور جھینگے وغیرہ نظر آئے لکھ پر ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کا تحقیقاتی
کام معہ تفصیلات کے نظر آیا۔ کہتے ہیں کہ روزانہ کئی ہزار آدمی اسے دیکھنے کیلئے آتے ہیں اس میوزیم
کا کچھ حصہ بمباری سے تباہ ہوگیا ہے تعمیر جاری تھی —

لنچ کے بعد ہم یونیورسٹی دیکھنے روانہ ہوئے جہاں ہمیں تعلیم حاصل کرنی تھی۔ پہلے
یہ یونیورسٹی عین شہر میں واقع تھی بارہ سال ہوئے اسے شہر سے باہر منتقل کیا گیا مگر اس [illegible]
بعد بھی شہر کی آبادی اس طرف بڑھنے لگی ہے اب پھر شہر اس سے مل گیا ہے [illegible]

نہایت وسیع میدان میں اونچے ٹیلہ پر واقع ہے اس کا اسمبلی ہال واقعی نہایت شاندار اور قابل دید ہے یہہ جامعہ اپنے انجینیرنگ کالج کیوجہ سے بہت مشہور رہا ہے اور انگلستان کے بہترین جامعات میں سے ایک تصور کیجاتی ہے۔ میڈیکل کالج کی عمارت انتہائی خوبصورت اور چھ منزلہ ہے۔ اس پر گھڑیال گھر بھی ہے

اسکے بعد ہم پکچر دیکھنے روانہ ہوے یہاں کے سینما مسلسل چلتے رہتے ہیں اور جس وقت چاہیے آپ ہال میں جاکر پکچر دیکھنا شروع کر سکتے ہیں اور پورا دیکھ لینے کے بعد باہر نکل جاسکتے ہیں یہاں کے سینما ہال بمبئی کے (METRO) سے کروڑ درجہ شاندار اور آرام دہ ہوتے ہیں (Heating arrangement) بھی وہیں ہے اسکے بعد ہوٹل کو پہنچ کر سو رہے

ناشتہ کے بعد ہم روانہ ہوے جہاں سے چند کتابیں ہم نے خریدیں ہندوستانی تصاویر کا ایک البم میں نے مس سلطانہ کو بطور تحفہ کے پیش کیا مس سلطانہ باوجود مغربی تعلیم کے مشرقیت کا ماحول میں رنگی ہوئی ہیں قابلیت کی حد تک تو کچھ کہنا ہی فضول ہے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کے باوجود بھی مشرقی نسوانیت کا قابل تقلید نمونہ دوسری تعلیم یافتہ بہنوں سے میری یہہ درخواست ہے کہ وہ مس سلطانہ سے سادگی سیکھیں اور انکی زندگی سے سبق حاصل کریں ۔

مس بجتن کو ہم سب "آپا" کہتے ہیں انکی نصیحتیں حیدرآبادی طلبا کیلئے بہت اہمیت رکھتی ہیں ۔ "آپا" واقعی میری آپا ہیں اسلئے کہ یہہ میرے ہم جماعت اور دوست صفدر کی بڑی بہن ہیں ۔ میں انکی تعظیم اپنی بڑی بہن کیطرح کرتا ہوں مس سلطانہ اور مس بجتن مذہب کے تمام امور کے ابتک پابند ہیں مسٹر اکبر، وہاب، شوکت وغیرہ آج برمنگھم سے واپس لوٹنے والے ہیں اسلئے لنچ کے بعد انہیں خدا حافظ کہنے اسٹیشن روانہ ہوے شام میں ہم نظام الدین صاحب کے ایک دوست مسٹر پرشاد سے ملنے کیلئے (sedgley) روانہ ہوئے جو برمنگھم سے سترہ میل دور ہیں راستہ میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی ڈبل روٹ تھی اور بس سروس ہر پندرہ منٹ سے جاتی ہے مختصر یہ کہ ہم مسٹر پرشاد سے ملے جنھوں نے (LANDLADY) سے ہمارا تعارف کرایا یہہ صاحب ایک مکان میں مقیم ہیں مکان والی ایک ڈپٹی کا(DEPUTY) میری ہیں ہیں میرے لئے یہہ امر سخت تعجب کا باعث ہوا۔ واضح ہو کہ ڈپٹی کلان کا ایک معمولی افسر ہوتا ہے جب میں نے

ہندوستان کے ڈیٹی کا مقابلہ انگلستان کے ایک ڈیٹی سے کیا تو مجھے زمین آسمان کا فرق نظر آیا بات یہہ ہے کہ ہمارے معیار زندگی اور انگلستان کے معیار زندگی میں بہت بڑا فرق ہے ممکن ہے کہ آپ کیلئے یہہ (Boring) ثابت ہو رہا ہے اسلئے اسے یہیں ختم کرنا مناسب ہے ہم کوئی دس بجے ہوٹل واپس ہوئے اور سو رہے ۔

آج کرسمس کا دن ہے ۔ بس سروس ٹرام سروس ریل وغیرہ سب بند ہیں نیز ہوٹلیں بھی بند ہیں بر منگھم آج شہر خموشاں نظر آرہا ہے راستہ میں اکا دکا آدمی چل پھر رہا ہے ناشتہ کے بعد میں اور نظام الدین صاحب (LOUNGE) میں بیٹھے ہوئے بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے آج میں ہوٹل میں بیٹھا خطوط لکھتا رہا اور روزنامچہ مکمل کیا لنچ اور ڈنر دونوں ہوٹل میں کھائے اور شام میں مطالعہ میں مصروف رہے اور سو گئے ۔

آج (Boxing day) ہے ناشتہ کے بعد بڑی دیر تک ہمارے ان ساتھیوں سے گفتگو ہوتی رہی جو ہمارے ہی ہوٹل میں مقیم ہیں میں نے انہیں ہندوستان کے پیچیدہ ترشہ دار سوالات کے جوابات دیئے اور انکی تشفی کرنے کی کوشش کی ہوٹل میں بعض خواتین بھی موجود تھیں میں محسوس کر رہا ہوں کہ ان میں سے ایک کم سن خوبصورت خاتون نے مجھے برابر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی اور مجھ سے بے تکلفی بڑھانے کی کوشش کرتی رہی (Box-ingday) وجہ تسمیہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چونکہ اس دن تحفہ میں سابقہ زمانے میں اکثر (BOXES) تحفہ میں دیتے تھے اسلئے اس کا نام یہہ پڑھ گیا

لنچ کے بعد ہم پکچر دیکھنے روانہ ہوئے ہمارے ساتھ چند ہوٹل کے ساتھی بھی تھے جنمیں وہ خاتون بھی شامل تھی جو مجھ سے بے تکلفی کی فکر میں تھی سینما ہال میں بھی وہ میرے بازو بیٹھی رہی اور اس سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں جس پر میں نے اسکی ملکی سے تنبیہہ کی سینما سے واپسی کے بعد تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی اور ہم سو گئے ۔

ناشتہ کے بعد میں (STARTFORD ON AVON) دیکھنے روانہ ہوا جو مشہور ڈرامہ نویس شیکسپیر کا وطن ہے میں نے وہ گرجا بھی دیکھا جہاں شکسپیر عبادت کرنے کے لئے جاتا تھا جہاں وہ دفن ہے بطور یادگار رکھے وہ رجسٹر جس میں شکسپیر کی تاریخ ولادت اور وفات مندرج ہے اور جو سنہ ۱۶۱۶ء کا ہے اب تک محفوظ رکھا گیا وہ حوض جس میں شکسپیر کو (Baptize) کیا گیا تھا وہ بھی محفوظ ہے یہاں اپریل سے اگست

تک اسکی پیدائش کی یادگار کے طور پر (Festival) منایا جاتا ہے اور اس کے لکھے
ہوئے ڈرامے ایک تھیٹر میں اس کی یاد میں تعمیر کیا گیا ہے پیش کئے جاتے ہیں یہاں ایک پبلک
ہاؤس میں شکسپیئر کا مجسمہ بھی نظر آئیگا اس کے بعد ہم ایک رہبر کی معیت میں اس مکان
کو دیکھنے روانہ ہوئے جس میں شکسپیئر رہتا تھا اور جسے ایک ٹرسٹ کے تحت محفوظ
کیا گیا ہے شکسپیر کی جملہ مستعملہ چیزیں اسی دو منزلہ قدیم ٹیوڈر وضع کے مکان میں
محفوظ ہیں یہاں سے لنچ کے بعد میں (Warwich) روانہ ہوا جہاں Boilers
کا کارخانہ ہے بڑا شمار (MANCHISTER) برمنگھم کے بعد صنعتی شہروں کی فہرست میں
ہوتا ہے اس کی آبادی ڈھائی لاکھ ہے اور یہاں سینکڑوں بڑے بڑے کارخانے ہیں جہاں
ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں (Warwic Castle) کو بھی دیکھا جو ایک بلند پہاڑی پر واقع ہے
اس میں داخلہ کے لئے ۲ شلنگ لیا جاتا ہے یہاں تیرہویں صدی کی زمانہ کی تصاویر
فرنیچر ہتھیارات وغیرہ محفوظ ہیں محل کے اطراف چمن بندی سلیقہ سے کی گئی ہے یہاں میں
نے ایک ایسا واز (سنگ مرمر کا کونڈا) دیکھا جو دو ہزار برس پرانا ہے یہاں سے
میں پھر برمنگھم واپس لوٹا اور ڈنر کے بعد سو رہا ۔

صبح دس بجے میں کوونٹری روانہ ہوا جو یہاں سے ۲۷ میل دور ہے یہ ایک بڑا صنعتی شہر ہے
جس میں کوئی سوا سو بڑے بڑے کارخانے ہیں سب سے پہلے میں (Coal. Mines) دیکھنے گیا
سنتے ہیں کہ (Country Colony) رنگا ان کے بہترین اور صاف ہونے کے لحاظ سے اول درجہ
رکھتی ہے واقعہ تو یہ ہے کہ (سرفیس ورکنگز) مجھے بہت پسند آیا لیکن (انڈر گراؤنڈ ورکنگز)
کچھ ایسے اچھے نہیں انہیں بہترین تصور کیا جاسکے ۔ یہاں میں نے (Slim-average-[illegible]) دیگر
قسم کے مشین دیکھے جو کان کنی میں کار آمد ثابت ہوتے ہیں ۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ امریکہ بہ نسبت انگلستان
کے (Mine Machines) میں زیادہ آگے ہے اس دوران میں مجھے عملی تعلیم آئندہ حاصل
کرنا ہے ۔ آج کل (نیشنل ایسوسی ایشن آف مائنس) کیوجہ سے مزدوروں کی حکومت ہے جس کا نتیجہ
یہ ہے کہ (مائنس منیجر) کوئی پرواہ نہیں کرتا اگر مزدوروں کو حقوق اور
آزادی دیئے جانے کے یہ معنی ہیں کہ وہ تنظیم کو برقرار نہ رکھیں اور ڈسپلن کا خیال نہ رکھیں تو
بس آزادی یقیناً تباہی لائیگی اور جہاں تک میری تحقیقات کا تعلق ہے (ادب [illegible]) بھی
بہ نسبت [illegible] کے [illegible] گر گئے ہے ۔

اس کے بعد میں، وس کارخانہ کو دیکھنے کیلئے گیا جہاں شین نُو لس رہتے ہیں اور جیسے الفرڈ ہیر برسٹ کا کارخانہ کہتے ہیں تفصیل سے دیکھا اور یہہ میں نے نوٹ کیا کہ یہہ اپنی نوعیت کا ایک عجیب وغریب وسیع کارخانہ ہے ۔

بعد ازاں اسٹینڈرڈ موٹر کے کارخانہ کو گیا جہاں کار اوٹ پٹ (روزآنہ ۱۰۰) گاڑیاں ہے ۔ مزدوروں کی قلت کیوجہ قبل از جنگ (کے اوٹ پٹ) کے معیار پر آنا ناممکن ہے (کاف ویرس) جو بجلی سے چلتے ہیں میں نے مختلف مقامات پر گا تیار شدہ سامان کاریگروں کو مختلف مقامات پر بھیجا جاتا ہے مثلاً نو ہے کی پیٹریوں پر زیر تکمیل موٹر کار آہستہ آہستہ متحرک رہتی ہیں اور کاریگر اسی عرصہ میں کام کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ موٹر کار مکمل ہو جاتی ہے اور (TEST) کیلئے کارخانہ سے باہر روانہ کیجاتی ہے لنچ کھا کر پھر برمنگھم واپس لوٹا کچھ خریداری کرتا رہا ۔ اسکے بعد ہوٹل واپس لوٹا ڈنر سے فارغ ہوکر سو رہا ۔

ناشتہ کے بعد آکسفورڈ دیکھنے کی غرض سے روانہ ہوا ۔ راستہ کے دونوں جانب نہایت آراستہ بستیاں اور گاؤں وغیرہ آباد تھے لیکن چاروں طرف ۔ پہاڑوں پر درختوں پر مکانوں پر مختصر یہ کہ ہر جگہ برف ہی برف جمی ہوئی نظر آئی اس برفباری نے ناک میں دم کر رکھا ہے ۔ سردی سے برا حال ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خون تک منجمد ہو گیا ہے خدا ۔ آکسفورڈ دیکھنے

سب سے پہلے میں آکسفورڈ یونیورسٹی دیکھنے گیا یہاں میں نے ایک جدت دیکھی وہ یہہ کہ امتحان گاہ کی عمارت بالکل علیحدہ ہے اسکے بازو باڈلین لائبریری کی گول عمارت ہے مختلف کالجس جنکی تعداد (۲۶) ہے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اس طرح بنے ہوئے ہیں کہ باہر سے کیوں نظر نہیں البتہ اندرونی چوگوشہ وسیع صحن ہیں جن میں ہریالی کے خوبصورت میدان ہیں جنھیں کورڈ رنگل کہتے ہیں میں نے خوبصورتی کے لحاظ سے صرف دو عمارت کو پسند کیا جنکے نام موڈلینڈ کالج اور سنٹ جان کالج ہیں موڈلینڈ کالج کے عقب میں تو آپ کو بہت وسیع پارک نظر آئیگا جس میں بکثرت گنجان درخت ہرن اور خرگوش وغیرہ نظر آئینگے ڈائننگ ہال اور گرجا بھی بہت خوبصورت ہیں مگر سب کی سب عمارتیں قدیم طرز کی ہیں ۔

لیکن میں یہاں بھی وہی چیز دہراؤنگا کہ آکسفورڈ کی جامعہ کی عمارت ہماری جامعہ کی عمارت کے سامنے ہیچ ہے اور سب تو سب یہاں تعلیمی فضا کا فقدان اس طرح نظر آیا کہ جامعہ چاروں طرف سے مکانات اور دوکانات سے گھری ہوئی ہے غل غپاڑہ کی فضا تعلیم کے خلاف کئے ہوئے ہے

غزل

جناب محشرؔ - ایم - اے

اے مرکز ذوق نظر کچھ تو مقابل میں ٹھہر
اس گردش شام و سحر کی زندگی ہے مختصر

تخئیل کی پرواز میں ہستی کی سوز و ساز میں
ساقی ترے انداز میں ہے کیف و مستی کی خبر

بے ہوشی ہی یا ہوش ہے ہنگامہ در آغوش ہے
سب ولولہ سب جوش ہے تیری نگاہوں کا اثر

کیا چاند کیا سیارگان ۔ کیا مرغ و ماہی انس و جان
دور گزرگاہ جہاں میں سب ہیں سرگرم سفر

اس صبح میں ، اس شام میں ۔ ہر چیز میں ہر کام میں
شادی میں یا آلام میں تیری رضا ہے کارگر

خون شہیداں کی دمک نے دل میں پیدا کی کسک
دل سے مقر شام تک پیدا ہیں آثار سحر

اس دار و گیر خیر و شر میں پھر رہا ہوں دربدر
اے کاش محشرؔ کو مگر مل جائے تیری رہگذر

غصہ

جہاں بانو

جو پہچان کر بھی تو انجان سا ہے
تیری بزم میں دل پریشان ہے

فی الجملہ انسانی خصائل میں سے غصہ انسان کی سب سے بدترین خصلت کا نام ہے۔ غصہ پر جن کو قابو ہے ان کا درجہ یقینی ولیوں اور دیوتاؤں کا ہو جاتا ہے۔ گالی کا جواب گالی سے دیا جا سکتا ہے۔ ایک آدھ موئی کمی غیر فصیح گالی کو سن کر سننے والا بہت سی فصیح و بلیغ گالیاں دینے پر قابو رکھتا ہے کیونکہ اپنی زبان پر اسکو پوری قدرت حاصل ہے لیکن وہ نہیں دیتا اور چپ ہو جاتا ہے ایک ایسے شخص کی زبردست شخصیت کا کیا کہنا۔

غصہ صرف جذبہ نہیں بلکہ ایک جنون ہے۔ غصہ کو جو پی جاتے ہیں وہ حقیقت میں بڑا ایثار کرتے ہیں۔ یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ کسی جذبہ کو سینہ میں دفن کرنے کا نتیجہ تکلیف ہے۔ اور تکلیف سہنے کی سب میں سہار نہیں۔ یہ معراج کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ "آبگینے" کے اختر انصاری "ضبط رشک" کے تحت کتنا اچھا سا شعر لکھتے ہیں

میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی
کہ میرے قلب میں بن جائینگے یہ انگار

اب ان انگاروں کو کون سہے۔ جن کے سہنے کے لئے بڑے حوصلہ کی ضرورت ہے۔ غصہ کے بعد ایک دور شرمندگی اور ندامت کا بھی آتا ہے۔ مگر یہ ان کے لیے جو حساس ہوتے ہیں بے حس پتھر جیسے لوگ پشیمانی کیا جانیں۔ وہ تو ایسے موقعوں پر خود کو انسان نہیں بلکہ ایک دیوتا نہیں ایک دوسرا خدا سمجھنے لگتے ہیں۔ غصہ جہالت و کم ظرفی کی کھلی تشریح ہے۔

آپ کہیں گے بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان ہی کیا جس میں غصہ نہ ہو لیکن ہر کلیہ کا ایک مستثنیٰ ہوتا ہے۔
ہر جذبہ کی طرح یہ جذبہ بھی موقع و محل پر موزوں ثابت ہوتا ہے۔ بے موقع ذرا ذرا سی بات
پر اٹھتے بیٹھتے جب اس درندگی کا اظہار ہونے لگے۔ تو اپنے پرائے اس انسان نما حیوان
سے بیزار نہ ہو جائیں تو پھر آخر کیا کریں۔ بزرگی منوانے کا یہ طریقہ کتنا غلط ہے۔ کہ بات
کرتے ہی انسان کاٹنے کو دوڑے اب اس کے چھوٹے اس سے دور نہ بھاگیں تو پھر کیا کریں۔

تم برستے رہے سر محفل
کچھ بھی میری زبان سے نکلا

اس قسم کا اتفاق بارہا ہوا لیکن کب تک کوئی برداشت کرے۔ صبر ایوب بھی پراگندہ ہو جائے
محبت کا غصہ بھی نہیں کہ کوئی کسی امید پر سہہ لے۔

حلم و بردباری تو وہ صفات ہیں جو فرشتوں کو نصیب نہ ہو سکے مگر یہی فرشتہ تو ایک
ایسے ماحول میں رہتا ہے۔ جہاں کوئی بات اسکی مرضی کے خلاف نہیں ہوتی۔ جہاں گناہ کا گذر نہیں
جہاں چڑچڑے پن اور بدمزاجی کا کوئی موقع و محل نہیں وہاں ایسی حرکات اگر کسی سے سرزد نہ ہوں
تو کونسی ایسی ندامت ہوئی۔ انوکھی بات اور نرالا پن تو جب ہے کہ ماحول ناسازگار رہا
گناہوں نے گھیر لیا ہو، اور کوئی دامن بچا کر نکل جائے

غصہ بھی ہم نے قسم قسم کا دیکھا۔ اور غصہ میں آنے والے بھی بہت سے نظر آئے۔ لڑکپن
میں ماں کا غصہ "جس غصہ میں طوفان محبت نے جنم لیا ہو۔ پیار سے معمور غصہ مستقبل
سدھار غصہ۔ یہ تو ایک نعمت عظمیٰ ہے ماں باپ کے پیار بھرے غصہ کے بعد زندگی میں
"استاد" صاحب قدم رکھتے ہیں۔ کوئی جاہل قسم کے عالم ہوئے تو پھر مار پیٹ دھمکی گالی
کے سوا بات نہیں کوئی سنجیدہ قسم کے متین معلم ہوئے تو پھر زندگی سدھرتی چلی۔ استاد صرف
غصہ اور خفگی سے ہی پیش آئے تو ہم یہی سمجھیں گے کہ اصول معلمی سے بیگانہ ہے۔ استاد کی شخصیت
کا بہت بڑا اثر شاگرد پر ہوتا ہے۔ شاگرد شخصیت سے زیادہ متاثر ہوتا ہے بہ نسبت خفگی
و دھمکی کے ظلم و زیادتی تو کبھی پھل پھول نہ سکے۔ ہاں ظالم کی عمر دراز ہوتی ہے۔

ماہرین نفسیات کا قول ہے کہ انسان کی پرکھ کے تین موقع ہیں۔ کھیل، بیماری، اور سفر۔ کھیل
خواہ وہ کسی قسم کا بھی کیوں نہ ہو انسان کو جاننے اور اسکو سمجھنے کے لئے بڑا سہل اور آسان ذریعہ ہے
نفس کی شرافت و خباثت صاف عیاں ہو جاتی ہے۔ سارا ملمع اتر جاتا ہے اور انسان کا ظاہر

خون سرک جاتا ہے۔ "اصل انسان" کھیل کے میدان پر "ظاہر" ہونے لگتا ہے۔ اب رہا سفر۔ جنہوں نے سفر کیے ہیں ان کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ اور جنہوں نے خود کو قطب بنا لیا ہے ان کو سفر کرنا چاہیے۔ تاکہ اس کا بھی تجربہ ہو جائے بیماری کی حد تک کے چڑچڑے پن اور بدمزاجی کو ہم نظرانداز کر دیتے ہیں۔

ماں کے محبت بھرے غصہ کے بعد بھائی بہن کی خفگی ہوتی ہے وہ بھی اتنی وبال جان نہیں محسوس ہوتی۔

اب چلئے زندگی کا دوسرا موڑ آ گیا۔ اس دور اہے پر بڑے بڑے سابقے ہیں زندگی نے چولا بدلا ہے ساری پچھلی باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ ابتک گویا سو رہے تھے وہ سب کچھ خواب تھا جو دیکھ لیا اب آنکھیں کھلی ہیں۔ سابقے نیا واقعات نئے واردتیں نئی غرض ساری کی ساری باتیں نئی۔ جو ابتک سوچا بھی نہ تھا۔ وہ دیکھنے کی باری ہے۔ ایک بڑی آزمائش ہے اب زندگی۔ کٹھن سے کٹھن تر۔ کڑوے گھونٹ بھی ملیں تو خوشی سے پی لو۔ ابرو پر بل نہ آئے۔ چار دو دھ اور شربت میں بھی جنہیں زیادہ سے زیادہ سے زیادہ شکر پینے کی عادت تھی انھیں کی زندگی کو تلخ سے تلخ تر ہوتے دیکھا۔ ذہن میں غالب کا یہ شاندار مصرعہ کروٹیں بدلنے لگا۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے!!

کس کو ملتی ہے غم کی دولت۔ دل ٹوٹنے کی صلاحیت نہ رکھے تو وہ دل ہی کیا۔ صبر و برداشت کی طاقت نے غم ہستی کی ٹیسوں کو راحت آفریں بنا دیا۔ اپنے دل پر ناز ہونے لگا۔ جیسا غم نصیب ٹوٹ پھوٹ جانے والا دل دینے والے کے ہاتھوں کی بلائیں لینے کو طبیعت چاہی اور یہ مصرعہ جھوم جھوم کر پڑھنے لگے۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج

کھیل سفر اور بیماری سے سرمایہ اور دولت، آزادی، اور خود مختاری سے بھی انسان کے کردار کی بلندی اور پستی کا اندازہ لگتا ہے کسی کو دولت ملی اور اسکا سر پھر گیا۔ اقتدار حاصل ہوا۔ اور آپے سے باہر ہو گئے آزادی اور خود مختاری نصیب ہوئی۔ اور اسکے استعمال کا طریقہ نہ آیا اصول سے بیگانہ ہو گئے اپنے اور پرائے کی تمیز جاتی گئی۔ کسی کے پاس کچھ نہ رہے۔ سب کچھ اپنا ہو جائے۔ یہ جنون سر اٹھایا۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ انسانیت مفقود ہو گئی۔ عقل نے "دل" سے علیحدہ ہو کر ہر اعتبار سے انسانی تکالیف و مصائب کو دور کرنے کے بجائے ان میں اضافہ ہی کیا ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ عقل بھی تھک گئی ہے اس نے بھی اپنا توازن کھو دیا ہے۔ عقل تو سوئے بچار سکھاتی ہے۔ تاریکی میں تیر نہیں مارتی پھر یہ کونسی طاقت ہے۔ نہ عقل نہ دل۔ دل تو اپنے بیگانے سب سے محبت کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کسی کا دل وہ نہیں دکھاتے جن کے اپنے دل دکھے ہوئے ہوں۔

شوہر نے سوال کیا۔ نشاط اپنی طبیعت پر قابو رکھتے ہوئے بولی ۔نہیں ۔اب تو
سنا ہے کہ وہ نفرت کرتی ہے ۔ احتشام نے کہا دوسروں کو دھوکہ دینے سے خود بھی
دھوکہ کھانا پڑتا ہے ۔مگر منان بڑے متاثر ہیں ۔نشاط ہونہہ کہکر وہاں سے
اپنے کمرے میں چلی آئی ۔ وہ جب اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے ڈوبتے ہوئے سورج
کو دیکھنے لگی تو اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر آ ڈھلکے
وہ سوچنے لگی کہ کیا وہ منان سے نفرت کرتی ہے ۔ دور کوئی بانسری پر گا رہا تھا۔
یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے ۔

اچھوتا خواب

سرور ظفر صاحب

وہ حسین تھی ایک سنہری خواب کی طرح ۔اس کی مدبھری نیلگوں آنکھوں میں ہزاروں گہرائیاں پنہاں
تھیں اسکے لانبے گھونگروالے بال ریشم کی طرح چمکدار اور ملائم تھے اس کی سریلی آواز میں چشموں کا ترنم
تھا۔ یہ ملکہ حسن ۔ ہوا کی طرح آزاد اور چڑیوں کی مانند خوش۔ خوبصورت پریاں اس کی
ساتھی۔ درختوں کے خوش ذائقہ پھل اسکی غذا۔ تالاب کا سرد و شیریں پانی اسکی تشنگی کو تسکین
دیتا تھا۔ اس کی زندگی ایک دلکش نغمہ ایک خوش آئند خواب تھی ۔
زمانہ گزرتا گیا۔ وہی خوبصورت تالاب اور بن اور وہی آزاد فضا رہی خوش گلو
چڑیاں اب بھی اس کی ہمنوا تھیں ۔ وہ اب بھی آہوان سیاہ چشم کے ساتھ کھلتی تھی
لیکن یہ رنگین دنیا ۔یہ حسین تنہائی ۔ اس میں ایک نامعلوم سی کمی تھی اسکو تلاش تھی
جستجو تھی ۔ خواہش تھی ۔ کس چیز کی ؟ یہ وہ خود نہیں جانتی تھی ۔ وہ بے
بے چین تھی ۔ کیوں ؟ یہ اسے خود معلوم نہ تھا ۔!
وہ آگیا۔ بہت دور سے افق کی گہرائیوں کی طرف سے ۔اپنی ننھی چھوٹی سی
کشتی کھیتا ہوا ۔ وہ آگیا ۔ اپنی رفیقہ ۔اپنی ہمدم ۔ اپنی خوابوں کی دنیا

زیبی

سلمیٰ سراج

شادی تھی انکی۔ کب؟ ۔یہہ کیا معلوم یہہ تو زیبی کو معلوم تھا۔ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی زیبی کے پاس کہنے لگی کیا آپ نہیں جائیں گے چچی کے پاس ۔ بھئی آج ہی سے چلئے۔ سنبل کی شادی ہے نا۔ میں تو آج ہی جا رہی ہوں ۔ میں راضی ہو گیا ۔کیوں؟ نہ جانے کیوں راضی ہو گیا چچی کے پاس جانے میں کتنی دیر لگتی ہے اور ہاں سنبل بھی تو ہے وہاں ۔ کتنی شریر لڑکی تھی وہ لیکن اب نہ جانے کیا ہو گیا تھا اسکو آج کتنی رونق تھی چچی کے گھر میں سارا گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا ۔ اور ہم بھی تو مہمان تھے یہاں پر ۔ اب وہ رخصت ہونے والی تھیں یہاں سے چند ہی دنوں میں ۔ جانے والی تھیں اپنے گھر ہاں پیا ہی گھر ہوا وہ لوگ اس گھر کو پیا ہی کہتے ہیں ۔ زیبی چھیڑ رہی تھی، انکو ۔ اور وہ ۔ وہ تو ہنس رہی تھیں، اسکے چھیڑنے پر ۔ نہ جانے کیوں؟

میں سوچ رہا تھا کہ ہم ایک ہی شہر میں رہتے تھے ۔ ایک ہی گھر میں ۔ مگر نہ معلوم کیوں ان کو مجھ سے نفرت تھی یا ۔ وہ خود سے میرے سامنے نہ آتیں ۔ کیا معلوم کیا تھا ۔ کہتے ہوتے آتے باتیں کرنے کے لیکن وہ مجھ سے کترا کر ہی نکل جانے کو بہتر سمجھتی تھیں ۔ میرا کوئی بھی تو کام ایسا نہ تھا جس کو میں لینا چاہتا تھا ان سے ۔ اور وہ لے رہی ہوں زیبی سے ۔ زیبی تھی بھی تو ایک ایسی لڑکی کہ دل چاہتا ہی رہے کہ اس کو ستائے جاؤ اور وہ جب چنچنی تھی جب لطف آتا تھا ۔ ستانے کا ۔ کس مزے سے چنچنی تھی ۔ ستانے پر ۔ لیکن کام کرنے کے لئے فوراً تیار ہو جاتی ۔ کیوں؟ یہہ تو خدا ہی جانے ۔ لیکن لطف تو انکی موجودگی میں ستانے سے آتا تھا ۔ کبھی تو اس کی حمایت ہوتی ۔ اور کبھی ۔ بیچاری کو خاص طور سے بنانے اور ستانے کے لئے بھیجا جاتا ۔ ہاں تو میں کہاں تھا؟ ۔ جتنا یہ میرا کام کرتا تو عار سمجھتی تھیں ۔ اور مجھکو جانا پڑتا چچی جان کے پاس ۔ کہنے کہ یہہ میرا کوئی کام نہیں کرتیں ۔ اس لئے مجھکو بھی ان کو

پڑھانا چھوڑنا پڑے گا ۔ لیکن یہ کہنے سے پہلے ہی وہ نظر آجاتی تھیں ۔ کتابیں لئے ہوئے ۔ سوال پوچھتے
ہوئے کہ ذرا سا سوال پوچھا تو بھی نہیں بتاتے اور سب کے سامنے شان کرتے پھرتے ہیں کہ میں
پڑھاتا ہوں ۔ کچھ پڑھاتے تھوڑی ہیں ۔ اس پر بھی کہتیں کہ اگر وہ پڑھاتا نہیں ہے تو تم اس
درجہ پر یہ پہنچیں کیسے ؟ ۔ لیکن ان کو اس سوال کا جواب تھوڑی دینا ہوتا ۔ اور اس کا جواب مجھکو
ملتا ہے کہ میری طرف پلٹ کر جھنجھلا دیا یا یہ کہہ دیا ان کو پڑھانا تھوڑی آتا ہے " یہ تو آتے ہیں
صرف میری سہیلیوں کے خط دیکھنے جو وہ مجھکو لکھتی ہیں ۔ اور دیکھتے ہیں کہ میری دوستی کس قسم کی ۔
لڑکیوں سے ہے ۔ ہاں جیسے میں بھی اتنی بیوقوف ہوں کہ ان کو خط دکھا دونگی ۔ بڑے آئے پڑھانے
والے ۔ اور پھر بھی جان بیچاری خاموش رہ جاتیں ۔ انکو غصہ میں اس طرح جاتے ہوئے دیکھکر ۔
کیوں نہ ہوں یہ بہن بھی تو اولاد میں آخری بیٹی ۔ اور ہاں آخری اولاد ماں باپ کے لئے زیادہ
عزیز ترین ہوتی ہے ۔ لیکن اب ۔ اب میں نے ان کو پڑھانا چھوڑ دیا ۔ یا یوں کہئے کہ وہ اس قدر بڑھ
گئی ہیں اب کہ میرے پڑھانے کی ضرورت ہی نہیں رہی ۔ لیکن زیبی پڑھنا چاہتی تھی ۔ مجھ سے ۔ ان کے
منع کرنے پر بھی ۔ اب وہ مجھ سے پڑھتی تھی ۔ اور وہ ۔ خاموش ہو گئی تھیں ۔ بالکل خاموش ۔
جیسے آتش فشاں پھٹ کر خاموش ہو گیا ہو ۔ جب دیکھو خاموش بیٹھی ہوئی پڑھتی رہتیں ۔ اور
انکو پڑھتے دیکھکر ۔ مجھکو وہ زمانہ یاد آجاتا جب کہ میں پڑھاتا تھا ۔ میں نے چاہا کہ وہ مجھ سے کچھ باتیں
ہی کیا کریں لیکن اب وہ زیبی سے بھی تو کم باتیں کرتیں ۔ بہت ہی کم ۔ خاموش زندگی اور یہی کتابیں
جن سے پہلے نفرت تھی صرف میرے پڑھانے کی وجہ سے ۔ ہاں ! تو شاید اب بدل گئی ہو ۔ کتابوں
کی نفرت محبت میں ۔ کئی دفعہ میں نے جاننے کی کوشش کی ۔ میرا دل چاہتا کہ معلوم کروں کہ یہ کیا پڑھتی
ہیں ۔ کس سے معلوم ہوگا ۔ ؟ ان کے کمرے میں جاتے ہوئے نہ معلوم کیوں جھجھک محسوس ہوتی ۔ !!
ایک رات ۔ چاندنی رات میں وہ اکیلی بیٹھی ہوئی تھیں ۔ کچھ پڑھ رہی تھیں ۔ کتنی حسین تھی وہ رات
باتیں کرنے کا بہترین موقعہ تھا وہ ۔ لیکن انکو باتوں کے لئے فرصت ہی کب تھی ۔ میں انکو خاموش کھڑا
دیکھ رہا تھا زیبی آگئی ۔ کہنے لگی آپ یوں کھڑے کیوں ہیں ؟ بیٹھ جائیے نا ۔ آپ جھجکتے کیوں
ہیں بھابی تھوڑی ستاتی ہیں یہ ۔ اور نہ ہی چڑھاتی ہیں ۔ کیوں ٹھیک ہے نا ؟ ۔ اب تو بالکل
سنجیدہ ہو گئی ہیں ۔ میں بیٹھ گیا ۔ باتیں کرنے کے لئے ان سے ۔ اور وہ آج نہ معلوم کیوں ؟ ۔ اچھے
پرانے طرز سے بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھیں یا مجھ کو دیکھکر پڑھنا شروع کر دیا تھا ۔ کیا معلوم
آج شاید میری قسمت کھل گئی تھی ۔ کہنے لگیں ۔ آپ پڑھا دیا کیوں نہیں کرتے زیبی کو ۔ ہر وقت

میرے پیچھے پڑی رہتی ہے - نہ جانے کیا پڑھنا چاہتی ہے مجھکو تو فرصت نہیں - میں پڑھاتا تو تھا لیکن کیوں کہا انھوں نے - کون جانے کیوں کہا - آج کتنے دنوں بعد وہ بولی تھیں مجھ سے میں خوش تھا کہ اب باتیں کرنے کا موقعہ خوب تھا لیکن قسمت ہو جب تو وہ تو یہہ کہکر چلی گئیں اور میں وہیں زیبی کے ساتھ رہ گیا - خیر یہہ ہی کافی تھا لیکن یہہ زیبی بھی تو بدلتی جا رہی تھی - ا ن کے ساتھ رہ کر - اب میں زیبی کو پڑھاتا تھا - بہت ہی محنت سے - انکا کہنا جو تھا - شاید یہی وجہ ہو ہاں - زیبی کی باتیں اب نہ معلوم کیوں اچھی لگتی تھیں - میں پڑھاتا رہا - یہاں تک کہ میں نے ان کو بالکل بھلا دیا - نہ جانے کیوں اب زیبی ہی کی باتیں اچھی لگتیں - میں نے اسکو ستانا بھی تو چھوڑ دیا تھا - آخر کس طرح نہ بھلاتا - کہاں تک یاد رکھتا - خود ہی تو انھوں نے اس کا موقعہ دیا تھا - کیوں دیا تھا ؟ - یہہ کیسے معلوم ؟ - نہ زیبی کو - نہ مجھکو - ان کی بے رخی ہی نے تو مجھکو زیبی کی طرف متوجہ کیا تھا - زیبی کتنا اچھا نام ہے میں پہلے ہی سے اسکی طرف متوجہ نہ ہوا - کیوں نہ ہوا مجھکو حیرت ہے - اتنی اچھی لڑکی ہے وہ - لیکن ان کی توجہ دلانے سے خوبیاں نظر آئیں اور ہاں - وہ بھی تو مجھکو پسند کرتی تھی جب ہی تو وہ خاموشی سے میرا کام کرتی تھی - ستاتے پر بھی اب ان کی شادی ہے - مجھے کیوں برا لگے - میں اپنی شادی تو کر چکا - تو کیا ان کی شادی نہ ہو دل نہیں چاہتا - اتنے میں زیبی کہنے لگی - یاد نہیں آپ کو وہ دن جب ہم تینوں ایک جگہ ہوتے اور وہ لڑائیاں - یہہ سنبل خود سے لڑتی تھیں آپ سے - پھر کہنے لگی - سنبل پہلے آپ کو پسند نہیں کرتی تھیں - لیکن پھر پسند کرنے لگی تھیں - اور جب سے انکو معلوم ہوا کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں - وہ بالکل خاموش ہو گئیں - اور ہمارے درمیان سے ہٹ گئیں - اور ہم دونوں مل گئے - انکی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر - مجھے سنکر افسوس ہوا - نہ معلوم کیوں ؟ لیکن سنبل ہنس رہی تھی یہ سنکر - کہنے لگیں - یہہ ہی تو ہوتا ہے ورنہ یہاں کا نام دنیا نہ ہوتا بھلا یہہ کیسے ہوتا کہ اس دنیا میں کوئی باوفا ہو - یہہ تو جگہ ہی ایسی ہے - بے وفاؤں کے رہنے کی جگہ - دنیا اور وفا - کتنا بڑا فرق ہے - ان دونوں میں - کبھی نہیں مل سکتے یہہ دو لفظ - ان الفاظ کے ساتھ ہی اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے - پھر میری اور زیبی کی آنکھیں بھی پر نم تھیں - پھر بھی سنبل ہنس رہی تھی - نہ جانے کیوں ؟ -

یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے

(فسانہ)

جب شمیم اختر صدیقی

صبح صبح جب نشاط کی آنکھ کھلی تو مکان کے نچلے حصے میں بڑی گڑبڑ ہو رہی تھی ۔ وہ بستر ہی پر پڑے پڑے سوچنے لگی کہ کیا بات ہے۔؟ آج سب بچے اتنی جلدی کیوں اٹھ گئے ۔ ابا جان انکی دعا چوکڑی پر کچھ کہتے بھی نہیں آج تو ایسا شور مچا رہی ہیں گویا عید کی صبح ہے ۔ سکون پسند نشاط نے کروٹ بدلکر آنکھیں بند کر لیں اور سوچنا چاہا ۔ مگر اللہ رے شور ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ آپا آپا دروازہ کھولو ۔ بازو کی پلنگ پر سوئی ہوئی فرحت بھی جاگ پڑی ۔ کیا ہے آپا ۔؟ مجھے کیا معلوم ۔ نشاط دروازہ کھولتے ہوئے بولی ۔ کیوں کیا ہے رفو ۔؟ ارے بجی منے بھائی آئے ہیں ۔ کون منے بھائی بڑی حویلی والے ماموں جان کے بیٹے فرحت نے اچھلکر پوچھا ۔ رفو خوشی سے سر ہلاتے ہوئے بولی ۔ ہاں ہاں وہ آج صبح لہ بجے کی ٹرین سے آئے ہیں بس اسوقت سے ہم جاگ رہے ہیں ۔ ارے بڑا مزہ آرہا ہے کتنے اچھے ہیں منے بھائی ۔ کیوں فرحت آپا ۔؟ تم دونوں تو ایسے گھوڑے بیچ کر سوتی ہو اتنے شور بھی نہیں اٹھیں ۔ تمھیں پوچھ رہے تھے فرحت آپا ۔! مجھے ۔! تو تم نے مجھے اٹھا کیوں نہ دیا ۔؟ فرحت چونک کر بولی ۔ پھر نشاط سے مخاطب ہوئی ۔ آپا تم پچھلی چھٹیوں میں ثریا باجی کے یہاں چلی گئی تھیں ۔ اس وقت منے بھائی یہاں آکر آٹھ روز رہے تھے ۔ اللہ کیا بولوں آپا اتنا مزہ آیا نشاط نے اس کا کوئی جواب نہ دیا ۔ اور فرحت جو آپ کا انتظار کیئے بغیر فوسمت غائب ہو گئی نشاط سوچنے لگی کہ وہ نیچے جائے یا نہیں ۔ اسی شش و پنج میں تھی کہ ماما نے آکر کہا ۔ امی جان بلا رہی ہیں بی بی ۔ نشاط نے پوچھا اچھا گلشن دالان میں کوئی ہے کیا ۔؟ جی ہاں آپ کے بڑی حویلی والے ماموں جان کے لڑکے منان میاں آئے ہیں وہ بیٹھے ہیں ۔ اچھا ۔ چلو میں آتی ہوں ۔ خوب نام رکھا ہے بڑی حویلی والے ماموں جان کے بیٹے ۔ وہ آپ ہی آپ ہنس پڑی ۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتی دالان میں آگئی ۔ دالان میں اس کی ماں اور منان بیٹھے تھے ۔ بچوں نے منان کو گھیر رکھا تھا منے بھائی منے بھائی سے مکان سر پر اٹھا لیا ہر ایک اپنا نامہ منے بھائی کو

سنا رہا تھا۔ اور منے بھائی بڑے بوڑھوں کی طرح سر ہلا اور مسکرا کر انکی داد دیتے رہے تھے نشاط کو دیکھتے ہی سب بچے اس کی طرف منے بھائی آئے ہیں کہتے ہوئے دوڑے۔ اسکی ماں نے پکار کر کہا۔ آؤ نشاط منے بھائی سے ملو۔ نشاط ناچار اپنی ماں کے قریب آ کر منے بھائی کو سلام کر کے بیٹھ گئی منے بھائی بولے پھوپھی جان نشاط کو میں اکیلے دیکھ پاتا تو ہرگز نہ پہچانتا۔ امی نے ہنس کر کہا بہت دنوں بعد دیکھا ہے۔ یہ تو ہر چھٹیوں میں اپنی سہیلوں کے یہاں چلی جایا کرتی ہے۔ تم اس بار جو آئے تھے تو یہ ثریا کے یہاں چلی گئی۔ منے بھائی ہنس کر بولے اچھا ہوا جواب آ گیا۔ ورنہ پھر ملاقات نہ ہوتی مگر سنو نشاط بھی بچپن میں تم مجھ سے بڑا لڑا کرتی تھیں۔ کہیں پھر ایسا لڑنا نہ شروع کر دو۔ منے بھائی اور امی ہنس پڑے اور نشاط نے سر جھکا لیا۔

۲

سنان میڈیکل کالج میں یہاں اپنا داخلہ کرانے آئے تھے۔ اور اب اپنی بڑی پھوپھی کے یہاں مقیم تھے۔ نشاط بہت کم سخن اور تنہائی پسند لڑکی تھی اس لئے اس نے اپنا کمرہ بالائی منزل پر چنا تھا۔ جو سب سے الگ تھا۔ نشاط بڑی اچھی صورت شکل کی مالک تھی۔ اس پر اسکی سنجیدگی، سمجھداری اور سلیقہ اسکے حسن کو بڑھانے میں غضب کا حصہ لیے رہے تھے۔ وہ روزے نماز کی بھی بڑی پابند تھی جیسے دیکھ کر ہر کوئی اسکے لئے اپنے دل میں جگہ کر لیتا تھا نشاط کو بہت سے چھوٹے بھائی بہن تھے صرف مشتاق ہی اس سے بڑا تھا جو ہمیشہ اسکو چھیڑا کرتا اور ستایا کرتا۔ ورنہ سب چھوٹے بھائی بہن اس کا بڑا ادب لحاظ کرتے۔ مشتاق کی شرارتوں میں سنان کے آنے کی وجہ سے اور اضافہ ہو گیا تھا۔ گو سنان مشتاق سے عمر میں چار سال بڑا تھا۔ مشتاق کی ساری شرارتیں نشاط کے ساتھ رہتیں۔ جب وہ کسی کام سے نیچے ہوا کرتی تو مشتاق اس کے کمرے میں پہنچ جاتا اور ساری چیزیں الٹ پلٹ دیتا کبھی فونٹن پن غائب کر دیتا اکثر جب نشاط اپنے دوپٹے رنگ کر سوکھنے ڈالتی تو وہ اس پر دوسرے رنگ کے بڑے بڑے دھبے ڈالدیا کرتا۔ نشاط یہ دیکھ کر اپنی پیشانی پر بل ڈالیتی اور بعض وقت اگر بہت ناگوار گذرا تو ماں سے کہتی امی بھیا کی کیا عادت ہے میری ساری چیزیں خراب کر دیتے ہیں۔ اور جب ماں مشتاق سے کہتی۔ ارے احمق بہن کا ساتھ ہمیشہ کا نہیں۔ اتنی اچھی نیک بہن سب کو نہیں ملا کرتی۔ ذرا قدر کر۔ وہ فوراً نشاط کے قریب آ کر اسکے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ رکھدیتا اور کہتا کتنی اچھی ہے میری بہن۔ اس پر نشاط بولتی ہٹیئے جائیے بڑے بھیا آئے۔ مشتاق کہتا دیکھا امی اور پیٹ سے ایک چپت بہن کے سر پر رسید کر کے ہوا ہو جاتا۔ دونوں بڑے ہو گئے تھے مگر ابھی تک بچپنا نہیں گیا تھا۔

تیسر سنہ ۵۶-۵۵ء

شہاب

منان کو آکر تقریباً چھ مہینہ ہو رہا تھا۔ مگر نشاط نے کبھی بھی اس سے اپنی طرف سے بات نہ کی تھی۔ جب کبھی وہ کچھ پوچھ بیٹھتا تو یہ جواب دیتی۔ اور اکثر جب دیکھتی کہ مشتاق اور منان آ رہے ہیں تو وہ وہاں سے الگ ہو جاتی۔ منان سے وہ کافی غیریت برت رہی تھی کئی دفعہ اسکی ماں نے نشاط سے کہا بھی کہ آخر تم منان سے اتنی غیریت کیوں کرتی ہو۔ وہ بھی تو تمہارے ماموں کا بیٹا ہے نہیں معلوم دل میں کیا خیال کرے کہیں یہ نہ سوچے کہ نشاط کو میرا یہاں رہنا ناگوار گذر رہا ہے نشاط یہ سن کر بھی خاموش رہتی۔ شاید وہ کوشش بھی کرتی تو منان سے جلدی بے تکلف نہ ہو سکتی

منان کے دل میں نشاط کی بھولی بھالی خاموش ادائیں گھر کر رہی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ نشاط ہمیشہ اسکے سامنے رہے۔ اور اس سے بے تکلفی سے باتیں کرے۔ جس طرح وہ مشتاق سے کیا کرتی ہے۔ وہ نشاط کی بڑی قدر کیا کرتا۔ جب کبھی مشتاق نشاط کو چھیڑتا یا ستاتا تو وہ ہمیشہ نشاط کا ساتھ دیتا۔ جب کسی چیز کے لئے اپنے باپ یا مشتاق سے فرمائش کرتی منان فوراً وہ چیز لے آتا۔ آخر نشاط بھی انسان تھی اس نے جب دیکھا کہ منان اس کی بہت قدر کیا کرتا ہے تو وہ بھی اسکی قدر کرنے لگی۔ آخر اس قدر نے اسکے دل میں بڑی جگہ کر لی یا آخر وہ بھی خاموشی سے منان کو دل میں پوجنے لگی۔ اور ادھر منان نے بھی!

منان کو یہاں رہتے ہوئے آٹھ ماہ ہو گئے تھے وہ ایک دفعہ اپنے گھر گیا اور نہ معلوم جا کر کیا کہا اسکے واپس آتے ہی منان کے باپ کا خط بہن کے نام آیا کہ وہ نشاط کو اپنے گھر کا چراغ بنانا چاہتے ہیں۔ بھلا نشاط کی ماں اور باپ کو کیوں نا منظور ہوتا۔ انہوں نے جواب میں لکھ بھیجا کہ ہمیں آپکی بات منظور ہے لیکن شادی بعد تعلیم ختم کی جائے گی۔ اس کی خبر لڑکا لڑکی کسی کو نہ دی گئی۔ منان اپنی کامیابی پر خوش تھے۔ گرمی کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو اس دفعہ نشاط نے ثریا کو اپنے ہاں بلایا ثریا نشاط کی کوئی رشتہ کی بہن تھی۔ نشاط ثریا کے آنے سے بے حد مسرور تھی گو ثریا نشاط سے عمر میں کچھ چھوٹی ہی تھی۔ مگر بڑی شوخ طرار لڑکی تھی۔ ہر ایک سے جلد بے تکلف ہو جاتی۔ جہاں نشاط کا حسن خاموش تھا اس کا حسن اتنا شوخ تھا اس لئے نکھار زیادہ ثریا ہی پر تھا۔ ثریا آ گئی اور سارے گھر پر چھا گئی۔ نشاط کی ماں کا خیال تھا کہ ثریا اور مشتاق کا جوڑ ٹھیک رہے گا اس لئے وہ اسے بہت چاہا کرتی۔ منان جوان تھے۔ خوبصورت تھے۔ انکی باتوں میں بڑی لطافت تھی۔ بڑے نقاط تھے اپنی اسی نقاطی سے اپنی پھوپھی کو بھی خوش کئے ہوئے تھے۔ اور اپنی نقاطی سے لڑکیوں کو بھی خوب اُلّو بناتے اور ان کے معصوم دلوں میں جگہ کر لیتا انکے مائیں ہاتھ کا کھیل

ثریا بھی بہت جلد انکی باتوں میں آگئی۔ اور منان کو یوں بھی شوخ طرار طرحدار لڑکیاں پسند تھیں۔ اور ثریا میں
ان باتوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ صرف نشاط ہی ایک ایسی لڑکی تھی جو انکی باتوں میں جلد نہ آسکی۔ اور جب اُنہنے
انہیں اپنے دل میں جگہ دی تھی تو زبان سے کبھی اقرار نہ کیا تھا۔ اور نہ منان کی اتنی ہمت ہوئی کہ وہ اقرار
کرا لیتے۔ چھٹیاں ختم ہونے کو آگئیں مگر منان گھر نہ گئے ثریا آئی تھی ایک ہفتہ کے لئے لیکن اُسے آکر ایک
ماہ ہو رہا تھا نشاط نے بھی جلد محسوس کر لیا کہ منان اب وہ نہ رہا۔ اُسے ثریا سے اس بات کی شکایت ہو گئی
کہ وہ اسکے حق پر حق جما رہی ہے۔ مگر خاموش فطرت نے اپنے دلی رنج و کدورت کو چھپا لیا۔ کوئی جان بھی نہ سکتا
تھا کہ جب منان اور ثریا اسکے سامنے ہوتے تو اس کا دل کس قدر پیچ و تاب کھاتا۔ منان نے تو اب ایسی آنکھیں
پھیر لیں گویا اُسے جانتا ہی نہیں۔ جب منان مشتاق ثریا اور نشاط کبھی بیٹھکر باتیں کرتے تو وہ زیادہ ثریا ہی
کو مخاطب کرتا تھا۔ نشاط کو ان باتوں کی بڑی تکلیف تھی۔ ایک دن حسب عادت مشتاق ثریا اور نشاط
کو بنا رہا تھا کہنے لگا کہ تم عورتیں بڑی بے وقوف ہوتی ہیں۔ ثریا چمک کر بولی "تو مرد کب عقلمند ہوتے
ہیں کیوں نشاط تم تو کچھ بولو" نشاط بڑی متانت سے بولی "ہاں ثریا بھیا ٹھیک کہتے ہیں کہ عورتیں بیوقوف
ہوتی ہیں۔ اس لیئے کہ وہ مردوں کی دھوکہ باز عادتوں اور انکی چکنی باتوں میں جلد آجاتی ہیں۔ اور سن
[illegible]د بھی کبھی قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ کیوں منان بھائی" وہ ذرا سا مسکرا دی۔ منان پر گھڑوں
پانی پڑ گیا۔ گر ڈھٹائی سے بولے "میں آپ کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں" نشاط نے دوپٹے کا کونہ انگلیوں
میں لپیٹتے ہوئے کہا "جی ہاں۔ آپ کو ماننا بھی نہ چاہیئے مانا کریں گے تو بات ہی کیا ہوگی۔ فوراً ثریا بولی
سچ ہے منان صاحب مرد ہوتے ہی ہیں بے وفا" نشاط نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اوہ!
ثریا تم خوامخواہ اس وقت بیوفائی کا دکھڑا لے بیٹھیں۔ دیکھو نا منان بھائی نے کتنا برا منہ بنا لیا۔
غالباً اس گرمی میں بھی انکے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے ہونگے" وہ ایک تلخ ہنسی ہنس دی۔ منان بُری طرح
ہار رہا تھا۔ اس لئے چڑ کر بولا "آپ تو ساری لڑکیوں کو مردوں سے باغی بنا دیں گی۔ میں سمجھتا ہوں
کہ تم جیسی لڑکیوں کی بات پر کسی اور لڑکیوں کو کبھی غور نہ کرنا چاہیئے" پھر اُسنے ثریا کی جانب دیکھا
گویا کہہ رہا ہے کہ ثریا تم نشاط کی باتوں پر غور نہ کرو۔ نشاط نے بھی منان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "
بےشک ثریا تم کبھی میری باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا تم تو منان بھائی کی سنتے جاؤ۔ اور میری ہستی ہی کیا
ہے میں لڑکیوں کو مردوں سے باغی کر دوں۔ نہ میں بدلہ ہی لے سکتی ہوں" گفتگو تلخ ہوئی جا رہی
تھی یوں تو عورت اور مرد پر بحث ہمیشہ انکے درمیان چھڑا کرتی تھی۔ مگر سب اسے تو تفنن طبعی
کے لئے چھیڑا کرتے تھے۔ مگر آج تو بات ذرا بگڑنے ہی لگی۔ مشتاق نے کہا۔ "ارے نشاط آج تو تم

خواہ مخواہ بگڑی جا رہی ہو۔ منان نے طنزیہ لہجہ میں کہا "یہ تو انکی پرانی عادت ہے" اور ثریا سے باتیں کرنے لگا۔ یہ بات نشاط کے دل پر نقش کر گئی۔ وہ اٹھکر اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ ثریا کو معلوم تھا کہ نشاط کی ماں اور منان کے باپ نے یہ طے کر لیا ہے کہ بعد تعلیم ان دونوں کا بیاہ رچایا جائے گا۔ اس بات کا احساس اُسے چند دن رہا پھر تو وہ یہی سوچنے لگی کس طرح وہ منان کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لے۔ چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ ثریا چلی گئی۔ منان بھی افسردہ سے ہو گئے۔ اور نشاط نے بھی اپنی زندگی میں خاموشی کو اور جگہ دیدی تھی۔

چار پانچ دنوں کی چھٹیوں میں منان گھر گئے ہوئے تھے۔ ایک دن مشتاق نے ایک خط لاکر اپنی ماں کو دیا۔ ماں نے خط کھولکر پڑھا۔ خط پڑھتے پڑھتے رنگت بدل گئی۔ مشتاق اور نشاط حیران ہوکر ماں کی طرف دیکھنے لگے۔ مشتاق نے پوچھا "کیا ہے امی"۔ ماں نے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ بیٹے ابا کو بلا لاؤ مشتاق۔ اور ہاں بیٹی نشاط تم آج ایک سالن پکا لو میں نہیں پکا ؤنگی۔ نشاط باورچی خانے میں چلی گئی۔ مشتاق کے باپ اندر آئے "کیوں خیریت بیگم"۔ بیگم ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولیں۔ ہاں خیریت۔ لو یہ خط پڑھو۔ بڑی حویلی والے بھائی جان کا ہے۔ باپ نے خط ہاتھ میں لے لیا اور پڑھنے لگے۔ پڑھنے کے بعد غصہ سے بولے "میں تو انہیں اتنا ذلیل نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے کب ان سے خوشامد کی تھی۔ خود تمہارے بھائی جان نے خط بھی اور خود مجھ سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم منان کو اپنی فرزندی میں لے لو۔ اور لکھا بھی تو یہی تھا اس پر میں نے کہا کہ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ جب منان سے مرضی معلوم کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ یہیں شادی کرے گا۔ اب آپ کے بھائی صاحب لکھتے ہیں کہ میں منان کی مرضی کے بغیر شادی نہیں کر سکتا۔ جب منان کی مرضی معلوم کی گئی تو آپ کے یہاں شادی سے انکار کرتا ہے اس لئے میں نے اسکی پسند سے اس کی نسبت ہدایت علی خاں کی لڑکی ثریا سے طے کر لی ہے شادی دو ماہ بعد ہو جائیگی۔ تاریخ مقرر کرنے بعد اطلاع دونگا۔ آپ لوگ اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ کیونکہ یہ منان کی زندگی کا مسئلہ ہے امید ہے کہ آپ لوگ ضرور شرکت کریں گے" سنا۔ یہ تو ہیں کب ان کی خوشامد کر رہا تھا۔ ماں نے کہا اچھا ہے ہدایت علی خاں کی لڑکی ثریا سے ہو رہی ہے۔ جب وہ یہاں آئی تھی تو میں ان دونوں کی حرکتوں سے سمجھ رہی تھی کہ صاحبزادی گل کھلائیں گی۔ یا اللہ تیرا شکر ہے کہ میں نے مشتاق کی بات اس لڑکی سے پختہ نہ کر دی تھی۔ ایسے میں تو

کہتی ہوں کہ بھائی جان کو ایسا جواب دیا جائے کہ خوب شرمندہ بھی ہوں۔ اور شادی میں شرکت کرنا کچھ ضروری نہیں ہے۔ کیا میری لڑکی کو لڑکے ہی نہ ملیں گے ۔ اور ہاں جو قمرالدین صاحب کے لڑکے سے پیغام آیا ہے نا بس منظور کر لو ۔ لڑکا بہت اچھا اور نیک سیرت ہے ۔ اور کامیاب ڈاکٹر بھی تو ہے ۔ باپ نے کہا میں بھی حال چال پوچھوا چکا ہوں ۔ کل ہی بات طے کر لونگا ۔

نشاط کو یہ سنکر اور تکلیف ہوئی کہ منان نے کہا ہے کہ وہ یہاں شادی نہیں کریگا مت کرے ۔ کہا کس نے تھا ۔۔۔ ! منان جس طرح تم نے میرا جی جلایا خدا تمھارا بھی اسی طرح جلائے ۔ جب وہ صبح میں اٹھی تو بجائے منان سے محبت کے اسکے دل میں نفرت موجزن تھی .... !

۵

ایک ماہ بعد نشاط کی شادی قمرالدین صاحب کے لڑکے ڈاکٹر احتشام الدین سے ہو گئی ۔ احتشام اور منان بڑے گہرے دوست تھے ۔ منان کی شادی اس لئے رکی ہوئی تھی کہ جب تک یہ ڈاکٹر نہ ہو جائیں لڑکی والے شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھے ۔ ابھی انہیں ڈاکٹر ہونے میں ڈیڑھ سال کی دیر تھی ۔ تھوڑے دنوں بعد نشاط کو اپنے شوہر سے معلوم ہوا کہ ثریا کی شادی ہو گئی ۔۔ وہ پوچھنے لگی ۔ ارے منان بھائی نے ہمیں بلایا بھی نہیں ۔ اس کے شوہر نے دھیمی آواز میں کہا ۔ وہ لوگ بڑے دھوکہ باز نکلے ۔ منان سے شادی ٹھیک کر کے کسی اور جگہ کر دی ۔ نشاط قریب قریب چیخ کر بولی تو کیا منے بھائی سے ثریا کی شادی نہیں ہوئی یا اللہ تو نے کس طرح ان سے بدلہ لیا ہے ۔ احتشام نے حیرت سے نشاط کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ بیگم بدلہ کیا ۔ نشاط نے نگاہیں نیچی کر لیں ۔ اور آہستگی سے بولی ہاں اللہ نے بدلہ ہی لیا انہوں نے ایک بھولی بھالی لڑکی کو تین سال تک اپنی باتوں میں پھنسا رکھا تھا ۔

اور وہ بیچاری بھی ان سے محبت کرنے لگی ۔ پھر انہوں نے ثریا کو دیکھ لیا ۔ اور اس لڑکی کو دھتکار کر ثریا کو اپنے جال میں پھنسانے لگے ۔ اور وہ بھی پھنس گئی ۔۔ اور اس لڑکی کی یہ آہ ہے جو لگی ہے ۔ مگر قدرت نے خوب انتقام لیا ہے ۔ احتشام نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا ۔ کیا بیگم تم اس لڑکی کو جانتی ہو ۔ نشاط بولی ۔ ہاں میں اس لڑکی کو پہچانتی ہوں ۔۔ تو اب بھی اس لڑکی کے دل میں محبت منان کی

رباعیات

جناب فخر الدین احمد صاحب سعید۔ بی۔ اے (عثمانیہ)

نکھری ہے شفق کہ تیرے رخ کی رنگت
مہکا سا بدن کہ ہے مجسم نکہت
اک پیکر حسن و رنگ کہیئے تجھ کو
یا چھوٹی سی چلتی پھرتی ہے اک جنت

ہلکے سے مدھر بولوں میں بجتی رو پک
یا زہرہ کے گھنگروؤں کی ہے نرم جھنک
مندر میں دلوں کی گھنٹیاں سی گونجیں
سن لی تری سرخ چوڑیوں کی جو کھنک

ہٹتا سا نقاب تھرتھراتا سا بدن
نکھرا ہوا رنگ رخ لجاتا سا بدن
مدھ آنکھوں میں ڈھلتی رات بیخود سا شباب
اٹھتے سے حجاب کسمساتا سا بدن

قد ہے کہ کھڑی کھڑی سی اک انگڑائی
یا خلد کی شاخ گل یہ لچکتی آئی ،،
کوثر سے ابھر کے ایک موج سیمیں
لہراتی ہوا میں تھر کی اور تھرائی

تلاش کرتا ہوا ــــ وہ وہاں اور اس تھا ــ اس کی رفیقہ کے بغیر اس کے دل کی محفل سونی تھی اجاڑ تھی ــ نکلتے ہوئے سورج کی روشن کرنوں ــ بادِ نسیم کی خوشگوار جھونکوں ــ غنچوں کے چٹکنے کی خوش آئند آوازوں ــ خوبصورت پھلوں کی لدی ہوئی شاخوں کے ساتھ وہ آیا ۔ فضا رایک رنگین قہقہہ بنی ہوئی تھی ۔ ہر چیز نور میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت دو روحوں کے اتصال پر جھوم رہی ہے

حسین ملکہ خوش تھی اور بیحد خوش ۔ جس چیز کی اسکو تلاش تھی وہ اسکو مل گئی ۔ اسکی دنیا میں کوئی کمی کوئی خلا باقی نہ رہا تھا ۔ اس کا رفیق ــ اس کا دوست اسے مل گیا ۔ اسکے دکھ سکھ کا ساتھی اسکی خوشی سے مخرور ہونے والا اسکے رنج و غم میں برابر کا شریک ــ اسکی دنیا کتنی زرین تھی ــ دلفریب و دلکش ۔ ان کی ننھی سی خوبصورت جھونپڑی عشق و محبت کی آماجگاہ اتفاق و یگانگت کا مسکن اور پریم کا مندر ــ

دن نکلتا ــ دوپہر ہوتی ــ شام آجاتی ــ دن جاتا معلوم ہی نہ ہوتا ۔ ایک دن جب وہ ایک چٹان سے اترنے کی کوشش کر رہی تھی اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے زمین پر آ گری ۔ شانہ میں سخت چوٹ آئی ــ اسکے سپنوں کا مالک جو اسکے پیچھے پیچھے آ رہا تھا لپک کر آگے کو بڑھا اسے اپنی مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر نہائی احتیاط کے ساتھ اپنی جھونپڑی پر لے آیا ۔ اور نرم گھانس کے بستر پر آہستہ سے لٹا دیا اسکو کسی قدر تکلیف تھی ۔ کراہنے کی آواز سن کر اسکی محبت بھری آنکھوں میں غم کے آنسو بھر آئے ــ

صبح جب ملکہ کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے جس پر اسکی نظر پڑی وہ اس کے سپنوں کے کے مالک کا مہربان چہرہ تھا ۔ جو جھونپڑی کے چولھے پر جھکا ہوا اپنی ملکہ کے لئے کچھ دوا تیار کر رہا تھا ۔ ملکہ کی کروٹ لینے کی آواز سن کر اسکے پاس آیا ــ محبت و حسرت بھری نگاہیں چار ہوئیں اور ــ میری آنکھ جو کھلی تو سامنے ان کو کھڑا پایا ــ یہہ تھا چھوٹا خواب " !

معاف کیجئے بارہا لکھا گیا ہے کہ کوئی پرچہ اندرون ۱۵ تاریخ نہ ملے تو مکرر طلب کرلیں آپ اس پر کاربند نہیں ہوتے کئی مہینوں بعد طلب فرماتے ہیں اسی صورت میں ظاہر ہے کہ تعمیل کیونکر ہو سکے گی

سہارے چھوٹ گئے

خالدہ شمیم

ڈوبتے ہوئے سورج کی تھکی ہوئی ضعیف اور اداس کرنیں سامنے دیوار کے سینے پر کانپ رہی تھیں، زمین دن بھر کی تگ و دو کے بعد لانبے لانبے سانس لے رہی تھی جیسے خوابیدہ روحوں کو جگا رہی ہو ۔ مغرب کی طرف چھائی ہوئی گھٹاؤں نے ایک انداز معشوقانہ کے ساتھ دم توڑتے ہوئے سورج کی تیز کرنوں کو اپنی گداز آغوش میں کھینچ لیا ۔ یہاں تک کہ سورج کی آخری کرن بھی ہوا میں رکھے ہوئے چراغ کی طرح ایک دم گل ہو گئی اور منظر پر اندھیرا چھا گیا ۔ ایک اداس ہولناک اندھیرا ۔ اور وہ سوچنے لگی کہ شاید اسکی غمگینی کا اثر کائنات پر بھی ہوا ہے

وہ آج ہر روز سے زیادہ بیتاب، بے چین اور غمگین تھی ۔ اسکی مستی بھری آنکھوں کی سیاہیاں اور زیادہ گہری ہو گئیں ۔ وہ ایک تھکے ہوئے انداز کے ساتھ کھڑکی کا سہارا لیئے کھڑی تھی ۔ اس کی بھیگی بھیگی اداس نگاہیں دور بہتی ہوئی ندی کی مچلتی موجوں پر جمی ہوئی تھیں ۔ یہ تڑپتی، مچلتی موجیں اس کے اپنے دل کی ترجمان تھیں ۔ اس کا بے چین اور مضطرب دل ۔ دور سے ایک موج سر بلند کرتی اور ساحل کی تلاش میں مچل کر بکھر جانے نہیں پاتی کہ دوسری تڑپ کر ابھرتی اور ساحل تک پہنچ جانے کی آرزو میں سیکڑوں دائروں میں ۔ اپنے وجود کو فنا کر دیتی ۔ موجوں کے اس ابھرنے ڈوبنے اور مچل مچل کر بکھر جانے میں وہ کچھ اس طرح محو تھی کہ اسے اپنے گرد و پیش کی خبر نہ تھی ۔ کچھ کھوئی کھوئی سی کھڑی تھی ۔ اس کے چاروں طرف نیم تاریکی سی رینگ رہی تھی ۔ ایک سکوت سا چھایا ہوا تھا ۔ المناک سکوت ۔ سنسان اداس، بے ہوش سا لٹا ہوا ۔ اور اس کے دل میں اضطراب کی ایک نامعلوم سی آگ سلگ اٹھی ۔ وہ پلٹی اور چپ چاپ سامنے میز پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی ۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے سر پر ہاتھ رکھے کھڑا ہے ۔

اور اس ان دیکھے ہاتھ سے شفقت کی نرم نرم ٹھنڈی لہریں نکل کر اس کے سارے جسم میں پھیل رہی ہیں — اس کا دل بھر آیا — اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں — اشکوں کے بڑے بڑے قطرے اسکی لانبی پلکوں سے رخساروں پر ڈھلک پڑے — زمزم کے پانی سے زیادہ پاک آنسو — اور یہ اشکوں کے بڑے بڑے قطرے سمندر بنکر پھیل گئے — اس سمندر میں ہلکی ہلکی لہریں ابھرنے لگیں — اس کے غم گین دل کی دنیا میں سلگتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے —

تصویر بدستور اپنی جگہ پر قایم تھی — ساکت و صامت جیسے وہ اسکی ہر ہر ادا کو غور کے ساتھ دیکھ رہی ہو — قریب ہی ایک ننھا منا سا خوبصورت پیانو رکھا تھا — ماں کا آخری تحفہ — وہ ایک مدہوشی کے عالم میں آگے بڑھی اور بیخودی کے ساتھ اس کے پردوں پر سر ڈال دیا — رات کے اندھیرے میں ایک غم ناک نغمہ کانپ اٹھا جس کی دردناکی سے تڑپ کر چاند آسمان پر چھائے ہوئے بھورے رنگیلے بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا — ننھے ننھے ستاروں کے دل بھی درد کی تکلیف سے دھڑکنے لگے — ایک ایک کر کے وہ بھی آسمان کی لامحدود سیاہی میں گم ہو گئے — فضاء زیادہ یاس آفرین، زیادہ دل سوز ہو گئی — وہ اس بے چین تڑپتے ہوئے دل گداز نغمہ کی گہرائی میں ڈوب جانے والی المناکی میں پہنچ کر اپنا غم بھول جانا چاہتی تھی —

بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس نے پھر ایک بار تصویر کو دیکھا — اس کا دل بے اختیار تڑپ اٹھا بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھی اور تصویر کو اٹھا کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا کر وہ پھر سسکیوں، آہوں اور آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب گئی بہت دیر تک اس پر یہ حال طاری رہا اور جب روح فرسا کیفیت پھیل کر رگ رگ میں سما گئی تو دل کا بوجھ کچھ کم ہوا —

اسے وہ رات اب تک نہیں بھولی تھی — اف وہ رات — وہ رات کس قدر وحشت انگیز اور بھیانک تھی — آسمان پر ستارے یوں ٹمٹما رہے تھے مانو اندھیرے کی کثافت ان کا گلا گھونٹ رہی ہو — ہوا جھاڑیوں میں کراہ رہی تھی — کمرہ میں ایک وحشت ناک سکوت پھیلا ہوا تھا — اس سکوت پر موت کا وحشیانہ رقص اور اس کے دل دوز قہقہے چھائے ہوئے تھے — ادھر حیات سسک رہی تھی — اجلے سے بستر پر جیسے چاروں طرف سے لوگوں نے گھیر رکھا تھا اسکی ماں پڑی تھی جسکی آنکھوں کے جگمگاتے ستارے اب جھلملا رہے تھے جیسے اب صبح ہونے کو ہے — دنیا بھر کا درد اور غم سمٹ کر اسکی ماں کی آنکھوں میں سما گیا تھا اور وہ خود سہمی ہوئی باپ کے سینے سے لگی ڈری ہوئی ماں کی آنکھوں کے ستاروں کو جھلملاتا دیکھ رہی تھی —

لیکن ہمیشہ کے لیئے بند ہو جانے والی آنکھوں کی حسرتوں کو وہ پھر بھی نہ سمجھ سکی ۔ اور وہ دیکھتے دیکھتے اس کی نظروں کے سامنے اسکی ماں زندگی کی حرارت سے محروم بے حس و حرکت ہو گئی۔ حس و حرکت سے محروم، خونِ حیات سے تہی دامن ۔ اور جب فنا کی گھنیری بدلیاں پھیل گئیں جن کے اوٹ میں اسکی پیاری ماں ۔۔ اس کی اپنی ماں ہمیشہ کے لیئے روپوش ہو گئی تو اس کا دل پاش پاش ہو گیا ۔ شیشہ دل وہستی نازک ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا ۔ وہ مبہوت رہ گئی ۔ کچھ سمجھ نہ سکی کچھ سوچ نہ سکی آہیں اور سسکیاں اس کے سینے میں مچلیں باہر نکلنے کے لئے ایک طوفان، ایک ہنگامہ برپا کرنے کے لئے ۔ وہ چاہتی تو اپنی آہ شرربار سے فلک کو ہلا ڈالتی ۔ لیکن وہ نالہ و فریاد نہیں کر سکتی تھی کہ کہیں اسکی ماں، پیاری ماں کی روح کو تکلیف نہ ہو ۔ وہ اپنے دل کو کہیں پھینک دینا چاہتی تھی جیسے جدائی کی تاب نہیں ۔۔ اور وہ افسردہ رہنے لگی ۔ مری ہوئی ماں کی حسرت بھری یادہی اب اسکی زندگی کا سہارا ہے ۔۔ لوگوں کی تسلیاں اسے اور بے قرار کر دیتیں، وہ یہ انجانے لوگ کیا جانیں ۔۔۔ دل کا زخم کیسا ہوتا ہے ۔۔ نظر نہ آنے والا چھپا ہوا رستا ہوا زخم جس پر یہ اپنی ہمدردانہ تسلیوں سے اور زیادہ نمک پاشی کرتے ۔۔ اور وہ تڑپ جاتی اپنے درد کا درماں پانے کے لئے ۔

کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور فضا میں ہلکا سا شور گونج اٹھا ۔ تصویر اس کے ہاتھوں سے گر چکی تھی ۔ شیشہ کے ٹکڑے اس کے دل کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئے ۔ ایک منٹ تک تو وہ کچھ سمجھ نہ سکی جیسے دماغ ماؤف ہو گیا ہو اس کا ۔۔ اور دوسرے لمحے وہ بچوں کی طرح سسکیاں بھر رہی تھی ۔۔۔۔ ۔۔

عورت نازک اور ضعیف عورت خاموش اور ایک پتے کے گر جانے سے ڈرنے والی عورت ۔ غرضکہ عورت کے دل کا فیصل ایک ایسی عظیم الشان طاقت ہے جسکو سمندروں کی قہار موجیں ۔ پہاڑ و نکی عریض و طویل چٹانیں زمین کے غار انشگاف زلزلے اور بادشاہوں اور فوجوں کے حملے بھی نہیں توڑ سکتے اس کا دل دنیا کا ایک طلسم مخفی ہے جسکے بھید آج تک نا معلوم ہیں

ہوں

ظفر پروین

میرے آج کے مضمون کا عنوان دیکھنے میں بیحد بہمل مگر دراصل بیحد دلچسپ! ذرا اس ننھے بچے کو دیکھئے آپ اُس سے مختلف سوالات کر رہے ہیں۔ مگر وہ سب کا جواب ایک عجیب انداز سے "ہوں" کہہ کر دیتا ہے۔ ہم اس چھوٹے سے لفظ سے اپنی ہر بات کا جواب انتہائی مفصل اور اطمینان کن پاتے ہیں۔ اسی طرح آپ کسی سے کچھ دریافت کر رہی ہیں مگر اُس وقت وہ غصہ میں ہو تو وہ مکرر سوالوں کا [illegible] تیوری پر بل ڈال کر صرف "ہوں" کہہ دے تو آپ اسکی قلبی کیفیت کو فوراً تاڑ جائینگے گویا "ہوں" اثبات کے سلسلہ کا لفظ ہے مگر اس طرح معنی کیلئے بھی آتا ہے میں یہاں پر اس عام "ہوں" کے متعلق کچھ لکھنا نہیں چاہتی جو صبح سے شام تک سینکڑوں مرتبہ گھر میں سنتا پڑتا ہے۔ بلکہ میں اس خاص "ہوں" کے متعلق چند دلچسپ سطور لکھنا چاہتی ہوں جس پر لڑکی کی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ یعنی ایجاب و قبول چونکہ اس وقت یہی ایک لفظ ہوتا ہے جو سہ بار مکرر دہرانے سے لڑکی کو ہمیشہ کیلئے ایک دوسری ہستی سے بستہ کر دیتا ہے اس لفظ "ہوں" کو ادا کرنے کے بعد لڑکی والدین کے گھر چند گھنٹے کی مہمان رہ جاتی ہے کچھ ہی دن کا عرصہ ہوا میری عزیز ترین سہیلی اپنی "ہوں" کے متعلق ایک واقعہ سنا رہی تھیں کہ موسم خاصا گرم تھا۔ [illegible] شادی کا ہنگامہ سونے پر سہاگہ کا کام [illegible] میں دو تین روز کی جاگی ہوئی تھی رسم و رواج [illegible] ہوئی ایک کونے میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی کہ ایک دم شور بلند ہوا بارات آگئی کچھ ہی عرصہ [illegible] دلہن بنا کر بیٹھا دیا گیا۔ پھر یکایک [illegible] معتبر آواز جو نہایت ہی قریبی رشتہ دار کی تھی کرے میں بھی معلوم ہوا لوگ [illegible] نکاح کیلئے آ رہے ہیں میرا دل [illegible] ڈوبا جا رہا تھا اب دل کی دھڑکنوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ تمام [illegible] کھڑے ہو گئے [illegible] آنکھیں جو کئی روز سے سادن بھادوں [illegible]

[illegible]

کہا بیوا بی بی تمہارا نکاح ...... ابن ...... سے ہو رہا ہے کیا تمہیں منظور ہے میں
خاموش تھی۔ میری زبان گویا گنگ ہو چکی تھی پہلے دستور تھا کہ بڑی بوڑھیاں سر ہلا دیا کرتی تھیں کہ جاؤ
یعنی منظور ہے۔ لیکن اب یہ انتہائی بے قاعدگی ہوتی ہے۔ چونکہ اکثر لڑکیاں شادی کے بعد کہہ دیتی ہیں
کہ ہم نے کب اظہار رضامندی کیا تھا اس لئے اب لازم سمجھا گیا کہ پوری طرح اصلی شرعی پابندی
کی جائے۔ میں ان کے مکرر اصرار سے کہہ دینا چاہتی تھی کہ کبھی منظور ہے لیکن کہہ نہ سکتی تھی آخر پھر
مجھ سے کہا گیا کہ لمبا چوڑا فقرہ کہنے کے بجائے صرف "ہوں" کہہ دو۔ اس وقت میرے لئے یہ مختصر لفظ
ایک فلسفہ کی کتاب سے کم نہ تھا۔ میں بزرگوں کے حکم کی تعمیل جلد از جلد کر کے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی
تھی۔ مگر آج اس "ہوں" کمبخت کو بھی ضد تھی۔ کسی صورت نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جتنی میں کوشش
کرتی اتنا ہی وہ حلق میں اٹک کر رہ جاتا۔ ایک بار پیٹ سے نکل کر آیا مگر گلے میں آ کر رک گیا۔ میں
اسکو بڑی طرح کوس رہی تھی۔ مگر وہ ہٹ دھرم بھی ٹس سے مس ہونے کا نام نہ لیا۔ بیچارے
[illegible] کھڑے کھڑے تھک گئے آخر ایک نے گھٹنے جھکا کر فرش پر آرام کی ٹھانی تو میں نے
زور لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور "ہوں" جو اس وقت ایک مرے ہوئے بلی کے بچے کی آواز سے زیادہ نہ تھا
نکال ہی دیا۔ بیچارے فرط مسرت سے اچھل پڑے۔ اور مکرر کہنے کو کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ
دو بار اور کہنا ہے۔ پس میں نے ہمت کی اور فوراً کہہ دیا ...... آج اس "ہوں" کے بدلہ
مصیبت جھانک رہی ہوں۔ گویا ایجاب و قبول یہ عام مروجہ طریقہ قریباً ہر جگہ پایا جاتا
ہے بلکہ شرعی اصول کے بجائے یہ ایک رسم ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ بوقت انتخاب تو کبھی
لڑکی سے پوچھا تک نہیں۔ خواہ وہ رضامند ہو یا نہ ہو۔ زبردستی اسے اپنی خیالات کی
قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ مگر اس وقت جب "ہوں" کا لفظ سنکر تو خدا اور اس کے
رسول سے سرخرو ہو جاتے ہیں۔ معصوم بیچاری لڑکیاں محض بزرگوں کی خوشنودی کے لئے
عمر بھر یاد کر دینے کا بیڑا اٹھا لیتی ہیں۔ چونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہندوستان میں لڑکیوں کو دبا کر
رکھنا باعث فخر خیال کیا جاتا ہے اس لئے انہیں امید ہوتی ہے کہ ہم جو کچھ کہیں گے وہ کر دے گی۔
دراصل یہ ایجاب و قبول نہیں ہوتا بلکہ بزرگوں کی تعمیل ارشاد ہوتی ہے اس سلسلہ میں جس قوم
کی طرف نگاہ کرو سب کا حال یکساں ہے "ہوں" کا مسئلہ تو مسلمانوں پر ختم ہوا۔ ہندوؤں میں بھی
یہی حال ہے۔ میں نے چند واقعات ایسے سنے ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انکی حالت مسلمان
[illegible]

یہاں پر ان بد نصیب خاندان کا ذکر کرتی ہوں - جو رسم و رواج میں جکڑے ہوئے ہیں - اور اپنی معصوم اولاد کو بیدردی سے تباہ و برباد کر دیتے ہیں - مگر بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب لڑکیاں خود اُن رسوم کو توڑنے کے لیے تیار ہو جائینگی -

ذرا غور کیجئے کہ یہ زندگی کا کتنا اہم مسئلہ ہے جو نہایت ہی معمولی طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے - لڑکے اور لڑکی کی دائمی زندگی کا سوال ہوتا ہے - اس ذرا سی غلطی کے بدلے ہزاروں بلکہ کروڑوں جانیں تباہ ہو رہی ہیں - والدین صرف اپنی بے دردی سے اولاد کو قربان کر دیتے ہیں - نہ معلوم کیوں بیچاری معصوم لڑکیوں کو عضو معطل خیال کیا جاتا ہے -

کاش! لڑکی کو اس قابل سمجھا جائے تو شاید موجودہ ازدواجی زندگی زیادہ اطمینان بخش ثابت ہو - مجھے اس مضمون کے لکھنے کا خیال گمان بھی نہ تھا - مگر حسن اتفاق سے ایک عزیز سہیلی کی شادی تھی - اور میرا وہاں شریک ہونا ضروری تھا - اس محفل میں جب ایجاب و قبول ہوا تو ایک بہن نے نہایت پُر معنی تقریر کی - جس میں انھوں نے یہ ثابت کیا کہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے - اور یہی وجہ ہے کہ آجکل اکثر شادیاں ناکام اور تلخ ترین ثابت ہو رہی ہیں - کئی دن سے کچھ لکھنے کے متعلق سوچ رہی تھی - آج اتفاق سے دماغ میں اُس دن کا خیال آیا جب کہ پیاری بہن اپنی دلچسپ "ہوں" کے متعلق قصہ سنا رہی تھیں خدا کرے! کہ اس "ہوں" سے بہنیں درس عبرت حاصل کریں - اور اس رسم کے انسداد کے لئے کوئی موثر قدم اُٹھائیں -

---

حقوق :- ساری دنیا کو اپنا جاننا ایک شکل تصوری دوسروں کو ڈرانے کیلئے قائم کرنا ایک نازک پڈی جیسیرا ایک ہی رنگ اور نسل کے کتے اس ہیبت ناک طریقہ سے لڑیں کہ اُن کی آواز سے دوسرونکے ڈرنے کا احتمال ہو - ایک قسم کے تمدن کی مچھلی جو کسی جال میں پھنستی نہیں - حبش کے جنگل کا لاغر گوش جسکی تلاش میں بہت سے امریکن ڈاکٹر حیران رہے -

میرا محلہ

شریف النساء معین الدین

کہتے ہیں قیدی کو اپنے کمرے سے انس ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مجھے بھی میرے محلہ سے انس ضرور ہے۔ انس کیسے نہ ہو مولد جو ٹھیرا۔ لیکن آج اقتضائے وقت یہی ہے۔ بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ اس کے ناقابل اخفا عیوب کو منظر عام پر لایا جائے۔ گردوں گرد دیدہ نے کروٹ کی۔ خورشید نے نقاب الٹ دی تمام عالم جگمگا اٹھا۔

موذن نے فضا میں تقدیس و تمجید کا رنگ بھر دیا۔ اور سامنے سے مندر سے ناقوس بج اٹھا۔ میرا محلہ بھی بیدار ہو گیا۔ نل پر پنگھٹ کا سماں بندھ گیا۔ تمام اہل محلہ کا اجتماع ہوا۔ اب کیا تھا سیاسی، مجلسی۔ معاشرتی، اقتصادی ہر قسم کے مسائل زیر بحث ہیں اور ہر ایک سرگرم بحث اس گرما گرمی میں جو موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا اس نے اپنا گھڑا رکھ دیا اور دوسرے صاحب منہ تکتے رہ گئے۔

امور خانہ داری انصرام پذیر ہو گئے۔ تمام لوگ دفتر روانہ ہوئے اور نکمے انسان غنڈہ گردی کرنے بیٹھ رہے۔

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
بلا کشان محبت بکوئے یار روند

۱۰ بجے سے قبل بس آئی۔ اب آواز سے کسنے شروع ہو گئے۔ ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ ؎ .... بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تو دوسرے صاحب نطق آمیز ہیں ؎ تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں
اور اسی طرح کے مختلف اشعار ورد زبان ہیں۔ یہ تو شریف راہی تھے اب جو

شریف بدمعاش حضرات کی نگاہ ورنہ میں پڑتا تو ایک کہنے لگے ۔ ارے یار آج ایک نئی جوانی جھلک رہی ہے تو دوسرے "متحرک سینری ہے یہ تو" ۔ بہت سے فقرے چست کیئے جا رہے ہیں ۔

اب اگر تعطیل آگئی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہنگامہ محشر کا ڈی ہرسل ہو رہا ہے ۔ محلہ کے میدان میں تمام نوعمر بچوں کا ایک جم غفیر ہے کوئی کبڈی کھیل رہا ہے ۔ کوئی لون پاٹ کوئی چرکی بلاّ ۔ اس بازیچۂ اطفال ہیں وہ ہنگامۂ دار وگیر مچا ہوا ہے کہ بس الامان الحفیظ ۔ کانوں کے پردے پھٹے جاتے ہیں ۔ جو لا نگاہِ دماغ میں مختلف خیالات آتے ہیں کہ خدا جانے کیسے یہ قوم سدھرے گی ۔ کیسے یہ نونہال قوم کی عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے اپنی جان کی بازی لگائیں گے ۔ جو صرف بیجا زدوکوب و مغلظ گالیاں بکنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے اگر کبھی ایا نے شمشیر کو بلند کیا سہم کر رہ جاتے ہیں ۔ ان میں تو ہمت کا فقدان ہے پھر کیسے یہ یکہ تاز عرصۂ جنگ بنیں گے ۔ جو کاغذ کی ناؤ نشیب میں جمع شدہ پانی میں بہا کر ہی خوش ہو جاتے ہیں کیسے قوم کی گرداب میں پھنسی ہوئی کشتی کو سلامتی کے ساتھ کنارے پر لائیں گے ۔ خود اُنکے اخلاق ا بنیادیں مستحکم نہیں پھر کیسے یہ نئے حیدرآباد کی اساس کو آہنی و مضبوط بنا سکیں گے ۔

ابھی دماغ ان ہی خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ ظلمت شب نے آہستہ آہستہ تسلط جمانا شروع کیا موذن نے آذان کہی اور عبد جذبہ عبدیت سے معمور قلب کے ساتھ اپنے معبود کے حضور میں سجدہ ریز ہو گیا شب کے ہنگامے ارتقا پذیر ہونے لگے ۔

جب محرم کا حرمت مآب مہینہ آتا ہے تو ادھر اذان ہوئی اُدھر مجلس عزا برپا ۔ قربت مسجد غضب ڈھاتی ہے ۔ پیش امام کیا پڑھتا ہے اور مقتدی کیا اقتدا کرتے ہیں سب لاینحل مسئلہ ہو کر رہ جاتے ہیں ماتمی دن ختم ہوے تو خوشی و انبساط کا دور آیا ۔ اب کیا ہے بیھولارے کا بھول گونڈ چوک جائے تو جائے مگر محترم خواتین کا ڈھول بجانا کبھی نہ چوکے گا ۔ ایک طرف سے ڈھول پر تھاپ پڑی ہی نہ تھی کہ دوسری طرف سے دوسرے موسیقار نے ڈھول سنبھالا ۔ اور محلہ کا محلہ محشر بداماں موسیقی کے زیر و بم سے ساری فضا معمور ہو گئی ۔ ایک طرف سے قیامت خیزی کی تیاری ہو رہی ہے کہ ؎

بہت دن سے خاموش ہے جذبۂ دل ہے قیامت اٹھانے کو جی چاہتا ہے

تو دوسری طرف سے قلب مضطر کی تڑپ کا انکشاف ہو رہا ہے کہ ؎

ذرا ذرا او دل کے تڑپانے والے
ادھر دیکھ لینا اُدھر جانے والے

یہی فتنہ جگانے والا اور سیماب سا نغمہ کیا کم تھا کہ تیسرے گھر سے زمزمہ بلند ہوا کہ ؎

جانے نہ دونگی سیاں ۔ رستہ روک لونگی

مگر چوتھی طرف کچھ تصوف کا رنگ چھلکنے لگا ؎

خواجہ مانے نہ مانے منانے جاؤنگی

ابھی ان ہی ہنگامہ زا و مسحور کن نغموں سے اہل محلہ پوری طرح محظوظ ہونے نہ پائے تھے کہ ہمسایہ میں صاحب خانہ مجازی خدا کے روپ میں جلوہ گر ہوئے ان کا ورود عمل میں آیا ہی تھا کہ بیچاری دیو داسی کے تمام خوشی آنند خواب اور انگڑائیاں لیتے ہوئے جذبات سب کافور ہو کر رہ گئے اور باورچی خانہ میں کفگیر چمچ کی گھڑ گھڑاہٹ سنائی دینے لگی ۔ ابھی سرتاج نے چند لقمے زہر مار کیئے تھے کہ کنکر نے آکر سارا مزہ کرکرا کر دیا ۔ پھر کیا تھا جو غیظ و غضب کا دورہ پڑا تو رکابی قلابازیاں کھاتی ہوئی صحن میں جا پہنچی ۔ اور نوبت بہ این جا رسید کہ سرکار کسی چیز کی تلاش میں مصروف ہو گئے ۔ لٹ مل جائے یا ہیزم سوختنی اگر کچھ نہ ملے تو پھر سرکار کے نعلین مبارک تو کہیں نہیں گئے سامنے ہی پڑے مل جائیں گے ۔ اور بیچاری ایک کنکر تھوڑے سے نمک کے لئے اتنا پٹی کہ زخموں پر ہلدی چونا لگانا ہی پڑا ۔ جب خوب بھجوڑ ڈالا جب کہیں آہنی گرفت میں اضمحلال پیدا ہوا ۔ پھر انسانیت کے جامے میں جو آئے قوم کے سپوت سماج کے مایہ ناز فرزند ۔ خاندان کے درخشندہ ستارے اہل محلہ کے فرض شناس نمائندے تو احساس ہوا کہ زینت شبستاں خون میں نہائی پڑی ہے ۔

اس غلغلۂ جان سوز سے فرار کے لئے مکان کے دوسرے حصے میں عزلت نشین ہونے کا جو عزم کیا تو کیا ہے وہاں بھی وہی ہنگامہ ہے "رعد" و برق کا منظر نظر آرہا ہے ۔ ماں کا سعادت مند فرزند کھڑا پھولوں کی بارش کر رہا ہے مغلظ سوقیانہ دشنام پوری روانی سے نکل رہے ہیں اُس ماں کی شان میں جسکے قدموں کے نیچے جنت ہے" بقول شخصے اس ماں کو جسکے سینہ میں دل کی بجائے محبت و مہر کا کرتی ہے ۔ اس ماں کو جو قوم کی معمار ہے جسکے آغوش میں افلاطون و ارسطو جیسے قابل فلسفی نے جنم لیا تھا ۔ سکندر و نپولین جیسے فاتح پیدا ہوئے تھے ۔ رستم و ارجن جیسے یگانہ ناموروں نے خطہ ارض پیدا سا لش لیا تھا ۔ ہلاکو جیسے قاہر اور فاروق اعظم جیسے جامع الصفات ہستی اسکی تربیت گاہ سے نکلے جو کیم نور جہاں اور رضیہ سلطانہ کے ۔

روپ میں فلک حکمرانی کا ماہ خورشید جمال بن کر طلوع ہوئی تھی تو کبھی چاند سلطانہ و رانی
لزنا وتی جیسی مدبر جرنیل بن کر فتح و کامرانی کے پرچم لہرایا کرتی تھی ۔

شب اپنے بہار پر ہے ۔ چند افراد خمار خانہ سے گھر جا رہے ہیں تمام فضا نغشی و مخمور
معلوم ہو رہی ہے ۔ مجادلہ و مباحثہ کا بازار گرم ہے ۔ کوئی نیت عنب کی مدح میں قصیدہ گوئی
میں مصروف ہے تو کوئی سندہی کی تعریف ؎

شراب اندرونِ میں سندہی بر سر افلاک ۔۔۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ایک فاضل موسیقار گنگنا رہے ہیں ؎

بہکتے نہ تھے داغ گفتگو میں ۔۔۔ مگر آج پی لی ہے حضرت زیادہ

تو کوئی مکیش کے شعر کے مطابق طبیعت کے مچلنے کا عذر کر رہا ہے ۔

پینے سے کر چکے تھے توبہ مگر جلیس ۔۔۔ بادل کا رنگ دیکھ طبیعت مچل گئی

یہ تو مہذب حضرات کا گروہ تھا ۔ اب جو علی غول کے گنڈے سے گزر رہے ہیں بالکل بازاری
مذاق ہو رہا ہے ۔ جنگ و جدل ہو رہا ہے ۔ سارے محلے کی نیند اچاٹ ہو گئی ہے ۔ شور وغل
کی آواز پر چند لوگ دھڑکتے ہوئے دل سے باہر نکل پڑے ۔ بیچ بچاؤ ہوا اور فریقین رواں
ہو گئے ۔

اب سینما سے مراجعت فرمانے والے باذوق حضرات کا نزول ہو رہا ہے ہنسی کی تان
اڑاتے سینما پر تنقید و تبصرہ کرتے گزر رہے ہیں کہ فلاں کی اداکاری بہت غضب ڈھا رہی
تھی تو فلاں کی آواز قیامت کی تھی ۔ اور ثریا کی چال تو بس فتنہ جگاتی ہے کم بخت نصف
شب گزر گئی اور سارے ہنگامے نیند کی آغوش میں محو خواب ہو گئے اب جو کتاب لے کر
پڑھنا چاہا تو نیند کی یہاں بھی یورش شروع ہو گئی ایک گھنٹے کی کاوش مسلسل کے بعد
دیکھا تو کیا ہے ایک سطر بھی حافظہ پر مرتسم نہیں ۔ کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی صفحہ پر گھوم
پھر رہی ہوں ۔ امی نے جو یہ حالت دیکھی تو ڈانٹ بتائی کہ "سو بھی جاؤ اپنے نیند کے وقت
کیا خاک پڑھا جائے گا" اور موقع غنیمت جان میں بستر پر دراز ہو گئی ۔ اب جو تمام
حالات کا تجزیہ کیا تو حالت قابل تاسف نظر آئی کہ اگر امتحانات میں یہی حالت رہی تو پھر
کامیابی کا اللہ ہی حافظ ہے اور یہ کہتے ہوئے نیند آ جاتی ہے کہ ؎

"سرہانے میر کے آہستہ بولو ۔۔۔ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے"

ماضی کی یاد

فردوسی

میں کچھ تھکی تھکی سی تھی — کتابیں رکھ کر میرا جی چاہا کہ ذرا دیر کو سستا لوں مگر
چائے کی طلب نے مجھے لیٹنے ہی نہ دیا — علیہ کے کمرے سے گزرتے ہوئے میں نے ہچکیوں
کی آواز سنی — کبھی نہ رونے والی علیہ — رو رہی تھی — کیوں —؟ میں بے ساختہ
اسکے کمرہ کی طرف بڑھی — علیہ —!! علیہ !! کیا ہوا —؟ کیوں رو رہی ہو —
ارے کچھ تو بولو علیہ — میری آواز بھر آگئی — علیہ نے تار کی طرف اشارہ کر دیا —
تار — اف میرا دل دھک سے ہوگیا — کیا ہوگا — اس تار میں —؟ کس کی موت
—!! آہ موت —!! ظالم موت —!! تیری چیرہ دستیاں حد سے تجاوز کر چکی ہیں
تجھے اب ہاتھ روکنا ہوگا —!! میرا ہاتھ کانپ رہا تھا — میں نے تار دیکھا معصومہ
باجی کی موت — میرے منہ سے چیخ نکل گئی — اب کیا ہوگا — آہ معصومہ باجی
تم تو اپنے ساتھ روبی کو بھی لے گئیں — روبی —!! مجھے اس پر رحم آرہا تھا —
روبی کی زندگی کا صرف ایک سال بہاریں — اور پھر خزاں ہی خزاں — لامتناہی
خزاں —!!

ہم سب اس اجڑے ہوئے گھر میں جانے کی تیاری کر رہے تھے — اجڑا ہوا گھر —!!
اب سے کچھ عرصہ قبل مسرتوں اور شادمانیوں کا ہجوم —!! ہم جب بھی تو جاتے تھے
باجی کی شادی میں باجی کی شادی —!! خوشیوں کا پیغام — گھر مسرت کی ایک لہر تھی
کتنے خوش تھے ہم —!! جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی ہو کتنی شرارت کرتے
تھے ہم —! نہ جانے وہ زمانہ کہاں چلا گیا ہے شاید اب وہ زمانہ کبھی نہ آئے —
زمانہ اور وقت کتنے بے وفا ہیں یہ ساتھی —!!

اب سے ۴ سال قبل ہم اسی طرح معصومہ باجی کی شادی میں جارہے تھے مجھے سب سے زیادہ خوشی شاہینہ سے ملنے کی ہو رہی تھی — شاہینہ میری بچپن کی دوست شاہینہ — اسٹیشن پر ہی اُس سے ملاقات ہو گئی — شاہینہ نے ایک منہ میں سو باتیں کہہ ڈالیں — نہ جانے کہاں کی بکواس تھی — بہر حال اپنی عجیب شرارتیں سنائی جارہی تھیں —

گھر میں شادی کا ہنگامہ تھا — بہت سے عزیز جمع تھے ہر طرف چہل پہل تھی — سب لوگ خوش تھے — مگر ایک معصومہ باجی تھیں کہ روئے چلی جارہی تھیں — میں اور شاہینہ بھی انہیں روتا دیکھ کر رو لیا کرے — مگر رونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی — اف کتنی شرارت کرتے تھے ہم بس جب ہم لوگ آپس میں مل بیٹھتے تو ہنگامہ کر دیتے — وہ زمانہ بھی عجیب زمانہ تھا — بس جیسے ہماری زندگی کا مقصد خوش رہنا شرارت اور چھیڑ چھاڑ ہی رہ گیا تھا —

روز ایک نئی شرارت — بس دوپہر ہوئی اور ہم باغ میں پہنچے — اور اُسے اجاڑ کر ہی دم لیتے گو کہ ہماری نگرانی کے لئے ایک ونیلاٹ خاتون مقرر تھیں — مگر خدا انکے موٹاپے کو سلامت رکھے — ہم نے اُس موٹاپے سے خوب فایدہ اٹھایا — ہمیشہ انکے سامنے سے بھاگ جاتے اور پھر انکے ہاتھ نہ آتے — ہم پریشان تھے تو بس انکی شکایات سے —

یوں تو روز ہی ہم مفت نئی شرارت کرتے اور کامیاب رہتے مگر ایک دفعہ اتفاق سے بڑے گھاٹے میں پڑ گئے تھے — جسکے بعد شاید سنگین شرارت کی نوبت نہیں آئی —

مئی کا مہینہ ختم تھا — شدت کی گرمی پڑ رہی تھی — خصوصاً دوپہر کے وقت تو یہ ایشیا کا چمکیلا سورج آگ برسانے لگتا — مگر واہ ری ہماری عجیب طبیعت اس وقت اور شرارت پر آمادہ رہتی — سارا گھر خس کی چلمنوں سے آراستہ کمروں میں پنکھوں کے نیچے سونا — ہمیں بھی سب لوگ سونے کی ہدایت کرتے — مگر ہم ایسی ہدایتوں کو ایک کان سے سنتے دوسرے سے اڑا دیتے — مگر افسوس کہ یہ بی ونیلاٹ کسی طرح اڑائے نہ اڑتیں — بس ان سونا ہی — زرین موقعہ ہو جاتا —

کئی دنوں سے ڈنیلاٹ ہماری سخت نگرانی کر رہی تھیں — کیونکہ ہم لُک جانے کی وجہ سے بیمار ہو گئے تھے — مگر جب اچھے ہو گئے تو انکی یہ نگرانی انتہائی بری معلوم ہوئی — کئی دنوں سے اس طرح سکون سے رہتے ہوئے ہم بیزار ہو گئے تھے — اور سوچ رہے تھے کہ ایک دن ڈنیلاٹ کی شامت بلائی جائے ہم دونوں ان سے اس وجہ سے چڑے ہوئے تھے کہ انھوں نے بڑی ماں سے شکایت کر دی تھی —

ایک روز جب کہ بی ڈنیلاٹ ہمیں سوتا سمجھ کر اپنے کمرے جاکر اطمینان سے سوگئیں ۔ ہم نے سوچا کہ اچھا موقعہ ہے ان کی مرمت کی جائے ۔ یہہ سوچ کر دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکلے اور باغ کے زینہ سے اتر کر انکے کمرے کی طرف پہنچ گئے ۔ ہماری اسکیم یہہ تھی کہ انھیں باندھ کر انھیں کے ہاتھوں پٹوایا جائے ہم دبے پاؤں انکے کمرے میں داخل ہوئے ۔ اور دروازے بند کرلئے ہم نے ان کو رسی سے خوب جکڑ دیا لیکن ہاتھوں کو آزاد رکھا ۔ اور ان میں آپا جان کے سفری جوتے باندھ دئے ۔ اب تیاری تو ہو چکی تھی مگر سوچ رہے تھے کہ انکی ناک میں بتی کر کے جلدی کیسے آسکتے ہیں ۔ کیونکہ جوتوں کے پڑتے ہی وہ فوراً آنکھیں کھولینگی ۔ اور ہمیں دیکھ لینگی اور شامت ہی آجائے گی ۔ شاہینہ کی رائے تھی کہ انکے پلنگ کا رخ بدل دیا جائے ۔ مگر وہ تو ڈنیلاٹ تھیں ہم سے یہہ ہوا ہی نہیں ۔ آخر میں نے رائے دی کہ میں دروازے پر رہتی ہوں تم ناک میں بتی کر کے بھاگ آؤ میں دروازے پر کھڑی ہوگئی ۔ شاہینہ نے بی ڈنیلاٹ کی ناک میں بڑی زور سے بتی لگائی جس طرح قفل کھولا جاتا ہے انکے ہاتھ ایک لخت اُٹھے اور انکے منہ پر جا پڑے میرا ہنسی کے مارے برا حال تھا ۔ اور میں اس گڑبڑ میں بھاگنا ہی بھول گئی اتنے میں شاہینہ آکر مجھ سے ٹکرائی اور کہنے لگی بدبخت ۔ اس بڑھیا نے تو ہمیں اچھی طرح دیکھ لیا ہے ۔ اب کیا ہوگا ۔ !ہم دونوں بھاگے جارہے تھے ۔ باغ کی طرف باغ جاکر سوچنے لگے کہ اب کیا کریں ۔ میں نے کہا اب تو شامت آئی ہے ۔ شکایت بڑی اماں کے پاس جائے گی ۔ ہم اپنی بڑی اماں سے بہت ڈرتے تھے ان کی ناک پر رکھی ہوئی عینک اور اس میں سے ان کی بڑی بڑی لال آنکھیں جھانکتی ہوئی ہمارا دم نکالنے کے لئے کافی تھیں ۔ پھر ان کی وہ ڈانٹ ۔ !! مجھے اب بھی جب اپنی فق صورتیں یاد آتی ہیں تو ہنسی آجاتی ہے اتنے میں بی ڈنیلاٹ کی چیخوں کے ساتھ اور بھی کئی آوازیں سنائی دیں ۔ شاید بی ڈنیلاٹ ہماری شکایت لیکر جارہی تھیں ۔ ہم بڑے پریشان ہوئے اس پریشانی میں ہم جلدی سے بھائی جان کے کمرے کے اندر گھس گئے ۔ بھائی جان ہماری اس غیر متوقع آمد پر بڑے حیران ہوئے ۔ اور ہماری فق صورتوں کو دیکھ مسکرا کر کہنے لگے ۔ اوہو شیطانو ! کی ہے کچھ شرارت ۔ ہم نے ذرا معصوم بنتے ہوئے کہا کہ ہم تو یونہیں آگئے ہیں بھائی جان بولے جھوٹ ۔ !! ہم دونوں نے پریشان ہوکر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا نہیں بھائی جان ہم کچھ شرارت کرتے نہیں آئے ۔ مگر ذرا آپ آہستہ بولیئے ۔ بھائی جان بولے اوہو خالہ سے چھپا جارہا ہے ۔ میں ابھی بلاتا ہوں انھیں ۔ یہہ کہکر جھٹ سے جانے کے لئے تیار ہوگئے

ہم نے جلدی سے کہا نہیں نہیں بھائی جان — ایسا نہ کیجئے — بھائی جان رک کر بولے — بھئی ایک شرط پر وہ یہہ کہ بھئی ناز و تم اپنی وہ انگوٹھیاں دے دو جو بڑی اماں نے دی تھی — اور شاہینہ اپنے وہ ٹوپس دے دو جو تو چندی سے خرید ے تھے — ہم دونوں نے چڑکر کہا بس معلوم ہے آپ یہہ چیزیں نگہت باجی کو دینگے — انھوں نے کہا نہ دو — میں چلا اب اور بڑی اماں کو خبر کرتا ہوں ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے — ہماری پسندیدہ چیزیں چھینی جا رہی تھیں — مگر مجبوری تھی پھر درویش بر جان درویش جبراً قہراً وعدہ کرلیا اپنے کمرے میں جاتے ہی یہہ چیزیں دے دینگے بھائی جان بھی ہمارے پیچھے کمرے میں آئے اور وہ چیزیں لیکر چلتے بنے بھائی جان چلے گئے — مگر ہماری شرارت کی خبر بڑی اماں تک پہنچ گئی تھی بڑی اماں نے بلاکر ہمیں خوب ڈانٹ پلائی اور اعلان کردیا کہ آئندہ کے سب تحفہ ضبط — ! اور تو اور ہماری خوب کان کھینچائی کی — اور کہا کہ شرم نہیں آتی بڑوں کے ساتھ شرارت چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے — ہم نے یہہ سوچا ہی نہ تھا کہ وہ ہم سے بڑی تھیں ہمیں خیال تھا تو یہہ کہ وہ کھڑی نگرانی کرتی ہیں — خیر ہم نے روتے ہوے کمرے سے نکلے دیکھا کہ نگہت باجی وہی ٹوپس اور انگوٹھی پہنے ہوے مسکرا رہی ہیں — ہم دونوں انہیں دیکھکر جل ہی تو گئے اور اپنے کمرے میں آکر ہنسی اور آنسوؤں کے درمیان توبہ کی کہ پھر کبھی شرارت نہیں کرینگے اور واقعی کچھ دن تک امن رہا مگر پھر — !!

بچپن گزر چکا ہے مگر اس کی یاد اب بھی دل کو گرماتی ہے — کتنا حسین تھا وہ زمانہ ہماری وہ دلچسپ شرارتیں وہ معصوم مسکراہٹیں کتنی دلکش ہوتی تھیں — اے کاش وہ زمانہ پھر آجائے — مگر ایسا کہاں ہوا ہے — !! —

خواتین کے اصرار پر آئندہ مہینہ سے دو صفحہ بجٹ ڈینر کیلئے وقف کئے جائینگے نسخے ایسے بھجوایئے جائیں جو واضح اور آزمودہ ہوں دوسرے اسی فایدہ اوٹھانے کیلئے سستی سنائی ترکیب سود مند نہ ہوگی کیونکہ اوقات کے ضائع جانے کے سوا مالی نقصان کا اندیشہ ہے کوشش کیجئے کم خرچ میں اعلیٰ پکوان کیونکر ہوسکیگا کیونکہ معاشی بحران میں آجکل اسکی شدید ضرورت ہے —

ممتاز مشین پریس حویلی قدیم میں چھپ کر دفتر شہاب دبیر پورہ سے شائع ہوا

RED-M-N-D

ہمارا نشان امتیاز
مرغوب ترین غذاؤں کا اعلیٰ ترین مرکز
مسرت گاہ
اہل ذوق حضرات کیلئے ہر وقت نفیس ترین غذائیں پیش کرتا ہے
جہاں
ہمہ اقسام کی غذائیں
از قسم
مرغ، تیتر، بیٹر، بریانی اور دیگر لوازمات کے علاوہ عمدہ سے عمدہ
میٹھے مہیا کئے جاتے ہیں۔
(آپ کی پر سکون تفریح گاہ)
مسرت گاہ (افضل گنج) حیدرآباد دکن
مالک مسرت گاہ - محمد ضیاء الدین خاں بوزی

انجمن آرٹ پرنٹنگ پریس
چھتہ بازار حیدرآباد دکن

شہاب

جلد ۱۶ ۱۰ مہر ش ۱۳۵۷ ف مطابق اگست ۱۹۴۸ء نمبر ۱۱

مرتبہ
محمد عبد الرزاق بسمل

چندہ سالانہ (سے)

کاغذی کوٹہ

حیدرآباد سے تقریباً اخبارات اور رسائل ماہانہ ہفتہ وار (۱۱۵) شائع ہوتے ہیں۔ جن میں انگریزی تلنگی مرہٹی شامل ہیں جس سے ملک کے مذاق کا پتہ چل سکتا ہے۔

انمیں بیشتر ایسے بھی ہیں جو جنگ کے درمیان بھی نہایت پابندی سے نکلتے رہے ہیں۔ اور ۱۳۵۲ف میں جدید رسائل و اخبارات میں مزید اضافہ ہوا اور ابھی تک ہو رہا ہے لیکن پر لطف بات یہ ہے کہ محکمۂ اطلاعات عامہ نے دوران جنگ میں اخبارات کی حد تک کاغذ کا کوٹہ مقرر کیا تھا اور رسائل کو کوٹہ سے محروم رکھا گویا رسائل صحائف کے شمار میں نہیں آسکتے۔ اور انکا نکلنا نہ نکلنا دونوں مساوی ہیں حالانکہ رسائل ہی کے وجود سے ملک کے ادبی ذوق میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اخبارات خبروں کی حد تک محدود ہوتے ہیں۔ ایک گروہ کیلئے کوٹہ مقرر کرنا اور دوسروں کو محروم رکھنا صریح ناانصافی ہے۔ یہ ایک قسم کی ترغیب ہے اگر ماہوار پرچہ نکالنا مقصود ہے تو ہفتہ وار کٹ کیا جائے۔ جن اخبارات کو اطلاعات عامہ نے کوٹہ کی فہرست میں شریک کیا ہے ان میں بعض اخبارات ایسے ہیں جنکی زندگی صرف چند دن ہے لیکن بعض ایسے رسائل جو آج ۱۲ سال سے نہایت پابندی سے جاری ہیں انکے نام کاغذ کے کوٹہ کی فہرست میں شریک نہ کرنا قابل غور ہے۔ جب ہم کاغذ کیلئے درخواست کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ رسائل کیلئے کوٹہ نہیں دیا جاسکتا تو ایسی صورت میں رسائل سے بھی ہر طرح کی پابندی اوٹھالی جائے جبکہ انکا شمار صحائف میں نہیں ہے۔ پھر کیوں انہیں قانون مطابع کا پابند کیا جاسکتا ہے۔

اخبارات کو اشتہاروں اور روزانہ فروخت سے کافی آمدنی ہوتی ہے اگر وہ زیادہ قیمت پر بھی کاغذ خریدیں تو انہیں کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔ برخلاف اس کے رسائل کی محدود اشاعت ہوتی ہے جنہیں اپنے مقررہ چندہ پر اکتفا کرنا ناگزیر ہے ایسے حالات میں رسائل کے لئے کوٹہ کا مقرر نہ کرنا گویا انہیں جیتے جی موت کی جانب راہنمائی کی دعوت ہے۔

امید کہ ہمارے ہزاکسلنسی صدر اعظم بہادر جنہیں رسائل کی مشکلات کا کافی علم ہے اسکی کمی کے ختم کرنے کے متعلق کوئی موثر حکم صادر فرمائینگے۔

چہ جوید در غبارِ راہِ وحشت قیس محمل را
چرا با عزمِ راسخ بر ندارد پردۂ دل را

دلِ آزادگاں موجِ بلا را مرحبا گوید
بلے از شورشِ سیلاب ہیچے نیست ساحل را

چہ سود از تمکنت ایدل چہ سود از خود آرائی
بدونِ جلوۂ او رنگ و رونق نیست محفل را

بعزمِ عشق صادق قطعِ منزل می تواں کردن
ز آہ نارسا آساں نباید کرد مشکل را

خوشا آئینِ ضبطِ قتل گاہِ عاشقاں کانجا
نباشد اذنِ غلطیدن بخونِ خویش بسمل را

تو در آغازِ راہِ عشق از پا آمدی مسلم
ندانستی براہِ دوست پایاں نیست منزل را

نصف صدی پہلے کے علمی ماحول پر ایک نظر اور میری تعلیم

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

حیدرآباد میں موجودہ زمانہ میں جو علمی ماحول اور علمی فضا ہے وہ آج سے چالیس پچاس سال پہلے یعنی میرے بچپن میں نہیں تھی آج جو علمی ہل چل تعلیمی سہولتیں میسر ہیں وہ پہلے نایاب نہیں علم کی جو گرم بازاری اور خاص عام میں علمی دلچسپی پائی جا رہی ہے وہ مفقود تھی۔ نہ تو اتنی قدر مدرسے تھے اور نہ اس قدر طلباء تعلیم پاتے تھے نہ تو اتنے اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے نہ علمی انجمنیں تھیں ایک جمود تھا جہالت کی ایک تاریکی تھی جو حیدرآباد پر چھائی ہوئی تھی اس کی کسی قدر صراحت حسب ذیل ہے۔

> عورت۔ نیچر کی رنگینیوں کا مجموعہ۔ باغ آفرینش کا سب سے زیادہ خوش رنگ۔ خوشنما پھول ہے موجودات ہستی میں خالق کی صنف نازک کا بہترین اظہار

مدرسے: حیدرآباد میں ایک کالج (نظام کالج) انگریزی تعلیم کے لئے اور ایک (دار العلوم) عربی و فارسی تعلیم کے لئے موجود تھا اس کے علاوہ مدرسہ نظامیہ میں بھی قدیم نہج کی تعلیم ہوتی تھی بقیہ سرکاری ہائی اسکول۔ مدرسہ عالیہ۔ سٹی ہائی اسکول اور چند مڈل اسکول سرکاری دو چار امدادی مدرسے تھے۔ عام طور سے انگریزی تعلیم کے رجحانات نہیں تھے۔ اسی وجہ سے نظام کالج پر ہزاروں روپیہ خرچ ہونے پر بھی سالانہ ایک دو سے زیادہ بی۔ اے (طلباسے) برآمد نہیں ہوتے تھے۔ مڈل کا امتحان سرکاری طور پر ہوتا تھا اور اس میں دو ایک سو طلبہ شریک ہوتے تھے مڈل کے امتحان کی اس قدر وقعت تھی کہ جب ۱۳۰۵ف میں

سید جمال الدین (صادق جنگ سوم) جو طبقہ امرا میں شامل تھے امتحان مڈل میں بدرجہ اعلیٰ کامیاب ہوئے تو دوسرے امرا کے لڑکوں کو ترغیب کے لئے سرکاری طور پر جریدہ میں ان کی کامیابی پر اظہار خوشنودی کیا گیا تھا۔

مدرسہ دار العلوم پنجاب یونیورسٹی سے ملحق تھا اور یہاں منشی۔ منشی عالم اور فاضل مولوی مولوی عالم اور مولوی فاضل کی تعلیم ہوتی تھی۔ دار العلوم کے صدر مہتمم کی تین سو روپیہ ماہوار تھی اور دوسرے مدرسین کو سوا سو روپیہ سے لیکر بیس روپیہ تک ملتے تھے۔ چند مدرسین کے سوا باقی مدرسین صبح کے دس بجے سے چار بجے تک درس دیا کرتے البتہ ایک سے دو تک ایک گھنٹہ وقفہ ہوتا تھا۔ کئی ایک مدرسین ایسے تھے چار بجے کے بعد بھی مدرسہ میں اور اپنے گھر پر طلبہ کو مفت درس دیا کرتا۔

اردو زبان کی ادبی تعلیم باقاعدہ نہیں ہوتی تھی۔ یعنی مدرسہ کے نصاب میں اردو ادب کی کتابیں شامل نہیں تھیں، اور نہ اس کا درس ہوتا تھا۔ دینیات کی تعلیم قرآن شریف کا درس خطاطی مشق لازمی تھے اور منشی کی تعلیم کے پہلے ان امور کی تعلیم ختم ہو جاتی تھی۔

اعلیٰ جماعتوں میں مولوی سید قادسالدین صاحب ابو بکر بن شہاب۔ مولوی سید تاج الدین صاحب مولوی سید محمد عباس صاحب مولوی سید شاہ مصطفےٰ صاحب قادری۔ سید اشرف صاحب شمسی وغیرہ منشی اور اس کے نیچے کی جماعتوں میں مولوی احمد مدنی صاحب مولوی خواجہ شرف الدین صاحب مولوی سید احمد حسین صاحب امجد۔ مولوی رفیع الدین صاحب مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ درس دیا کرتے مولوی احمد حسین صاحب خوشنویس تھے جو اپنے سخت گیری کی وجہ سے مشہور رہے۔

اس زمانہ کے طلبہ اور مدرسین میں جو بات عام تھی وہ یہ تھی کہ مدرسین طلبہ کو اپنے اولاد کے مساوی تصور کرتے تھے اور اسی محنت اور شفقت سے تعلیم بھی دیا کرتے جو ایک باپ اپنی اولاد کو دیا کرتا ہے۔ بغیر کسی معاوضہ کے مہینوں اور برسوں طلبہ اپنے مدرسوں کے مکان میں تعلیم حاصل کرتے تھے تاکہ امتحان میں اعلیٰ کامیابی حاصل کریں۔

اسی طرح اس زمانہ کے طلبہ بھی اپنے مدرسین کی عزت باپ سے زیادہ کرتے تھے۔

ادب سے پیش آتے اور ان کی تعلیم کو دل لگا کر حاصل کرتے ان کی اطاعت کرتے اور فرمانبردار رہا کرتے۔

دارالعلوم اور سٹی ہائی اسکول میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی اور نظام کالج اور چادرگھاٹ ہائی اسکول میں ہندو اصحاب زیادہ تھے۔ مدرسہ عالیہ میں زیادہ تر عہدہ داروں کے لڑکے تعلیم پاتے تھے کیونکہ یہاں فیس بہت زیادہ رکھی گئی تھی مدرسہ عالیہ چھوٹے بچوں کے لئے کنڈرگارڈن کی جماعتیں قائم تھیں اور یورپین اور انگلو انڈین عورتیں یہاں تعلیم دیا کرتی تھیں۔

خواتین کی تعلیم کے لئے سرکاری صرف نام پلی کا مدرسہ تھا جس میں تعلیم پانے والی لڑکیوں کی تعداد ایک سو کے اندر ہوتی تھی۔ دو ایک چرچ کے مدرسے تھے جہاں مسلم لڑکیاں تعلیم نہیں پاتی تھیں۔

یہ تو حیدرآباد کی حالت تھی اضلاع میں تعلیمی حالت اس سے بدتر تھی۔ بڑے بڑے اضلاع یعنی مستقر صوبہ داری اورنگ آباد ورنگل اور گلبرگہ میں تو ہائی اسکول تھے بعض دوسرے اضلاع میں مڈل اسکول قائم تھے۔ عورتوں کے لئے تو مدرسہ تحتانی بھی نہیں تھے غرضکہ بلدہ اور اضلاع میں تعلیم پانے والے طلبہ اور طالبات کی تعداد چند ہزار ہوتی تھی

اخبارات روزآنہ اخبارات سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی اس لئے جو اخبارات شائع ہوئے وہ جلد بند ہو جاتے تھے۔ ایک دو اخبار مثلاً مشیر دکن علم و عمل وغیرہ جو عرصہ سے شائع ہوتے تھے ان کی روزانہ اشاعت بمشکل ایک ہزار یا پندرہ سو ہوتی تھی اس میں بڑا حصہ سرکاری طور پر دفاتر کے لئے خریدا جاتا تھا۔ البتہ جب جنگ ترکی و یونان اور جنگ روس و جاپان چھڑی تو باہر کے کچھ روزانہ اخبار آنے لگے۔ ہفتہ وار اخباروں میں بھی حیدرآباد سے جو اخبار شائع ہوئے وہ جلد بند ہو گئے لیتے لاہور سے وطن۔ اور پیسہ اخبار۔ مدراس سے مخبر دکن۔ نیز ۴ صفحی جو یدہ روزگار وغیرہ آتے تھے۔ اخبالذکر تینوں اخباروں میں حیدرآباد کی سیاست اور عہدہ داروں کے متعلق مضامین آتے تھے اس لئے خرید کئے جاتے مگر اس امر کا

خیال رہے کہ اخباروں کی ایجنسیاں جو آج حیدرآباد میں بیسوں نظر آتی ہیں موجود نہیں تھیں یہ اخبارات صرف خریدار کو براست آتے تھے جنگ طرابلس کے موقع پہ البتہ ایک دو ایجنسیاں قائم ہوگئی تھیں مگر ان کے پاس بھی بہت کم تعداد آتی تھی۔

کتب فروش۔ حیدرآباد میں چار مینار کے پاس دو چار کتب فروشوں کی دوکانیں تھیں ان کے پاس یا تو قانونی کتابیں ہوتیں یا پھر درسی کتابیں اگر علمی کتابوں کی ضرورت ہو تو راست دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ سے طلب کرنا ہوتا تھا۔ ایک دو اصحاب ایسے تھے جو شمالی ہند سے کتابیں طلب کرکے لوگوں کے مکان کو لاکر فروخت کرتے تھے۔ ان میں مولانا نذیر احمد۔ شرر۔ وغیرہ کی کتابیں زیادہ ہوتی تھیں۔

لوگوں کو مطالعہ کا شوق نہیں تھا۔ کتب خانہ آصفیہ میں آنے والوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے تجاوز نہیں ہوتی۔ اس میں بھی اخبار مطالعہ کرنے والے زیادہ ہوتے تھے۔ بنا برایں انگریزی کتابوں کے مطالعہ کرنے والے ہوئے تھے اور مطالعہ کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔

انجمنیں۔ علمی انجمنیں قائم ہوتی تھیں مگر کسی جانب لوگوں کی توجہ نہیں ہوتی تھی، اگر کسی انجمن کے جلسہ میں پندرہ بیس آدمی آجائیں تو جلسہ کی کامیابی سمجھی جاتی تھی لوگوں کی توجہ نہ ہونے سے انجمنیں جلد اپنی عمر ختم کردیتیں۔

اصحاب ذوق کا اجتماع۔ عام جمود اور علمی پستی کے باوجود حیدرآباد میں اصحاب علم اور ارباب دانش کی کمی نہ تھی بلکہ ہندوستان کے بہترین دل و دماغ یہاں تھے نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک مولوی چراغ علی اعظم یار جنگ مولوی نذیر احمد پنڈت رتن ناتھ کا دور گزر چکا تھا مولوی عزیز مرزا ظفر علی خان ڈاکٹر اگھور ناتھ۔ چٹوپادھیا۔ مولوی شبلی وغیرہ اصحاب موجود تھے۔

داغ کی محفلیں۔ میکش اور فیض کے مشاعرے ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا مگر اس کے باوجود عوام میں تعلیمی ذوق اور علمی مذاق نہیں تھا اسلئے ایسے ایسے ارباب قلم اور اصحاب ذوق کے اجتماع کے باوجود اہل حیدرآباد ان سے متمتع نہیں ہوتے تھے اس کے قطع نظر بہ سبب ارباب علم سیاسی کشمکش اور سیاسی الجھنوں اور پارٹی فیلنگ میں گرفتار تھے ایک گروہ اپنے مخالف گروہ کو نیچا دیکھانے پر اپنا پورا زور خرچ کرتا تھا۔ جھوٹی دستاویزات جعلی کاغذات بنائے جاتے تھے صرف دو چار اصحاب یعنی مولوی سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) مولوی محمد انور خاں وغیرہ اصحاب اس قسم کے سیاسی امور سے علحدہ تھے۔ اس لئے اپنی زندگی تک حیدرآباد میں کارگزار رہے شہر بدر ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

بعض حیدرآبادی اصحاب مثلاً عبد القیوم صاحب اور والد مرحوم مولوی عبد القادر صاحب درد قومی رکھتے تھے۔ ملک کی تعلیمی پستی کا ملال تھا۔ ملک کی جہالت کو دور کرنے علم کو پھیلانے کی جدوجہد کرتے تھے۔ مگر ان کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی آواز تھی۔ کوئی ان کی دردمندانہ صدا پر لبیک نہیں کہتا تھا۔

تعلیمی رجحانات شرفا حیدرآباد کے خیالات اور رجحانات تعلیم کے بارے میں مختلف تھے بعض ابتدا تعلیم سے ہی انگریزی تعلیم کو پسند کرتے تھے اور اپنے بچوں کو سرکاری مدرسوں میں تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔ بعض اصحاب بالکلیہ مشرقی تعلیم کو مفید خیال کرتے اور دار العلوم اور مدرسہ نظامیہ کی طرف رجوع ہوتے تھے اور بعض ایسے تھے اول گھر پر تعلیم دلاتے تھے یہ تعلیم زیادہ تر مشرقی (عربی فارسی) کی ہوتی تھی اس کے بعد دار العلوم یا انگریزی مدرسوں میں داخل کراتے تھے۔ کوئی سرکاری بورڈنگ طلبہ کے لئے نہیں تھا اور نہ کھیل کود کے میدان تھے اور نہ مدرسوں کی جانب سے پوری طرح امداد دی جاتی تھی سرکار سے وظائف کا قاعدہ تھا مگر نہ ہونے کے برابر تھا دار العلوم میں ان وظیفوں کی مقدار ایک روپیہ سے لیکر چھ سات روپیہ تک ہوتی تھی۔

ہمارے خاندان میں بھی تعلیمی رجحانات جداگانہ تھے۔ مثلاً میرے بڑے بھائی احمد کو مدرسہ عالیہ سے انگریزی تعلیم دلانے کے بعد مدراس کی میٹرک میں کامیابی حاصل کرادی گئی تھی اور

محکمہ فینانس کا کامل تجربہ کرایا گیا چھوٹے ماموں کو مدرسہ دارالعلوم میں شریک کیا گیا اور وہ پنجاب یونیورسٹی سے منشی منشی عالم منشی فاضل وغیرہ کے امتحانات کامیاب کئے میرے بیوہ زاد بھائی مولوی مرتضیٰ اور محمد منظہر صاحب اسی طرح مدرسہ دارالعلوم سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی مگر ان کے چھوٹے بھائیوں کو مدرسہ عالیہ میں شریک کیا گیا تھا۔

میرا خاندانی ماحول

ہمارے خاندانی چند خصوصیات ہیں جو گذشتہ درمیانی بلکہ اس سے زیادہ صدیوں سے رائج ہیں مثلاً ہمارے خاندان میں نہ تو غیر خاندان سے لڑکی بیاہ لائی جاتی ہے[1] اور نہ ہمارے خاندان کی کوئی لڑکی باہر بیاہ دی جاتی ہے۔ اس خاندانی شادی بیاہ کی وجہ سے خاندان کے افراد خواہ وہ مرد ہوں یا عورت ایک خاص صورت شکل کے ہوتے ہیں جو صدہا اشخاص میں ممیز ہو جاتے ہیں۔ تعلیم کا رواج تعلیم کی دلچسپی عورتوں مردوں میں پائی جاتی ہے۔ مذہبی شخصیت میں افراد خاندان ممتاز ہوتے ہیں۔ وہ ملازمت اور پھر تجارت سے روزی پیدا کرتے ہیں۔ محنت کرنا اور اپنے مفوضہ کام سے زیادہ کام کرنا ان کا معمول ہوتا ہے۔ پبلک امور میں وہ پوری دلچسپی لیتے ہیں اور ان امور کو وہ اس قدر دلچسپی اور تندہی سے انجام دیتے ہیں کہ گویا وہ ان کا ذاتی کام ہے جب وہ کوئی اعزازی کام کرتے ہیں تو اس کے انصرام میں اپنی ذاتی رقم بھی خرچ کر دیتے ہیں فنڈ کی کامل حفاظت کرتے ہیں وہ اپنی ملازمت کے دوران میں چاپلوسی اور خوشامد نہیں کرتے اس وجہ سے ہمیشہ ان کے حقوق تلف ہوتے ہیں وہ قابل مستحق اور سنیر ہونے کے باوجود ترقی سے محروم کئے جاتے ہیں۔ ان امور کے متعلق پھر کبھی آئندہ صراحت کی جائیگی۔

اس زمانہ میں یعنے آج سے چالیس پچاس سال پہلے حیدرآباد میں ہمارے خاندانی افراد جیہہ علیحدہ علیحدہ مکانوں میں رہا کرتے تھے بزرگ خاندان میرے نانا مولوی

---

[1] اس صدیوں کے رواج کو میرے بڑے بھائی عبدالرؤف مرحوم نے توڑ کر خاندان کے باہر شادی کی انور خاں کے بھتیجے احسن خاں صاحب کی لڑکی بیاہ کی گئی۔

حسین عطاء اللہ صاحب مرحوم تھے۔ جن کو نائب معتمدی فینانس سے وظیفہ ہوگیا تھا اور
پائیگاہ آسمانجاہی میں میرمجلسی کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ میرے نانا کے مکان ہی
میں ان کے دونوں فرزند اور ایک دختر اپنی اولاد اور شوہر کے ساتھ مقیم تھے۔ میرے خالو
میرے چچا بھی تھے۔ میرے والد اپنے اولاد کے ساتھ علحدہ مکان میں جسکو ترپ باغ کہا جاتا تھا
مقیم تھے۔ مگر میری والدہ اپنے سب بچوں کے ساتھ ہر ماہ ہفتہ عشرہ کے لئے نانا صاحب کے
مکان میں آجاتی تھیں۔ کیونکہ نانا صاحب کی ماہوار کا حساب کتاب لکھنا اور تنخواہیں وغیرہ تقسیم
کرنا سب میری والدہ سے متعلق تھا۔ روزآنہ بعد مغرب خاندان کے چھوٹے بڑے افراد دوسرے
گھروں میں رہا کرتے یعنی مولوی صفی الدین صاحب اور ان کے بھائی عبداللہ صاحب اور مولوی
خلیل اللہ وغیرہ سب کے سب نانا صاحب کے مکان میں اکثر جمع ہوتے سیاسی۔ تاریخی
علمی گفتگو سب کا موضوع بحث ہوتا اور ہم بچے ان کو سنا کرتے۔ میرے بڑے ماموں انگریزی
پوری طرح واقف تھے ان کے پاس انگریزی اخبار آتے وہ اسکی تار کی خبریں وغیرہ سناتے
تھے۔ کبھی شعر بازی ہوتی۔

بچوں کی تعلیم ان کی رسم بسم اللہ کے بعد آغاز ہوتی تھی۔ خاندان میں جو ثروت تھی
اس کے لحاظ سے بسم اللہ کی تقریب حسب حیثیت ہوتی مگر ہمارے یہاں کبھی رنڈیوں کا
گانا نہیں ہوسکتا تھا اور نہ وہ ہمارے گھروں میں قدم رکھ سکتی تھیں۔ میراثنوں کا
گانا ہوتا تھا۔ تقاریب کے علاوہ ہر عید کو وہ آتیں اور گھنٹہ دو گھنٹہ گا کر اپنے معمول
لے جاتی تھیں۔ تقریبوں میں نوبت روشن چوکی بھی آتی تھی شادی بیاہ کے موقع پر
رسومات نہیں ہوتے شادی بیاہ کے لئے ایک خاص ضابطہ اور دستورالعمل نافذ تھا
جس کے مطابق افراد خاندان عمل کرتے تھے۔ خاندان کے بزرگوں میں عربی لباس
کی جھلک نظر آتی تھی نوجوانوں کے سوا باقی اصحاب شیروانی کے ساتھ شملہ یا عربی
عمامہ زیب سر کرتے جبہ ضرور ہوتا۔ دربار میں جانا ہوتا تو اس لباس میں جاتے
تھے عورتوں میں ساڑی کے ساتھ پائجامہ دوپٹہ اور لہنگا مع اوڑھنی کا رواج تھا۔ کرتا یا
قمیص اس کے ساتھ استعمال ہوتی۔ خاندان کی عورتیں بھی اپنے بزرگوں کے پاس

تعلیم پائی تھیں۔

میرے والد کا مکان جو ترپ باغ سے موسوم تھا در اصل ایک سر سبز و شاداب
باغ ہی تھا۔ موز۔ جام۔ نارنگی۔ آم وغیرہ کے درخت موجود تھے ترکاری بوئی جاتی۔ باولی سے
پانی دیا جاتا۔ اور اسی باولی سے حوض میں فوارا چھوٹتا۔ اکثر تقریبوں میں خاندان کے
سب افراد ہمارے یہاں جمع ہوتے اس وقت باغ میں پورا پردہ ہوتا خاندانی مستورات
باغ میں چہل قدمی کرتے۔ بچے درختوں پر چڑھ کر پھل کھاتے۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں پیدائش ہوئی اور بچپن گزرا میری پیدائش ۱۷؍
رمضان ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۰؍ اردی بہشت ۱۳۰۴ف (۵؍ مارچ ۱۸۹۵ء) یوم
جمعہ ہوئی آفتاب حمل کے برج میں تھا۔ والد مرحوم کو اس تاریخ سے بڑی دلچسپی
تھی۔ ایک جنتری میں ہر روز کے مشہور حالات خواہ وہ خاندان کے ہوں یا سیاسی
ضرور لکھا کرتے اب تک یہ جنتریاں محفوظ ہیں۔ حیدرآباد کی تاریخ کا ایک اچھا
مواد پیش کرتی ہیں۔

ہمارے یہاں اکثر بچوں کی دو دو بسم اللہ ہوتے تھے۔ جس کو چھوٹی اور بڑی
بسم اللہ کہا جاتا چھوٹی بسم اللہ وقت مقررہ یعنی چار سال چار ماہ چار دن پر
ہو جاتی اور بڑی بسم اللہ تیاری کے بعد ایک دو ماہ کے بعد ہوتی تھی۔ مجھے اکثر باتیں
اپنی بسم اللہ (تسمیہ خوانی) سے یاد ہیں۔ مجھے اپنی پیدائش کے ساتھ ہی میرے
چھوٹے ماموں نے جن کی اس وقت شادی نہیں ہوئی تھی مجھے اپنا داماد بنانے کا اقرار
کر لیا تھا اس لئے میرے اکثر تقاریب بلکہ سالانہ سالگرہ بھی میری نانی صاحبہ انجام دیا
کرتیں۔ میری بھی دو تسمیہ خوانیاں ہوئیں چھوٹی بسم اللہ بر وقت ہوئی مجھے اپنی نانی
صاحبہ کے مکان سے گھوڑے پر والد صاحب کے مکان کو لایا گیا اور یہاں نانا صاحب نے
بسم اللہ پڑھائی اس کے دو تین ماہ کے بعد بڑی بسم اللہ ہوئی اس کے لئے مدراس سے
دادی صاحبہ اور پھپھو وغیرہ آئی تھیں اور یہ تقریب نانا صاحب کے مکان میں انجام پائی
ہمارے خاندان میں شادی بیاہ کے موقع پر مرد زریں لباس نہیں پہنا کرتے بلکہ ہمرو کی شیروانی

زیب تن کرتے تھے البتہ بچوں کو بسم اللہ وغیرہ رسوم میں زرین شیر اور تاشں وغیرہ کی شیروانیاں بنائی جاتیں اگرچہ میری بسم اللہ بعض دوسرے بھائیوں کے مقابل زیادہ کروفر سے نہیں ہوئی مگر پھر بھی نوبت۔ روشن چوکی وغیرہ آئی تھی۔ خاندان کے سب لوگ مدعو تھے غیر خاندانی احباب میں نانا صاحب اور والد صاحب کے دفتر کے احباب اور بعض ان کے مخصوص دوست احباب جمع ہوئے تھے۔ اس بسم اللہ کو چونکہ دادی صاحبہ آ گئی تھیں اور وہ بزرگ خاندان تھیں میرے نانا صاحب کی سگی بڑی بہن تھیں، اس لئے انہوں نے بسم اللہ پڑھائی تھی۔

میرے والد ان لوگوں میں شامل تھے جو اولاد کو شروع سے انگریزی تعلیم آغاز کرانے کے مخالف تھے۔ پہلے مشرقی تعلیم ضروری قرار دیتے تھے اور پھر کچھ عرصہ تک گھر پر تعلیم دلانے کے حامی تھے۔ مدرسوں میں تعلیم کے لئے وہ یہ سمجھتے تھے کہ جن اصحاب کو مقدور ہو وہ فوراً مدرسے ہی میں بچوں کو داخل کرانے کے بجائے گھر پر تعلیم دیں تاکہ مدرسے میں جہاں ہر قسم اور ہر اخلاق اور ہر طبقہ کے بچے ہوتے ہیں اور اخلاقی لحاظ سے اس کا اثر ہو جاتا ہے تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ تربیت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اس لئے میرے تینوں بڑے بھائی گھر پر تعلیم پاتے تھے۔ صبح والد صاحب خود ایک دو گھنٹہ تعلیم دیا کرتے اور پھر دس بجے سے چار بجے تک ایک استاد مامور تھا یہ اردو۔ فارسی۔ خطاطی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

بہرحال میری تعلیم بھی اسی طرح آغاز ہوئی۔ الف۔ ب کی تعلیم کے بعد قرآن شریف کی تعلیم اور ساتھ ساتھ "کریما" بلا معنی اور معجزات نبی کی تعلیم ہونے لگی قرآن مجید خطاطی تو استاد صاحب دیا کرتے اور کریما اور معجزات النبی میں اپنے والد کے پاس پڑھا کرتا۔ کچھ عرصہ کے بعد انجمن حمایت اسلام لاہور کی اردو کتابیں شروع کیں۔ ابتدائی کتاب میں آغاز ہوا۔

اس زمانہ کا ایک واقعہ قابل اظہار ہے وہ یہ ہو کہ اوپر لکھ آیا ہوں کہ ہمارے خاندان میں بعض مرتبہ شب کے وقت جب افراد خاندان جمع ہوتے تو شعر بازی ہوتی تھی۔ میں اس موقع پر اس دلچسپ مشغلہ میں حصہ لیا کرتا تھا اور کریما کے فارسی اشعار سنایا

کرتا۔ جب میں نے انجمن حمایت اسلام کی اردو کتابوں میں نظم کا حصہ پڑھا و یکیا تو اس امر کا شوق پیدا کہ ان اشعار کو ردیف وار لکھوں تاکہ شعر بازی کے موقع پر ان کو یاد کیا جا سکے۔ جب میں نے اپنا یہ خیال اپنے والد سے ظاہر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور میری ہمت افزائی کے لئے فوراً کاغذ پر سطر کھینچ کر دیا اور کتاب کا نام "گلزار فصیح" تجویز فرمایا۔ اس کتاب کا اصل مسودہ میرے پاس اب تک موجود ہے۔ جو گویا میری پہلی تصنیف ہے۔

میرے والد خود کئی کتابوں کے مصنف تھے اور اخبارات میں ان کے مضامین نام کے ساتھ اور بلا نام بھی شائع ہوتے تھے۔ حیدر آباد کے اخباروں کے اڈیٹران سے خواہش کر کے مضامین جو تاریخی اور حیدر آباد کے نظم و نسق کے متعلق ہوئے تھے حاصل کرتے تھے۔ میرا خیال ہے زمانہ مابعد میں مجھے جو تصنیف سے دلچسپی ہوئی وہ میرے والد کی ابتدائی ہمت افزائی اور روحاً مجھے یہ ترکہ ملا ہے۔

اسی زمانہ میں میری بڑی بہن کی شادی ہوئی جو والدین کی پہلی اولاد ہونے سے پہلی بڑی تقریب تھی اس لئے ہمارے دادا صاحب نواب شرف الدولہ حیدر آباد آئے تھے اور میں نے پہلی مرتبہ اپنے دادا کو دیکھا تھا۔ کئی روز تک اس تقریب کی دھوم رہی۔ نہ صرف ارباب خاندان بلکہ والد کے دوست احباب بھی کئی دن تک ہمارے گھر میں مقیم رہے تھے۔ ان اصحاب سے میں واقف ہوں مگر قصداً ان کے ناموں کی صراحت متروک کی جاتی ہے۔

میری صحت بچپن میں اچھی نہیں رہتی تھی۔ مہینہ دو مہینہ کے بعد کوئی نہ کوئی عارضہ ہو جاتا۔ بخار۔ کھانسی۔ وغیرہ معمولی بیماریوں کے قطع نظر ایک مرتبہ پیچش سے نو ماہ تک دوسرے مرتبہ چار پانچ ماہ تک علیل رہا ایک مرتبہ ہیضہ کا حملہ بھی ہو گیا۔ غرض اس طرح میری تعلیم کا سلسلہ کئی مرتبہ منقطع ہوتا گیا۔ اس تعلیمی سلسلہ کے وقفہ کی وجہ سے میں نے اپنے بارہ سال کے سن میں اردو کی دو کتابوں۔ فارسی دیک کریما اور منتخب الحکایات (مولانا سید احمد) کے سوا زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا

البتہ قرآن کے کئی سپارے ختم کئے تھے کچھ حساب بھی آتا تھا۔

۱۳۲۲ھ کے اواخر میں میرے چھوٹے ماموں کی شادی ہوئی ہے۔ کئی ہفتے تک اس کی دعوتیں ہوتی رہیں۔ مدراس سے بیسیوں اہل خانہ اقربا نے شرکت کی۔ شادی کا پورا انتظام اہتمام میری والدہ اور میرے والد کے ذمہ تھا کیونکہ یہی دونوں منتظم اور با سلیقہ مانے جاتے تھے اور درحقیقت ان کو جو مہارت حاصل تھی اس کا عشر عشیر بھی کسی اور فرد خاندان کو نہیں تھا۔

اس شادی کے بعد ہی ۱۳۲۳ھ کا آغاز ہوا اور اس سنہ کے ماہ شوال میں میرے دادا کا پچھتر ۷۵ سال کے سن میں انتقال ہوا۔ اس کے بعد میرے والد کا مزاج بھی علیل رہنے لگا۔ ۱۳۲۴ف حیدرآباد کی تاریخ میں اس لئے مشہور رہیگا مرحوم اعلیحضرت آصفجاہ سادس غفران مکان کی چہل سالہ جوبلی کا جشن منایا گیا۔ اس تقریب کے بعض جلسوں میں مجھے شرکت کا موقع ملا تھا۔ جشن کے موقع پہ ایک نمائش میں باغ عامہ کے اڈریس ہال میں ایک ماہ تک ہوتی رہی۔ لاکھوں کا مال فروخت ہوا حیدرآباد کے لئے۔ نمائش ایک جشن شادیخانہ بنا ہوا تھا۔ باغ عامہ کے چپے چپے مسرت اور خوشی کی لہریں اٹھا کرتی تھیں اس نمائش کے موقع پہ ایک جلسہ بچوں کے فینسی ڈریس میں ہوا میں نے اس موقع پہ بدو کا لباس پہنا تھا اس کا فوٹو میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔

میرے والد اس زمانہ میں علیل ہو گئے تھے چنانچہ جوبلی کے بعض تقریب میں وہ شریک بھی نہ ہو سکے انہیں مرض دق لاحق ہو گیا تھا بالآخر ۲۲ رجب ۱۳۲۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا (باقی آئندہ)

شکریہ۔ غوثیہ وحید کا جنہوں نے تین خریدار بھجوائے ہیں۔

جنگ جیسے عالم گیر انتشار میں نہایت پابندی سے نکلتا رہا توقع تھی امن کے زمانہ میں وہ نہایت تابناک ہو جائیگا لیکن کیا خبر تھی کہ امن کا دور اسقدر پریشان کن ثابت ہوگا کہ قدیمی رسائل تھا اس سے متاثر ہونگے اطلاعات عامہ سرکار عالی نے اطلاع دی ہے کہ اخبارات وغیرہ اپنی ضخامت گھٹادیں اور سرپور پیپر کمپنی نے کاغذ کی قیمتوں میں دو چند اضافہ کردیا ہے ایسی حالت میں بجز اسکے کوئی صورت نہیں کہ سالانہ چندہ میں ایک روپیہ کا اضافہ کیا جائے یعنے ماہانہ (۸ ر) آپکو بار نہ ہونا چاہئے انشاء اللہ یہ اضافہ عارضی ہوگا۔

جہاں آپنے آج ۱۶ سال سے ہمارے حوصلہ افزائی کی ہے وہاں ایسی حالت میں اپنے تعاون سے دریغ نہ کرینگے کیونکہ حیدرآباد کے ادبی رسائل میں شہاب ہی پہلا پرچہ ہے اور اس کی لاج آپ کے ہاتھ ہے۔

بلاشبہ اس طویل عرصہ میں زیادہ تر خواتین کا دست تعاون شہاب کی بقا میں دراز رہا ہے اور اب جبکہ شہاب ایک مشکل دور سے گذر رہا ہے اپنے عملی تعاون کے ثبوت میں کثیر خواتین جن کے پاس شہاب آرہا ہے اپنی پوری صلاحتیں اور توانائیاں صرف کرینگی اور ہر خاتون اپنے اپنے حلقہ اثر سے وہ دو دو چار چار خریدار بہم پہونچائے تو بڑی حد تک ہماری مشکلات کا حل نکل آئیگا اور وہ حضرات جو شہاب نہایت پابندی سے ملاحظہ کرتے ہیں اپنی ہمدردیوں سے تامل نہ فرمائینگے۔

امید کہ یہ اپیل آپکو متاثر کرسکے گی۔

اپنا فسانہ

میر اکبر علی خاں اکبر

دل جو یوں بیقرار ہوتا ہے — کس کا یہ انتظار ہوتا ہے
پھر دلاتے ہیں وہ یقین وفا — پھر مجھے اعتبار ہوتا ہے
نا امیدی کا آخری لمحہ — حاصل انتظار ہوتا ہے
شام غم تیری یاد سے دل میں — درد بے اختیار ہوتا ہے
آ... کہ پلکوں پہ آ گئے آنسو — راز غم آشکار ہوتا ہے
تم کو شاید خبر نہیں اسکی — کوئی تم پر نثار ہوتا ہے
ایک موہوم آرزو کے لئے — دل عجب بیقرار ہوتا ہے
اڑ گئیں دھجیاں گریبان کی — یہ مآل بہار ہوتا ہے
ترک الفت کے بعد بھی میرا — ذکر کیوں بار بار ہوتا ہے
واردات الم نہ پوچھ اے دوست — دل بہت بیقرار ہوتا ہے
سعی اخفا کے بعد بھی اکثر — غم دل آشکار ہوتا ہے

دل کو جس نے دیا تھا غم اکبر
اب وہی غمگسار ہوتا ہے۔

غزل

جناب فضل محمد خاں صاحب بسمل

دین و دنیا سے تنگ ہیں ہم لوگ — باعث شرم و ننگ ہیں ہم لوگ
کچھ سمجھتا نہیں یہ سبب کیا ہے — ابتدا ہی سے دنگ ہیں ہم لوگ
عہد ماضی میں ہم یہ کہتے تھے — بس سراپا امنگ ہیں ہم لوگ
اب تو یہ حال ہو گیا اپنا — کہتے ہیں خشت و سنگ ہیں ہم لوگ
توبہ کرتے ہیں پھر بھی پیتے ہیں — اپنی عادت سے تنگ ہیں ہم لوگ

ہم جو بسمل نہ ہوں تو پھیکی ہو۔
تیری محفل میں رنگ ہیں ہم لوگ

ہر سحر ذکرِ ساغر و مینا لئے ہوئے

جہاں بانو

سیری نہیں ہوتی، نہیں ہوتی، نہیں ہوتی — اے پیر مغاں اور، ابھی اور، ابھی اور

نوح ناروی

ایک تو پہلے ہی تھی ٹھنڈی ہوا توبہ شکن — مست بادل اور بھی نیت کو بہکانے لگے

ماہر القادری

لایا ہے دل پہ کتنی خرابی — اے یار تیرا حسن شرابی

حسرت

برسات کے آنے سے توبہ نہ رہی باقی — موسم کے بدلتے ہی بدلی میری نیت بھی

حسرت

وہ آتش آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتا ہے — طلب صادق نہ ہو تیری تو پھر کیا شکوۂ ساقی

اقبال

مسکرا کر جام خالی مجھ کو ساقی نے دیا — میں سمجھتا ہوں کہ سب کچھ میرے پیمانے میں ہے۔

باسط

بے ہوش ہوں، اور پھر بھی یہ کہتا ہے کہ پی اور — دیکھا نہیں ساقی کی طرح میں نے سخی اور

نوح

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی — چھیڑ نا مت کہ بھرے بیٹھے ہیں

مصحفی

آنکھیں ساقی کی تھیں رسیلی — اب تک میں بچا تھا، آج پی لی۔

اکبر الہ آبادی

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار — جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

شاد عظیم آبادی

مجھ تک اس کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

غالب

نخستیں بادہ کاندر جام کردند — ز چشم مست ساقی وام کردند

عراقی

ابر مینا برسنے کے ہوتے مجمل — چشم ساقی سے مے برستی ہے

نظر ملا کے محبت جتا کے پیتا ہوں — میں اپنے ساقی کو اپنا بنا کے پیتا ہوں

مشہد مسلک و مشرب ہے میرا رندانہ — میں اپنے ساقی پہ ایمان لا کے پیتا ہوں

[illegible]

کاش میں کامیاب ہوتا

سید معین الدین مغربی

امرداد کا مہینہ آیا اور اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ اپنے دامن میں حیات و موت کی کشمکش لیا ہوا مختلف پیامات سناتا ہوا کسی کو خوشی کا پیغام دیا راحت کی نوید جانفزا سنائی رحمت کی بارش برسائی اور کسی کے لئے باعث زحمت بنا رنج و محنت کے پہاڑ توڑے اور آفت و مصیبت کے سامان بہم پہنچائے۔

اسکول کا طالب علم ہی سمجھ سکتا ہے کہ امرداد کی اہمیت کامیاب ہو گئے آگے بڑھے لیکن کن سے وہی جو اُن کے زمرے میں شامل ہوئے۔ وہ ہنسنے لگے خوشیوں کے نعرے اور بے ہنگم قہقہے زبان سے ادا ہوئے لبوں سے پھسلے اور فضائے بسیط میں پھیل گئے اور پھر غائب۔ گویا زمین اور آسمان نے انہیں اپنے آپ میں سمو لیا۔

ان کے عین مقابل ایک اور گروہ بھی تھا۔ ناکامی اور ناامیدی کی مکمل تصویر لرزاں و ترساں چہرے جن کی آنکھوں میں اشکوں کے موتی امڈے چلے آرہے تھے۔ گویا سیال چاندی بہی چلی جا رہی ہے وہ سوچ رہے تھے وہ کتنے خوش خوش اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئے تھے۔ اور یہ کیا؟

نتیجہ نکلا امیدیں آرزوئیں دو ٹولیوں میں منقسم ایک ہنس رہا ہے ایک رو رہا ہے۔ ایک اپنے آپ کو کچھ سمجھ رہا ہے دنیا کی چہل پہل میں دلچسپی لے رہا ہے اور ایک اپنے آپ کو کوس رہا ہے دنیا کی دلچسپیوں سے بیزار اور اپنے آپ سے بیزار۔

نعیم بھی انہی میں کا ایک تھا وہ اپنے مستقبل سے شدید طور پر حیران و پریشان تھا۔ اسے افسوس تھا اپنے آپ پر سولہ ۱۶ سال دن کی طویل مدت میں کتنی امیدیں وابستہ کر رکھی تہیں اس نے لیکن آج بھی اپنی حسرتوں کا جنازہ نکلا۔ اس کی وابستہ امیدیں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ اب اس کا دماغ مختلف تفکرات اور ہیجانات کا آماجگاہ تھا۔ وہ اپنے دماغ سے جنگ کر رہا تھا۔ ہاں جنگ کہ وہ کسی سیدھے راستے پر گامزن ہو جائے۔ کاش میں کامیاب ہو جاتا۔

انہی خیالات میں گھرا ہوا وہ روانہ ہوا خیمہ گاہ سے میدان حشر سے نکلا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہونے لگا۔ اس کے قدم تھرا رہے تھے۔ خیالات نے اُسے شدید طور پر مجروح کرنا شروع کیا۔ اب کیا منہ لیکر گھر جائے کیسے اپنی صورت دکھائے؟ وہ اپنے آپ میں باتیں کرنے لگا رات کی تاریکی سے وہ ہمکلام تھا۔ اب ہستے اپنے ضعیف والد کا خیال آیا جو عالم ضعیفی میں چار میل پیدل دفتر جاتے۔ اس ضعیفی میں بھی پورے خاندان کی پرورش انہی کے دوش پر منحصر تھی۔ آہ ہندوستان تیری مفلسی کے اسباب میں یہ بھی ایک سبب ہے اور یہی تیری ترقی میں مانع۔ غضب خدا کا پیدا کرے ایک اور روٹیاں توڑے پورا خاندان۔ پھر وہ اپنے عزیزوں سے متعلق سوچنے لگا کہ کتنے قریبی ہوتے ہوتے بھی کتنے دور ہیں وہ۔ اسے اپنے بھائی کی کہی ہوئی بات یاد آئی جو انھوں نے فارغ التعلیم ہونے کے بعد کہی تھی۔ کیا کروں بابو تم لوگوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ دعا کرو کہ مجھے کوئی اچھی نوکری مل جائے پھر ایک بڑا مکان لیکر اس میں چار میں گے پھر تم سب کی تعلیم کا انتظام کرونگا۔ ایک بڑے کمرے میں پھر ایک کے لئے میز کرسی الگ الگ ایک آفس کے مانند بنوا دونگا۔ کتنا اچھا معلوم ہوتا تھا نعیم اور اس کے بہن بھائیوں کو یہ کہنا۔ انہیں ایسا معلوم پڑتا تھا نیکی کا فرشتہ آیا ہوا مسکرا مسکرا کر انہیں ہمارے شاندار مستقبل کا پتہ دے رہا ہے۔ لیکن یہ اب کیا ہے؟ کیا یہ سب وہ ہو کا تھا؟ شراب تھا؟ یا کوئی خوش آئند خواب کی ایک دھندلی تصویر؟ کیا نعیم اور اس کے بہن بھائیوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اٹھا کر دعا نہ کی تھی کہ خداوندا تو ہمارے بھائی کو اچھی نوکری دلا کیا ان کا ننھے معصوم دلوں کی دعائیں قبول نہیں ہوئیں؟ کیا بھائی کو ابھی تک اچھی نوکری نہیں ملی؟ اس نے تصور ہی تصور میں اپنے گھر کو دیکھا۔ نعیم کے والدین اور بھائی اس کا انتظار کر رہے تھے وہ سخت کشمکش میں مبتلا نظر آ رہے تھے اضطراب ان کے چہروں سے عیاں تھا اور امید و یاس آشکار۔

کاش میں کامیاب ہوتا۔ ایک دفعہ اُس نے پھر اپنے آپ سے کہا۔ رفتار زمانہ کا یہ تقاضا اس پر اس قدر گراں گذرا کہ اسے دل ڈوبتا معلوم ہوا۔ آنسوؤں کا سیلاب بند توڑا اور رکا رکا طوفان اب پھر پھیلنے لگا اب بارش ہونے لگی اور اسے ایسے معلوم ہوا گویا آسمان اس کے حال زار پہ اشک فشاں ہے۔ اُسے گرد و پیش کی تمام چیزیں روتی نظر آئیں۔ کیا والد کو اس ضعیفی میں پھر دفتر جانا پڑے گا؟ کیا انہیں پیدل روزانہ یہ طویل مسافت طے کرنے ہی پڑے گی؟ کیا انھیں ابھی آرام نہیں ملے گا؟ کاتب تقدیر نے کیا ابھی ان کے حق میں عافیت نہیں لکھی؟ انہی خیالات نے اُسے گھر تک پہونچا دیا وہ ٹھٹکا آنسوؤں کو دستی میں جذب کیا اور گھر میں داخل ہوگیا۔ درد بھری تصویریں اپنے بیٹے اور بھائی کے انتظار میں تھیں۔ میں فیل ہوگیا امی۔ ابا میں فیل ہوگیا ایک گھنٹی اور رونہار آوازیں اُس نے یہ جملے ادا کئے اور نعیم فرش پہ دراز ہوگیا۔ رات کی تاریکی میں ایک سرد آہ کسی کے لبوں سے نکلی۔ والد نے ضبط کیا بہن اور بھائی حیران کہ یہ ستم کہاں سے ٹوٹ پڑا۔ اب افسوس سے کیا فائدہ نعیم کے والد نے کہا۔ تمہارا اب ارادہ کیا ہے۔ کیا عرض کروں نعیم کا جواب تھا۔

پڑھو اور پھر پڑھو انہوں نے کہا اب کے ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ ناامید نہ ہو شیخ سعدی نے ۴۰ سال کی عمر میں ا۔ ب۔ شروع کی تھی۔ کیٹو نے ۸۰ برس کی عمر میں یونانی زبان اور فرینکلن نے ۵۰ برس کی عمر میں فلسفہ پڑھنا شروع کیا تھا۔ سقراط نے عالم ضعیفی میں علم موسیقی کا درس لیا تھا۔ تمہیں حصول علم میں پھر کوشش کرنی چاہئے۔

نعیم خاموش تھا۔ ان الفاظ نے اس پر مرہم کا کام کیا۔ سینے سے اس کے ایک بوجھ سا اٹھا اس نے ارادہ کر لیا کہ اب کے اچھے نمبروں سے امتحان کامیاب کرونگا۔

لیکن اب بھی کبھی کبھی یہ جملہ اس کے دل کے کسی گوشے سے نکلتا اور وہ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔

کاش میں کامیاب ہوتا۔

مرقع علی ساگر

یہ ان کے مسودات میں یہ نظم ملی ہے خبر نہیں کہ لہو ترنگ میں موجود ہے یا نہیں۔ لیکن ہم شہاب میں شائع کر رہے ہیں۔ کہ وجد ویرینہ سنت کی تجدید پر پھر آمادہ ہو جائیں۔ کیونکہ آپ نے ایک عرصہ سے شہاب کو فراموش کر دیا ہے۔

جناب سکندر علی صاحب وجد ایچ سی ایس

علی ساگر میں بحر زندگانی موجزن دیکھا ∙ تمنا کا گلستاں آرزوؤں کا چمن دیکھا
زمیں کے چپے چپے کو فلک پر خندہ زن دیکھا ∙ دل شاعر تڑپ جاتا ہے ایسا بانکپن دیکھا

عیاں ہر موج سے ہے پیچ و خم جوش جوانی کا
دکھاتی ہے شعاع مہر منظر آگ پانی کا

فضا کی کیف باری اور مناظر کی فراوانی ∙ پگھل کر بہہ رہی ہے سیم و زر اس تال کا پانی
یہاں فطرت بھی چشمک کر رہی ہے عقل انسانی ∙ ہے ساحل کی پریشانی بخود پانی کو حیرانی

مصائب لاکھ ہوں اہل بصیرت غم نہیں کرتے
جو عالی ظرف ہیں تکلیف میں ماتم نہیں کرتے

صبح کا منظر

نشے میں حسن کے سرشار ہے مدہوش ہے ساگر ∙ بہاریں سیکڑوں لاکھوں چمن بردوش ہے ساگر
پیام صبح سننے کو سراپا گوش ہے ساگر ∙ سراسر جلوہ گاہِ نغمۂ خاموش ہے ساگر

جب عالم ہے سیمائے چمن گویا پُر افشاں ہے

پڑی ہے اوس وادی کا گو ہر مقصد بدامان ہے

شام کا نظارہ

کس اہل دل نے یہ رحمت کا دریا کر دیا جاری — یہ قدرت ہمینہ ہے ہیا معروف گلکاری
عروس ماہ کے جلوے کی جب ہوتی ہے تیاری — شفق پانی میں حل کرتا ہے جھک کر چرخ زنگاری

کنار آب دام موج یوں گلبار ہوتا ہے
گلے میں سبز ساحل کے گلوں کا ہار ہوتا ہے

چاندنی کا سماں

شب مہتاب میں جنت نظر ہوتے ہیں نظارے — ہوا گلبن پہ دہکاتی ہے ہر جا لال انگارے
چمن میں پھول بن جاتی ہیں کلیاں جوش نکہت سے — لٹاتے ہیں خوشی سے چاندنی حوضوں میں فوارے

محبت سے فرشتے گوش بر آواز ہوتے ہیں
ہے ارض پاک پر حسن اور نغمہ مل کے بستے ہیں

اندھیری رات کا عالم

شب تاریک میں ہر ذرہ ہیبت بار ہوتا ہے — اجل کی گود گویا دامن کہسار ہوتا ہے
نظر کو آنکھ سے باہر نکلنا بار ہوتا ہے — نفس سینے میں اک چلتی ہوئی تلوار ہوتا ہے

سیہ پانی پہ موجیں مچھلیاں معلوم ہوتی ہیں
گھٹائیں تلملاتی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں

تری خاک چمن کو میں نے پلکوں سے اٹھایا ہے — گل و ریحان کو تیرے اپنی آنکھوں سے لگایا ہے
تری رعنائیوں میں اپنے شعروں کو بسایا ہے — تیری تعریف کا نغمہ تجھے پہروں سنایا ہے

میری آواز کی تجھکو رہے گی آرزو برسوں
تجھے بھی اسے علی سا گر کرے گا یاد تو برسوں

کسی کی عید

کیونکر یقین آئے کہتے ہیں عید ہے آج
ہاں "عید" اون کی ہوگی جن کو کہ "دید" ہے آج

پامال آرزو ہوں تصویر رنج و غم ہوں
اس بزم عیش میں اک میں مور دالم ہوں

ماضی کی صحبتیں اب آنسو رولا رہی ہیں
گذری ہوئی وہ خوشیاں دل کو جلا رہی ہیں

وہ عید کی سحر میں کروٹ بدل بدل کر
بیتاب ہو کے کہنا ہوگی ابھی رات آخر

مشتاق دید ہو کر میرا کہیں وہ جانا
ہے "عید آج" کہکے اون کا وہ مسکرانا

جب آپ آ گئے ہیں ہوگی نہ عید کیونکر
وہ دل اگر ہم ہوں ہے عید سے بھی بڑھ کر

ہیں میری زندگی کے گذرے ہوئے یہ قصے
دہرا رہا ہوں جن کو تنہائیوں میں بیٹھے

کیوں چھیڑتا ہے مجھکو بام فلک پہ آکر
تیرے پیام سے ہوں اے چاند میں مکدر

جب کلبۂ حزیں میں آئے گا چاند میرا
تاریک قسمتوں کا ہو جائے گا سویرا

بسمل

فردوسی

بسلسلۂ گذشتہ

ستروال منظر

(وسیع مرغزار میں بیسوں خیمے نصب ہیں۔ ملازمین مصروف کار۔ گھوڑے اونٹ وغیرہ کی کثرت سے جنگل میں منگل ہے۔ سپاہی جن کے ہاتھ میں نیزے کمر میں خنجر۔ پشت پر ڈھالیں ہیں۔ دور سے گرد اڑتی دکھائی دیتی ہے لوگ اپنے اپنے خیموں سے باہر آکر صف بستہ ہوجاتے ہیں۔ ایک۔ سواری مبارک واپس ہورہی ہے دوسرا شکار خوب ہوا ہوگا۔

(اس عرصہ میں بادشاہ کیمپ میں پہنچ جاتا ہے درباری مجرا بجالاتے ہیں۔ فردوسی آگے بڑھکر مجرا عرض کرتا ہے۔

بادشاہ۔ بیکاری میں شکار دلچسپ مشغلہ ہے۔

فردوسی۔ ظل اللہ۔ بدن میں۔ پھرتی طبیعت میں چستی پیدا ہوتی ہے۔

ایاز۔ عالم پناہ۔ کا ہر تیر جو کمان سے نکلتا ہے وہ قضائے مبرم کا حکم رکھتا ہے۔

ایک درباری۔ ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد۔

محمود۔ ہنستے ہوئے) ما بدولت کے بزرگ آہو کش نہ تھے۔

درباری (گردن جھکاکر) شاہنشاہ محمود۔ ہرن پر تیر چلاتا گویا معصومیت کے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔

(بادشاہ اپنے خیمہ میں جاتا ہے اور فردوسی اپنے مقام پر واپس آتا ہے۔

اٹھارواں منظر

(رات کا وقت ہے فردوسی اپنے خیمہ میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہے چراغ روشن ہے۔ آنکھوں میں نیند کا غلبہ مگر پھر بھی لکھا چلا جاتا ہے۔

فردوسی (گردن اٹھاکر) اب مکمل ہوکر رہا جسکو دنیا کبھی فراموش نہ کرسکے گی ایک مغرورانہ ادا کے ساتھ۔

منم کردہ ام رستم داستان
وگرنہ یلے بود در سیستان

(ٹہلتا ہوا ٹہر ٹہر کر یہی شعر دہراتا ہے اور کاغذ آنکھوں پر رکھکر سوجاتا ہے۔

فردوسی۔ (عالم خواب میں) آپ ہوتے کون ہیں۔

جو یائیمہ شاہجہان لاوری تشریف لائے ہیں۔
مجھے آپ جانتے نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ
آپکے احسانات کا کچھ معاوضہ پیش کروں۔

فردوسی۔ کیسا احسان۔ اور کیسا معاوضہ۔
حقیقت یہ ہے کہ میں عالم گمنامی میں پڑا
ہوا تھا اور آپ نے مجھے شہرت عام اور
بقائے دوام کی زندگی عطا کی ہے۔

فردوسی۔ معاف کیجئے اس سے پہلے مجھے آپکو
دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ سچ ہے لیکن
رستم کا نام تو آپ نے ضرور سنا ہوگا۔

فردوسی۔ کیا آپ ہی رستم ہیں۔

رستم۔ جی ہاں۔ اس گمنام ہستی کو رستم
کہتے ہیں۔

فردوسی۔ خوشی سے لپٹ جاتا ہے)

رستم۔ رستم میں کتنا خوش قسمت ہوں
کہ آپکو دیکھ لیا جس کے تخیل میں آپ تے
اور جاتے رہے ہیں۔

رستم۔ میں اسی لئے حاضر ہوا ہوں کہ عجم
کے فراموش کردہ تاریخ میں آپ نے مجھے
پھر ایکبار زندہ کردیا اور یہ زندگی نہیں
بلکہ حیات جاوید ہے آنے والی نسلیں ہمیشہ
مجھے آپکے بدولت یاد رکھینگی حرارت
اور مردانگی اون کے دلوں میں پیدا ہوگی۔
آپکا اس کاوش اور دماغ سوزی کا ایک
حقیر مخلصانہ تحفہ آپکی خدمت میں پیش کرنا
چاہتا ہوں وہ دیکھئے آپ کے خیمہ سے
جانب شمال جو تناور درخت دکھائی دیرہا
اوسکو وہاں کھودئے آپکو ایک خزانہ ملیگا
جو قدرت نے شاید میرے ہاتھوں آپکیلئے
مقرر کیا ہے۔ اب میں زیادہ ٹھیر نہیں سکتا۔
مجھے اجازت دیجئے۔ (یہ کہکر رستم روانہ
ہوتا ہے)

فردوسی۔ (خواب سے رستم ٹھہرو ٹھہر کہتا ہوا
بیدار ہوتا ہے)
میں نے کیا دیکھا۔ درحقیقت میرا کردار
زندہ موجود ہے تو گویا میری کاوشیں دنیا
میں چاند سورج بنکر چمکیں گی۔ اور انہیں کبھی
زوال نہ ہوگا۔

زبیدہ۔ خیر تو ہے آپ رستم رستم کہکر
کس کو آواز دے رہے ہیں۔

فردوسی۔ (آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے)
کیا میرا خواب حقیقت کا سرمایہ دار ہے
کیا رستم زندہ ہوچکا ہے۔ پھر یہ تھا کون

زبیدہ۔ یہ آپ کیسے بہکی بہکی باتیں کررہے ہیں
بتلائے تاکہ رستم کہاں ہے۔ اچھا تو آپ شاید
اچانک بیدار ہوئے ہیں۔

اجہ ما ہیں بہت فرق ہے۔

محمود۔ دریا سیرابی کے موقعہ پر درخت اور پودوں میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اوس کا فیض سب پودوں کے ساتھ مساوی جاری رہیگا۔

وزیر۔ درخت اس فیضان عام سے بار آور ہوگا لیکن پودے مرجھا کر فنا ہو جائے گے۔

محمود۔ دنیا عہد شکنی کا الزام لگائے گی۔

وزیر۔ معترض کو کسی پہلو جیتے نہیں۔

محمود۔ جہاں تک ہمیں اپنے وعدہ کی پابندی کرنی چاہیے۔

وزیر۔ وعدہ تو آپ کا ایفا ہو چکا ہے۔

محمود۔ کسطرح۔

وزیر۔ عالیجاہ ساٹھ ہزار اشرفیاں اگر روپیوں سے بدل دی جائیں تو عہد شکنی کیونکر ہوگی۔

محمود۔ (کسیقدر سوچکر) ہمیں منظور ہے۔

وزیر۔ (آداب بجالاکر) عزت افزائی۔

بیسواں منظر

(دربار عام)

امرا۔ فضلا۔ علما۔ و ایاز بھی اپنی جگہ ایستادہ ہیں۔ محمود تخت پر بیٹھا ہوا ہے بائیں جانب ایاز کھڑا ہوا ہے۔ چوبدار جا بجا کھڑے ہوئے ہیں سب کی آنکھیں فردوسی کی منتظر ہیں۔)

چوبدار۔ ہائے بلند مرتبت۔ قمر شوکت۔ فردوسی امیدوار باریابی۔

دربار بادشاہ میں ہل چل پیدا ہو جاتی ہے فردوسی شادان اور فرحان تخت شاہی کے پاس پہونچکر مجرا بجالاتا اور رفاقتانہ انداز میں

فردوسی۔ علم پرور۔ میری دماغ سوزی کا نتیجہ بارگاہ کیوان منزلت میں پیش ہے۔

فردوسی۔ دونوں ہاتھوں پر شاہنامہ لیکر بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا ہے۔

محمود (نہایت خندہ پیشانی سے اہل دربار کی طرف اشارہ کرکے) یہ بھی تو سننے کے مشتاق ہیں۔

فردوسی۔ (مسرورانہ انداز سے) جو حکم ذیل کے اشعار:-

بشمشیر ہندی بر آویختند۔ ہمی ز آہن آتش فرو ریختند

گرفتند از آں پس عمود گراں۔ ہمی کوفتند آں بجنگ آوراں

زرہ بر نہادند سر و کماں۔ یکے سال خود دیگر قصاب

غمین شد دل ہر دو از یکدگر۔ گرفتند ہر دو دوال کمر

(پردہ پر حسب ذیل منظر دکھائی دیتا ہے۔ دریا جیحوں کے کنارے ایک دو منزلے مکان کے مقابلہ میں خیمے نصب ہیں اور ایک میدان میں دو پہلوان تیر و کمان نیزہ و تلوار لئے ہوئے ایک دوسرے کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے ہیں اور فوج کے سپاہی دونوں کی لڑائی دیکھنے میں محو ہیں۔

رستم - اب بھی باز آ - اور کھیل کود میں اپنے دن گنوا -

سہراب - بڑے میاں آپکی زندگی ہی کتنی ہے جائیے خیمہ میں آرام فرمائیے -

رستم - جس کے منہ سے دودھ کی بو نکلتی ہو لاف و گزاف -

سہراب - افسوس ہوتا ہے کہ ایک ضعیف پر وار کروں -

رستم - مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے کہ ایک لڑکے پر ہاتھ اٹھاؤں -

سہراب - دم خم ہے تو آئے اور یہ بھی کر دیکھیے

رستم - بچہ جب ہٹ کرتا ہے تو گوشمالی سے راہ راست پر آ جاتا ہے -

سہراب - ضعیف جب بگڑتا ہے تو اپنے فوج کھاتا ہے -

رستم - دیکھ مالک ہٹ چھوڑ دے -

سہراب - عقل سے اتنی بیگانگی اچھی نہیں -

رستم - دیکھ اتنا تنگ نہ کر -

سہراب - کہتا ہوں کہ جنگ نہ کر -

سہراب - اس کے ساتھ ہی رستم پر حملہ آور ہوتا ہے رستم حملہ کی مدافعت کرتا ہے دونوں میں بڑی دیر تک تلوار کے جوڑ توڑ ہوتے ہیں لیکن کوئی بھی پست نہیں ہوتا - غرض مختلف داؤ پیچ ہوتے ہیں آخر دونوں تیر و کمان پشت سے نکال کر رکھ دیتے ہیں اور گتکا و بنوٹ بھی شروع ہو جاتی ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں پھر کشتی کے داؤ پیچ شروع ہو جاتے ہیں دیر تک دونوں نہایت پھرتی سے ایک دوسرے سے لپٹ پڑتے ہیں اور سہراب رستم کو نیچے لاتا ہے اور رستم غصہ میں وہیں داؤ کرتا ہے اور سہراب نیچے آ رہتا ہے اور عالم غضب میں رستم سہراب کے سینہ میں اپنا خنجر گھونپ دیتا ہے - اور سہراب آہ کر کے رہ جاتا ہے اور فوجیں پریشان ہو کر دونوں کے گرد جمع ہو جاتی ہیں -

سہراب - آہ آپکا داؤ چل گیا - مگر یاد رکھئے جب میرے باپ کو اس کی خبر ہوگی تو زندہ نہ چھوڑیگا -

رستم - تیرا باپ -

سہراب - ہاں میرا باپ -

رستم - آہ اس کا نام و نشان - سہراب رس . . . . . تم -

(باقی آئندہ)

ٹوٹے ہوئے ستارے

(۱) بے شک آپکا نام رجسٹر شہاب میں اسی طرح ہے جیسا کہ فلک پر تارے اور زمین پر پھول لیکن کوئی حقیقی مصرف نہ ہو تو ان کا وجود محض بے کار ہے۔ آپکو شاید دعوے ادبیت ہو تو ہو لیکن ہمارا اپنا خیال ہے کہ کہیں قلم فرسودہ نہ ہو گیا ہو اور خیالات میں وہ اگلی سی بلند پروازیاں بھی نہ ہونگی۔ ورنہ لکھنے والے کا قلم کبھی نچلا نہیں رہ سکتا۔ اگر کچھ بھی حیات ادبیانہ ہے تو نوا پرواز ہو جائیے تا پھر اس بزم میں اس وقت کلیم عرض کرینگے :— وہی تم ہو نہ پھر وہی کشتی۔ وہی صبح و شام کی سرخوشی۔ وہی جلوہ علیا نام ہو۔ کہ حرف فسانہ تمام ہو

(۲) کیا خوب فرمایا۔ امتحان قریب ہے۔ دنیا بھر کا پڑھنا ہے۔ اور پڑھائی میں خاک دل نہیں لگتا۔ کمرہ بند کرکے آدھ گھنٹہ مشکل سے پڑھتی ہونگی کہ کسیکی ہنسی کی آواز سنائی دیتی ہے اور یہاں پہنچی کہ جانے کونسا پر لطف لطیفہ ہوا ہے۔ نہ سنا تو رہ جائیگا۔ کتابیں پٹک کر دروازہ کھولکر باہر نکلی ادھر ادھر کی باتیں بنائیں پھر پڑھنے بیٹھی تو ذرا بھوک لگی کچھ کھانے کو جی چاہا۔ جلدی جلدی کمرے سے نکلی نظر دوڑائی اماں کو مصروف دیکھکر چپکے چپکے الماری سے کچھ بیل چرائے اور کمرہ کا دروازہ بند کر لیا۔ پھر خیال ہوا ارے ذرا یاد ہوگئے گھر کی لڑکی سے کچھ باتیں نہیں ہوئیں اس لئے جب آمدہ میں کھڑی ہو کر انہیں آواز دی تھوڑی دیر غپ شپ رہی۔ پھر کمرہ میں مقید ہوئی۔

یہ پڑھنا ہوا بالکل ایک مصیبت۔ آتا سب کچھ تو پڑھنا ہے مگر نہ جانے ابھی زمانہ میں کے پہیلیاں کہلاتے نکال آئی ہیں کہ صبح سے شام تک ایک ایک سطر و بد اخلاقی پڑتی نہیں جاتی۔ چپ چاپ بیٹھکر باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ میری بیماری تو دیکھکر مہربان سوال کرتی ہیں کہ بعض خاموش ہو ہم امتحان کا کیا ارادہ ہے کیا پڑھنے کیلئے براہ کرم اسکی مضمون سمجھکر جواب دیجئے نا۔ آخر مضمون یوں ہی تو لکھا جاتا ہے۔

روزنامچہ

سید مسعود علی عابدی (لندن)

۱۶ر نومبر شنبہ۔ والد محترم کی دعاؤں اور عزیزوں کی ہمدردیوں کو ساتھ لے کر جہاز پہ سوار ہوا کیونکہ مجھے پانچ سال یورپ میں بسر کرنا ہے۔

جہاز نے سیٹی دی اور بمبئی بندرگاہ سے نکلا۔ دریا ہے دریائے بے پایاں۔ دریں طوفان موج افزا ۱۲ بجے لنچ کھایا اور کیبن میں چھپا ہوا گھر کی یاد کو فراموش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے کیبن میں آٹھ مسافر ہیں جو تمام ہندوستانی ہیں البتہ ایک حیدرآبادی طالب علم مسٹر مرتضیٰ علی خاں ہیں۔ کیلیفورنیا نام وہ ہے جس جہاز میں میں سفر کر رہا ہوں اور اس کا وزن بائیس ہزار ٹن ہے۔ جس میں تین انجن ہیں اور ہر ایک انجن کی قوت (۳۶۰۰) اسپی ہے۔

آٹھ بجے ناشتہ کیا دریافت سے معلوم ہوا کہ ہمارا جہاز ممباسہ کی طرف جا رہا ہے۔ اس وقت ہم بمبئی سے (۵۵۲۵) میل دور ہیں۔ ہمیں ممباسہ سے اطالوی اسیران جنگ کو سوار کر کے انہیں نیپلز پر اتارنا تھا۔

میں سمندر کے مناظر دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ لنچ کی گھنٹی بھی سنائی نہیں دی تا وقتیکہ میرے ساتھی نے مجھے بیدار نہ کیا۔

غذا اچھی نہ تھی یوں بھی ہم ہندوستانیوں کو مغربی غذا اچھی نہیں معلوم ہوتی جو کچھ

پیشکی ہوتی ہے کیونکہ ہمیں چار بجے چھٹا سے وار ۔

کچھ دیر بیٹھ گیا اور چار بجے جا بیٹھکر سمندر کی پہنائے اور اوس کے دلچسپ مناظر دیکھتے ہیں مصروف رہا جہاز پر سوائے پڑھنے اور ٹہلنے کے کوئی کام نہ تھا آج پہلی مرتبہ اڑنے والی مچھلی دیکھی ۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر گیارہ بجے (EEP سالامی) کا ٹکٹ ایک شلنگ میں خریدا ۔ آپ سوال کرینگے سو یپ کیا بلا ہے ؟ ۔

مسافروں کی دلچسپی اور اوقات کے خوشگوار گذارنے کے لئے جہاز کی جانب سے ایسے ٹکٹ تقسیم ہوتے ہیں کہ جہاز چوبیس گھنٹہ میں جس قدر فاصلہ طے کرتا ہے اوس کی نسبت قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں ۔

اس معاملہ میں کپتان بھی اپنا اندازہ بتاتا ہے اس کے بعد بارہ بجے انجنیر کی جانب سے صحیح فاصلہ کا اعلان کیا جاتا ہے جس کا اندازہ صحیح ہوتا ہے اوس کو انعام دیا جاتا ہے ۔ لطف دیکھئے کہ کپتان کا اندازہ (۳۱۴) میل تھا اور اس عاجز کا (۳۲۵) چنانچہ میرا قیاس صحیح ثابت ہوا اور میرے چار ساتھیوں کو بھی ۴۵ شلنگ ملے ۔

اس دوران میں بھی گہر کی یاد ستاتی رہی لیکن "صبر کرنے سے بنیگی غالب" پر عمل جاری ہے چونکہ آج گرمی زیادہ تھی اسلئے ڈنر کے بعد بڑی دیر تک چہل قدمی کرتا رہا شب کے کوئی بارہ بجے ہو گیا ۔ چونکہ گرمی شدت کی تھی اسلئے علی الصباح حمام کر کے ناشتہ نہ کیا اور کل کا انعام پیر ترغیب دلا رہا تھا اس لیے آج بھی دو ٹکٹ خریدے اور ایک پونڈ حاصل کئے ۔

آج ایک انگریز سے ملاقات ہوئی جو میری طرح ٹائمنگ انجنیر ہیں وہ حکومت پنجاب کے چیف منیگ انجنیر تھے پنجاب گورنمنٹ سے چند اختلافات کی وجہ استعفی دیکر اپنے وطن واپس ہو رہے ہیں ۔ اختلاف صرف اسقدر تھا کہ ایک غیر فنی عہدہ دار اعلی نے انکی اسکیم پر تنقید کی تھی اور انھیں یہ پسند نہ تھا کہ ایک ناواقف ایک واقف فن کی تکذیب کرے اس لئے ان کی خودداری اور قابلیت نے اسکو گوارا نہ کیا اور وہ استعفی دیکر اپنا وقار برقرار رکھنا چاہتے تھے کاش ہم میں بھی اپنے آپکو سمجھنے کا مادہ پیدا ہو ۔

یہ انجینیر نہایت خوش اخلاق اور ہمدرد ہیں۔ یورپ کی معاشرت اور وہاں کے حالات سے
مجھے واقف کرایا اور خاص طور پر نصیحت کی کہ جب سرزمین یورپ پر قدم رکھو تو دو چیزوں سے
کوسوں دور رہنا نمبر ۱ = WOMEN - ۲ WINE کتنی اچھی اور مختصر نصیحت ہے۔
مغربی تہذیب کے نقائص پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہاں کی عورتیں اپنی آزادی کا
ناجائز فائدہ اٹھا کر مردوں کو بیوقوف بنا رہی ہیں گفتگو نہایت دلچسپ ہو رہی تھی کہ لنچ
کی گھنٹی نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا۔

چونکہ آج شام ایک لیکچر دکھایا جانیوالا تھا اسلئے ڈنر کے بعد ہم عرشہ پر پہنچ گئے
اس لیکچر میں سمندری معلومات بہم پہونچانیکی کوشش کی گئی تھی کوئی دس بجے واپس ہو کر
سو رہے۔

ناشتہ کے بعد کینٹین سے کچھ چاکلیٹ خریدے اور سویپ کا ٹکٹ خریدا گیا مگر آج
کامیابی نہوئی البتہ ایک شخص کا اندازہ صحیح نکلا اسلئے انہیں پانچ پونڈ دئے گئے۔ کیونکہ آج
جہاز نے صرف (۴۰۷) میل چوبیس گھنٹوں میں طے کئے ہیں۔

لنچ کے بعد کچھ دیر آرام لے کر چار بجے چاء پی اور بقیہ وقت مطالعہ میں گذرا۔

آج ڈنر کے بعد ریس ہونے والی تھی جہاز میں لکڑی کے گھوڑے دوڑائے جاتے
جاتے ہیں اور ان پر نمبر پڑے ہوتے ہیں اور پانسہ پھینکا جاتا ہے اور جو نمبر آتا ہے اوسی
نمبر کے گھوڑے کو آگے بڑھایا جاتا ہے اور سب سے پہلے اور سب سے آخر نمبر والے گھوڑے
کو انعام کا مستحق قرار دیا جاتا ہے اور نمبر اول و دوم کو بھی۔ چونکہ یہ اوقات گذاری کا
ایک مشغلہ تھا۔ پہلی ریس میں تیسری ہار رہی اور بقیہ پانچ شرطوں میں کامیاب رہا اس
طرح مجموعی حیثیت سے بعد اخراجات ٹکٹ ایک پونڈ کا نفع رہا۔ رات نیند اچھی آئی۔

آج پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ سے پتلون کو استری کرنی پڑی تمام دن مصروفیت میں بسر ہوا۔ آج
چار شلنگ جیتے۔ صبح چھ بجے ہم ممباسہ پہونچے اس عرصہ میں سمندر کے نیلے پانی کو دیکھتے
دیکھتے آنکھیں اکتا گئی تھیں خشکی کے نظر آنے سے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جہاز کے
مشین بند کر دئے گئے ہم عرشہ پر کھڑے مناظر کی دلچسپی میں مصروف تھے تھوڑے دیر بعد

رادھا کے نام

نور جہاں بی۔ اے عثمانیہ

خط ہے یہ یا مجموعہ خار و گل کا۔ کہیں مسکراتی ہو۔ کہیں غصہ آتا ہے تو کہیں رونے لگتی ہو
کبھی تم مجھے آسمانوں پر لئے جاتی ہو اور پھر خود ہی ایک دم سے زمین پر پٹخ دیتی ہو۔ کبھی میرے
آنسو پونچھتے ہوئے خود بھی رونے لگتی ہو پھر جلدی سنبھل جاتی ہو اور میرا مذاق اڑانے لگتی ہو
کبھی اپنا دامن میری طرف بڑھا دیتی ہو تو کبھی ایک دم میرے ہاتھوں سے دامن گھسیٹ کر
آگے بڑھ جاتی ہو۔ کبھی میرا بھیگا ہوا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہو اور محبت سے میرے بکھرے بالوں کو
سنوارنے لگتی ہو۔ پھر خود ہی زمین پر گرا کر تڑپتا ہوا چھوڑ جاتی ہو۔ آخر یہ سب کیوں۔ مانا کہ
یہ فریب تخیل ہے لیکن کاش یہ حقیقت بن جائے تم اپنی دوست کے اتنی ہی قریب آجاؤ
جتنے قریب کے ہم رہ چکے ہیں۔

رادھا۔ سوچو کتنا عرصہ ہوا ہم کو اکٹھے مل بیٹھے ہوئے۔ کتنے دن ہوئے ساتھ سیر
نہیں کی کتنی مدت ہوئی ہمارے قہقہوں کی آمیزش نہیں۔ کتنا زمانہ ہوا ہم نے ایک
دوسرے کی صورت تک نہیں دیکھی۔ یہ ہم جانتے تھے کہ گردش دوراں ہم کو اتنا دور اسقدر
دور کر دے گا کہ ہم جانتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب نہ آسکینگے۔ اس بے کیفی اور
جدائی سے اکتا کر ہم کبھی یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں رادھا کے ہم وہ سب کچھ بھول گئے۔ ماضی
جیسے اب ہمیں بالکل یاد نہیں۔ مجاز کہتا ہے۔ گیا

کیا تجھکو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے — وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

مجاز۔ اسی مضمون کو ایک اور جگہ بیان کرتا ہے تم بھی پڑھ کر دیکھو کتنی بے ساختگی اور کیسی تڑپ ہے اس میں:—

"اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو ہم لطف بہاراں بھول گئے"

یہ چند دن بڑی بے لطفی میں گذرے۔ نہ تم آئیں نہ کمی اور کرم فرمانے پوچھا ان چھٹیوں میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ چند ہی پسند آئیں۔ افسانوں اور ناولوں سے تو اب جی گھبرانے لگتا ہے جانے کیا بات ہے۔ کسی سے چل گئی اسی بات پر کہ افسانے اور ناول اب میرے ذوق کو تسکین نہیں پہنچا سکتے"۔ وہ کرم فرما کہنے لگے کہ "پھر تو رومانی افسانے جو لکھتی ہیں آپ تو اس طرح آپ کو خود سے بھی نفرت ہو جانا چاہیے۔ اس لئے کہ آپ خود اپنے لئے تسکین کا سامان نہیں"

ان سے بحث ہو گئی کہ افسانے لکھتی ہی کب تھی یا کب لکھتی ہوں اور اگر کبھی ایسی حرکت کی بھی ہے تو وہ صرف دوسروں کے ذوق کی تسکین کی خاطر انسان دوسروں کے لئے جیتا ہے نا بس وہی سمجھئے اور وہ کرم فرما ہیں تو بڑے سرکش اور مغرور پیر بابا۔ ہر بات تھی مرلی مانگ کر چپ ہو رہے اور مجھے ایک بیک رحم آ گیا ان پر ان چند دنوں میں بکھر گیا۔ دنوں کو سمیٹنے کی کس کس طرح ناکام کوشش کی گئی۔ سنکر تم سنکر کیا کرو گی قسمت کے خلاف کتنی بار جنگ کرنی پڑی تمہیں اس سے کیا۔ کبھی محسوس ہوتا تھا جیسے اب جیت ہی ہو گی کبھی معلوم ہوتا جیسے اب ہمیشہ ہار رہی ہوا کرے گی اسی قسمت کے ساتھ اتنی بازیاں لگائی ہیں ہم نے اور اس میں متواتر ہارتے ہی جانے سے کچھ ایسے دل برداشتہ ہو گئے ہیں کہ جی چاہتا ہے سکون و مسرت کا ایک ہی لمحہ نہیں تو میسر آ جائے! اور ہم بعض وقت یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دنیا ایک تماشہ گاہ ہے جہاں ہم بھی اوروں کی طرح تماشہ بنا کر بھیجوائے گئے ہیں۔ یہاں کا خلوص یہاں کی محبت یہاں کے رسم و رواج بہت جھوٹے اور نہایت ہی نکمے ہیں۔ اب ہمارے ہی دوستوں کے خلوص و محبت کو دیکھو تو حیرت ہوتی ہے۔ یہی ہیں وہ دوست جو ہمارے لئے آنکھیں بچھاتے تھے کبھی اور آج وہی ایسے جو مڑ کر خبر تک نہیں لیتے۔ مگر ہم شکوہ کسی سے نہ کرتے ہیں نہ کرینگے۔

نکلتے ہیں دنیا میں لوگ محبت بھیک کرتے ہیں اور محبت کرتے دیکھا بھی ہے ... کہ ہم تو ... سے راز

واقف نہیں البتہ اتنا جانتے ہیں کہ ہر ایک محبت نہیں کر سکتا یہ آرٹ بھی صرف چند ان ہستیوں کیلئے
مخصوص ہے جو واقعی انسان ہیں اور جن کے حقیقت میں دل ہے بس وہی محبت کرنے یا اسے
سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ آج کل جس سے سنو محبت کی کہانی سنتا ہے سینما جاؤ وہی محبت
گانے سنو وہی محبت افسانے یا ناول پڑھو "محبت" موجود ہے وہاں بھی اور اب ہمیں اس کے نام سے
ہی اتنی کچھ بیزاری اور وحشت سی طاری ہونے لگی ہے کہ جی چاہتا ہے اس کا نام لینے والوں کا
منہ نوچ لیں ان سے لڑ پڑیں جھگڑ لیں جانے کیا کیا کریں۔ اور یہ سب کس لئے۔ تم
جانتی ہو کس لئے اس لئے کہ......

"آگہی کے فیض سے سادہ دلی جاتی رہی ہے ہر فریب آرزو کی دلکشی جاتی رہی"

محبت کا نباہ اس خود غرض اور مطلبی دنیا میں ممکن نہیں۔ محبت کیا ہے؟ یہ آسمانوں سے زیادہ
بلند ہے۔ ستاروں سے زیادہ روشن اور مقدس ہے اس میں چاند کا حسن و نزاکت ہے
اس میں آبشاروں کا سا ترنم ہے۔ اس میں گل کی مہک ہے۔ یہ پھول کی طرح شوخ اور جوان ہے،
یہ کبھی ہٹ نہیں سکتی روح میں سما جاتی ہے تو پھر جاتی نہیں کبھی شعلوں کی طرح لپک کر بڑھتی اور
دلوں کو جھلسا دیتی ہے پھر یہی ان ناسوروں کے لئے۔ آب حیات بن جاتی ہے۔ مسیحا بن جاتی ہے
اس کے شعلوں میں جلتے ہوئے کسی نے دیکھا ہے کسی کو؟ اور پھر اس کی چارہ گری سے کوئی واقف ہے
اگر درد ہے تو درماں بھی ہے۔ سوزش ہے تو ٹھنڈک بھی ہے۔ ایک ایسا درد جس کی ایک خلش پہ
زندگی کی ساری مسرتیں قربان ہیں۔ اگر محبت کو زندگی سے الگ کر دیا جائے تو زندگی بے جان
اور پھیکی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی انسان میں ایک حسین روح کو جنم دیتی ہے اگر دلوں کے لئے
یہ تخریب ہے تو تعمیر بھی یہی ہے۔ وہ انسان مکمل انسان ہرگز نہیں جس نے محبت کی ایک بھی
ضرب نہ کھائی ہو۔ جیسے ایک بھی شکست نہ ہوئی ہو وہ فاتح ہرگز نہیں۔ لوگ ہمارے ان
خیالات پر ہمیں پاگل اور جنونی نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ مگر ہم پروا نہیں کرتے سوچنے سے آدمی
پاگل ضرور ہو جاتا ہے ہم پر بھی یہی خبط سوار ہے اور سوچتے سوچتے جس ڈور کو سلجھانے کا عزم
کرتے ہیں وہ اور الجھتی ہی جاتی ہے اور بالآخر اس کے دونوں سرے خدا جانے کونسی بے نام
و نشان ظلمتوں میں گم ہو جاتے ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا یہ سرا کہاں تھا وہ سرا کہاں گیا ہے۔

ہم نے دیکھا ہے تمہاری نسرین کو بتائیں کیا حال ہے۔ لو سنو۔۔۔۔

"ہم نے دیکھی ہے ادا کل تیرے دیوانوں کی"
"دھجیاں کچھ لئے بیٹھے تھے گریبانوں کی"

رہا سنا ہے عید آنے والی ہے۔ کیسی موتی ہے عید کیا ہوتا ہے اس میں وہی گھر ہوتا ہے وہی لوگ ہوتے ہیں وہی دن ہوتا ہے وہی سورج ہر روز کی طرح کرنیں بکھیرتا ہے وہی ہوائیں روز کی طرح مستانہ وار چلتی ہیں وہی شام ہوتی ہے وہی صبح ہوتی ہے۔ پھر کونسی نئی بات ہوتی ہے کہ لوگ کہتے ہیں یہ عید ہے نوید ہے شادمانی ہے دہمارے ہئے تو وہی عالم بے کیفی ہوتا ہے جو مدتوں سے چلا آرہا ہے لوگ خوش ہوتے ہیں کہ عید ہے گلے ملتے ہیں مبارکباد دیتے ہیں خوشبو سے بسا لیتے ہیں خود کو ہم بھی ان سب جیسی حرکتیں کرتے ہیں پاگلوں کی دنیا میں رہکر ہوشمندی کی ایک ہی حرکت کرنے کے یہ معنی کہ ہم مجرم قرار دے جا کر کسی سخت ترین سزا کے مستحق سمجھے جائیں اس لئے ہم بھی پاگلوں جیسے ہی بن جاتے ہیں۔ ورنہ اصل پوچھو تو عید کا مفہوم ہی کچھ اور ہے۔ جانے کتنے گھر ایسے ہیں کتنے لوگ ایسے ہیں جو عید کو دروازے ہی سے لوٹا دیتے ہیں کہ جاؤ ہمارے یہاں عید نہیں آئی۔ دیکھیں ہمارے یہاں بھی اب کے برس عید واقعی عید بن کر آتی ہے یا نہیں۔ اگر نہ آسے وہ سچی عید بنکر تو ہم اسے گھر سے تو نہیں البتہ اپنے گھر سے لوٹا دینگے۔ عید کی سچی خوشی اپنے دوستوں کی ہمنشینوں کی دید ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں جب وہی نہ مل سکے کسی کو تو پھر کیسی عید اور کہاں کی عید۔ تمہارے مقاصد کی تکمیل اور تمہاری مسرتوں کے لئے بہترین دعائیں۔ ویسے تو ہماری "ہر دعا عرش پہ جا جا کے پلٹ آتی ہے" "رب العزت کا حکم ہوتا ہے" "پھر آنا" اور یہ پھر آنا وہی جانتے ہیں کب پورا ہوگا۔

تمہاری اپنی

نسرین

نوٹ: اس وقت یہ چندہ ادا کرنے کی نسبت کتنے بار آپکو توجہ دلائی جائے۔ براہ کرم غور کیجئے۔

دنیا

مہر

جب دھرتی کے باسی میٹھی نیند سو جاتے ہیں۔ ان کے دکھی جیون کی چند گھڑیاں سکھ میں گزرتی ہیں میٹھے اور سنہرے سپنوں میں سمے بیتتا ہے ایسے وقت میری بوجھل آنکھیں نیند کو اپنا نہیں سکتیں۔ میں اپنے بچھونے پر لیٹی ہوئی خلا میں نظریں جمائے رہتی ہوں۔ میرا تخیل دور۔ کہیں دور۔ اس دیس اور دھرتی سے پرے پہونچتا ہے میں آکاش پر آنکھ مچولی کھیلنے والے ننھے ننھے ستاروں میں کچھ پانے کی کوشش کرتی ہوں اور ان کی محفل میں مسکراتے ہوئے چندرما کو گھورتی ہوں۔ معصوم دنیا کے ننھے باسی! کتنا حسین ہے ان کا جیون!"

وہ مجھے اشاروں اشاروں میں کچھ کہہ جاتے ہیں۔

مجھے اپنی محفل میں بلاتے ہیں۔ مجھ سے ایسی سبھا میں شرکت کے لئے کہتے ہیں۔ ...

چند اسکراہٹیں ان کی تائید کرتا ہے اور میں کہتی ہوں۔

ننھے ستارو۔ کیا تمہارا دیس بھی اس دھرتی کی طرح ہے!" کیا وہاں بھی آئے دن اسی طرح کی بے چینیاں۔ پریشانیاں۔ الجھنیں اور کشمکش رہتی ہے۔ کیا تمہاری نگری بھی ایسے ہی خونی ہے۔ کیا وہاں بھی انسان نما درندے بستے ہیں ... ؟ کیا تمہارے پاس کسی کمتر اور ہیچ صنف کا نام "انسانیت" ہے کیا تمہاری نگری میں بھی ایسے ہی مظالم ہوتے ہیں جن کا شکار اس دیس کا تقریباً ہر باسی ہے۔ ؟

مگر جب ننھے تارے خفا ہو کر ان باتوں کی مخالفت کرتے ہیں تو جی چاہتا ہے۔ اے کاش میں بھی اسی بستی میں پہونچ جاؤں۔ اس دھرتی سے دور۔ یہاں کے باسیوں سے بے نیاز ہو کر اکاش کی بلندیوں میں سما جاؤں۔

اس دنیا کو ٹھکرا دوں۔ یہاں کے خونی اور ظالم سماج سے منھ موڑ لوں۔ انسانیت نما حیوانیت سے دور چلی جاؤں۔

اس نگری میں کوئی غم آشنا نہیں۔ کوئی ہمدرد نہیں۔ کوئی دوست نہیں۔ کوئی مونس و غم خوار نہیں۔ یہاں انسانیت انسانوں کے گلوں پہ کند چھری پھیرتی ہے اور شیطان کھڑے قہقہے لگاتا ہے۔ ہزاروں ہی معصوم بے گناہ موت کے ظالم دیوتا کے بھینٹ چڑھتے ہیں اور اس کی ہوس دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ وہ منھ پھاڑے دیوانہ وار بڑھتا ہی چلا آتا ہے۔

آخر ان مظالم کے برداشت کی انتہا کہاں تک معبود۔؟

انکار و غم کے تندحوادث کے واسطے
اتنا لطیف دل میرے پروردگار کیوں

اس نگرانی میں اس طرح کی تکالیف نہیں۔ جسمانی مصیبتیں۔ روحانی۔ ذہنی۔ الجھنیں وہ حسین بستی ہے اور اس کے ننھے باسی فکروں سے بے نیاز؟ کتنا سکھی جیون ہے ان کا!—

اس دنیا کے تصور سے میرے من کے تار بجنے لگتے ہیں۔ میں خوشی سے دیوانی ہو جاتی ہوں مگر آہ! میری کمزوریاں میرا مذاق اڑانے لگتی ہیں میری خوشیوں پہ اوس سی پڑ جاتی ہے

شوق پرواز دبے پر ہی اپنی
ہے میرے پیچ و تاب کی دنیا

امتحان

سعادت رضوی

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ انسان جیسے جیسے ترقی کرتا جاتا ہے اس کی لیاقت معراجِ کمال کو پہنچتی جاتی ہے۔ خیالات بلند ہوتے ہیں معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لیکن آپ کو سنکر بڑی حیرت ہوگی کہ جیسے ہی میں نے "انٹر" میں قدم رکھا نو دفیصدی لیاقت گھٹ گئی۔ ایک زمانہ تھا کہ ففتھ فارم میں ڈھونڈنے سے غلطیوں کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ کیا مجال کو جو کبھی گرامر کی غلطی ہو۔ جملوں کی بندش الفاظ کی موزونیت خیالات کی روانی وغیرہ سمجھ لیجئے کہ انگلش پر تبحر حاصل ہوچکا ہے۔ اکثر اوقات کلاس میں دوسری لڑکیوں کی کاپیوں پر جب نظر پڑتی FAIR GOOD دیکھکر رشک کا سیلاب رواں ہوجاتا اور ہم کو یہ فکر رہی کہ میں بھی اس خطاب "نیز وال" سے محروم نہ رہوں لیکن اُف! کس قدر حقیقت سے دور تھی وہ لیاقت! کیا تھرڈ فارم۔ ففتھ فارم کی لڑکی میں اتنی قابلیت پیدا ہوسکتی ہے ہرگز نہیں۔

ٹیچرس کو کبھی بھول کر یہ خیال بھی نہ ہوا کہ یہ لیاقت اور بے بنیاد لیاقت کا انجام کیا ہوگا۔ انہیں تو صرف FAIR GOOD دینے کی زحمت گوارا کرنی پڑتی۔ افسوس اس فریبی لفظ نے میری مٹی پلید کردی۔

میری عادت تھی بلکہ دماغ میں یہ ہوا سما گئی تھی کہ صرف انگلش کے بڑے بڑے الفاظ

استعمال کروں۔ جب اسکول سے گھر آتی تو نعت لیکر سب سے موٹے الفاظ استعمال کرنے کی فکر دامنگیر رہتی۔ چاہے وہ موزونیت رکھتے ہوں یا نہیں۔ اس طرح موٹے موٹے الفاظ ٹھوس کر یا کسی گریجویٹ سے بہترین مضمون لکھوا کر حفظ کر لیتا میرے لئے معمولی بات تھی۔ اور یہ تیار نوالے ایسے مزیدار ہوتے کے بغیر پانی کے ہضم کر لینا مشکل نہ تھا۔ گرامر سے کوسوں دار۔

ہفتہ میں ایک مرتبہ شاید گرامر پڑھائی جاتی ہو۔ دہم میں امتحان سے کچھ دن پہلے تیار نسخے ہضم کرادئے جاتے تھے اور کچھ گرامر رٹادی جاتی تھی۔

خوش قسمتی سے اگر وہی مثالیں امتحان میں آگئیں تو سمجھ لیجئے کہ ممتحن بھی دھوکے میں ہے اور بیچارے نود فیصدی یقین کامل کر لیتے کہ لڑکی نے سوچ سمجھکر سوال حل کیا ہے۔ لیکن انہیں یہ راز کیا معلوم ؟۔

خیر منت مراد ول سے میں نے میٹرک سے قدم نکالا۔ اور جوں ہی انٹر میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ ایک زبردست پہاڑ سر پہ ٹوٹ پڑا۔ دو مہینے تک کلاس میں حقیقت میں غیر حاضر بظاہر حاضر بیٹھی رہی۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لکچرار کی صورت تکنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے" یہاں تو اردو کا نام ونشان نہیں۔

ہائی اسکول میں ہوم ورک دیا جاتا تھا اور یہ ایسا زرین موقع تھا کہ ہر مضمون میں گریجویٹ کی لیاقت نظر آتی۔ لیکن یہاں یہ تو سوائے کلاس ورک کے بات نہیں اور یہ ایسی مصیبت ناگہانی ہے کہ نہ آباجان مدد دے سکتے ہیں نہ بھائی جان۔

خیر "بعد از خرابی بصرہ خواجہ بیدار شد" سے کیا فائدہ مجبوری جو ٹھیری اب کر بھی کیا سکتے ہیں۔ کیونکہ انٹر میں جو تعلیم پا رہے ہیں۔

لکچرار کو یہ غلط فہمی ضرور ہوتی ہوگی کہ یہ انٹرمیڈیٹ کے پرچے میں قوت باصرہ اور حافظہ کم خرچ ہوگی لیکن جوں ہی پرچہ ہاتھ میں آیا سر میں درد آنکھوں میں جلن شروع ہوگئی۔ اور جب پرچہ واپس ملا تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرچے کا خون ناحق ہوگیا ہے کہیں اصلی سیاہی کا پتہ نہیں۔

ماضی پہ جب نگاہ پڑتی ہے تو وہ تیار نوالے جو بغیر کسی محنت کے زہر مار کئے جاتے تھے

زہر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اب تو دست خود و دہان خود کا معاملہ آگیا۔

یا خدا اب کیا کیا جائے؟ چھ سال تو رٹنے میں گزرے اور اب تو لیاقت کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔ وہ عمارت جو کمزور بنیاد پر کھڑی کی گئی تھی اب اتنی مہلت نہیں کہ پھر سے از سر نو تعمیر کی جائے۔ امتحان کے صرف دو ماہ باقی رہ گئے ہیں؟

مناسب تو یہی ہے کہ وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے سے چلی آرہی ہے اختیار کی جائے تاکہ دنیا کو ہماری کمزوری کا علم نہ ہوسکے۔

مصیبت تو یہ ہے کہ رٹ رٹا کر جب ہم امتحان ہال میں داخل ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبر کی پہلی رات ہے۔ اور پھر نگران کاروں کا تو منکر نکیر کے آنے سے کم نہیں۔

ادھر یہ مصیبت نازل ہوئی اور ادھر رٹا ہوا حصہ ذہن سے غائب ہو گیا پھر پرچوں کا نامہ اعمال کی صورت میں تقسیم ہونا قیامت میں قیامت ہے؟

خیر یوں توں کر کے ادھر امتحان ختم ہوا نتیجہ کی فکر سے دس پونڈ وزن کم ہو گیا۔

خدا بچائے امتحان سے جو حالت گزرتی ہے۔ نہ معلوم جنت کا حکم ہو گا یا دوزخ کا۔

دنیاوی امتحان کا یہ عالم۔ کہ دوست تو کجا حقیقی بہن بھائی آنکھیں پھرا لیتی ہے۔

بے مروتی کا یہ عالم کہ کسی قسم کا تعلق ہی نہیں

واہ رے امتحان یہ محبت کے دعوے کرنے والے قیامت میں کیا یا نفسی پکاریں گے

خیر ابھی تو دلی دور ہے۔ ابھی تو ان کے امتحان سے دو چار ہونا ہے۔ کامیابی کا سہرا سر باندھنا ہے۔ پہلے اس کی فکر کی جائے تو بہتر ہے۔

فی الوقت تو یہی مناسب ہے کہ تسبیح و وظیفہ شروع کر دیا جائے یا نہیں تو ممتحن کا دل موم زبان بند کرنے کا عمل پڑھا جائے۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں جھولو ۔ جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو

بس ایک سخن بندۂ اکبر کا رکھو یاد ۔ اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

رقیّہ حسینی

وہ سینی ٹوریم کی ایک نرس تھی جہاں موت کا دیو ہمیشہ منہ پھاڑے زندگی کو نگلنے کی کوشش کیا کرتا۔ اور اکثر و بیشتر کامیاب ہوتا۔

ہاں تو وہ ایک نرس تھی۔ جیون سے گھبرائی ہوئی اور اس سے کہیں زیادہ دنیا والوں سے اکتائی ہوئی لوگوں نے کبھی اسے ہنستے نہ دیکھا۔ وہ صرف مسکراتی تھی۔ اور اس کی مسکراہٹ میں بھی سینکڑوں راز پنہاں ہوتے۔

وہ حسین تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ نشیلی آنکھیں گھنیری پلکوں کی اوٹ سے نہ جانے کیا کہنے کے لئے بیتاب رہتیں۔ شاید زندگی کی تلخیاں۔ یا کچھ اور۔ اس کی بلند اور سفید پیشانی پہ اس کی سیاہ زلفیں جب بکھر جائیں تو یوں معلوم ہوتا جیسے بادلوں کی اوٹ سے چندرما جھانک رہا ہے اور جب وہ تھکن سے چور ہو کر اپنی آنکھیں موند لیتی۔ تو اس کی دراز پلکوں کے سائے اس کے سفید رخساروں پر پھیل جاتے۔ اس کے خوبصورت چہرے پر اداسی چھا جاتی۔ اور اس کا حسن بیدار ہو جاتا۔ اور چندرما کو شرمانے لگتا۔

سینی ٹوریم کی تمام نرسوں میں وہ ممتاز تھی۔ اپنی سادگی اور دلکشی کی بنا پہ سے اور اپنی خداداد لیاقت اور قابلیت کے باعث۔

سینی ٹوریم کے تمام مریضوں کی خواہش ہوتی کہ وہ آئے اور ہماری تیمارداری کرے۔ اور نرس۔ ؟

اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ برو وارڈ میں جا سکے۔

ایک شام وہ وارڈ نمبر (۵) کے مریض کا ٹمپریچر لے رہی تھی کہ۔ نرس لمتا نے آکر اطلاع دی کہ سرجن وارڈ نمبر (۷) میں اسے بلوایا ہے۔ اس نے لتا کو وہیں ٹھہرایا اور وارڈ کی طرف چل پڑی۔

جونہی اس نے اندر قدم رکھا وہ مبہوت ہوگئی۔ اس کی حیران آنکھوں نے ایک سات آٹھ سالہ بچی کو دیکھا۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ لیکن دوسرے لمحے اس کا لو سے دمکتا ہوا چہرہ سرسوں کی کلی کی طرح زرد ہوگیا۔ اس کے ہونٹ نیلے نیلے ہوگئے اور اسکے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ڈاکٹر چونک گیا۔ اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نرس کھڑی تھی۔ ساکت و صامت۔ چہرہ کا رنگ اڑا اڑا۔ وہ اسے دیکھکر متحیر ہوگیا اور سوچنے لگا۔

ایک نرس جو ہمیشہ مسکراتی بیمار کے کمرے میں آتی جب ہمیشہ مریض کی دلجوئی کی۔ اور جس نے ہمیشہ اپنی ڈیوٹی کے وقت یہ محسوس کیا ہے وہ صرف ایک نرس ہے۔ مریض کا دل بہلانے اور اس کی دیکھ بھال کے لئے۔ آج کیا ہوگیا۔ وہ کیوں ایسی ہوگئی۔

آخر اس نے نرس کو مخاطب کیا۔ نرس تمہیں کیا ہوگیا۔ کیا تم اپنے فرض کو فراموش کر رہی ہو۔ کیا تمہارا پہلا فرض مسکرانا نہیں ہے۔ مسکراؤ۔ نرس تمہارا۔ مسکراؤ۔ مسکراتی ہوئی آؤ۔ اور اس کلی کو اپنی حفاظت میں لو جو بن کھلے مرجھا رہی ہے۔

نرس کو ہوش سا تو آگیا۔ اور وہ ایک کلی کی طرح خندہاں ہوگئی۔ لیکن کیسی کلی۔ وہ کلی جسکی ہلکی سی مسکراہٹ پر اوس آنسو ٹپکاتی ہے۔

کلی بھی تو چٹکتے چٹکتے آنسو بہا سکتی ہے۔ لیکن نرس۔ نرس اور آنسو۔ یہ کیسی بات نرس۔ ہکو و مسکار نہیں اگر وہ آنسو بہا چکے۔

وہ تیزگامی سے آگے بڑھی۔ اور مریضہ پر جھک گئی۔ نہ جانے کن جذبات کے تحت اس نے والہ محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔ مرجھائی ہوئی کلی نے اپنی نیم آنکھیں کھول دیں۔ اسکی معصوم آنکھیں ایک درد لئے ہوئے تھیں۔ آخر اسکے کے لبوں کو حرکت ہوئی۔

تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو۔؟

نرس نے اس کا خوبصورت سر اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اور اپنی شیریں آواز میں کہا۔ میں میں نرس ہوں بے بی۔ اور یہیں سے آئی ہوں۔ یہیں رہتی ہوں۔ تم کمزور ہو۔ آرام کرو۔ سو جاؤ۔ اور اس نے اسے بستر پہ آرام سے لٹا دیا۔ اور اپنی مخروطی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

بے بی کی آنکھوں میں ابدی نیند جھانکنے لگی۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اور بہت جلد سو گئی۔ شاید ایسا سکھ اور آرام اس نے کبھی نہ پایا تھا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ تمام نرسیں جا چکی تھیں ہر طرف سکون تھا۔ لیکن وہ بے بی کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ماضی پردۂ سیمیں کی تصاویر کی طرح متحرک تھا۔ اسے اپنی زندگی کا وہ سین یاد آیا جب اس کے شوہر منوہر نے ایک ذرا سی غلطی پر اسے گھر سے نکال دیا اور اس کی بچی کو ہمیشہ کے لئے اس سے چھین لیا۔ وہ صرف دولت کا بھوکا تھا۔ اور اسکی یہ بھوک شاید کبھی نہ ختم ہونیوالی تھی۔ اسے دولت مل چکی تھی لیکن اس کی تشنگی ہنوز باقی تھی۔ اس نے اسے گھر سے نکال دیا اور دوسری شادی کرلی۔

آخر اسنے مجبور ہو کر نرسنگ شروع کر دی۔ اور آج چھ سال کے طویل عرصہ بعد اس نے اپنی پریا کو دیکھا تھا۔ اور وہ بھی کس حالت میں۔ وہ اسے پہچان گئی۔ کیوں نہ پہچانتی۔۔۔؟

چاند کہیں بھی جا چھپے لیکن بادلوں میں رہتا ہے۔

رات بہت رہی تھی۔ اور وہ کھوئی کھوئی بیٹھی تھی۔ نہیں معلوم اس کی آنکھیں کب بند ہو گئیں اور نہ جانے وہ کہاں تک یونہی بیٹھی رہی۔ لیکن جب اس نے اپنی نشیلی آنکھیں کھولیں تو صبح صادق ہو چکی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ اور سرعت سے سرلیفہ کے پلنگ کی جانب بڑھی۔ لیکن اسکی آنکھوں نے وہاں کیا دیکھا۔؟ کاش کہ وہ نہ دیکھ سکتی۔ کلی ہمیشہ کے لئے مرجھا چکی تھی۔

اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس کا سر گھوم گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور آنسوؤں کے چند قطرے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کھو کے رہ گئے۔ اور جب اس کے ہوش و حواس بجا ہو گئے تو دوسرے وارڈ میں مریض کی آواز گونج رہی تھی۔ مسکراؤ نرس مسکراؤ مسکراتی ہوئی آؤ۔ یہی تمہارا فرض ہے۔

اور دور کہیں کسی اونڈ میں نرسس بیناپیا نو پر گا رہی تھی ۔

"من رے مت رو مت روئی"

وہ سوچنے لگی ۔ ایک نرس کے آنسو نہ بہہ سکے تو کیا اس کا من بھی نہیں رو سکتا ۔ کیا اسے اتنا بھی ادھیکار نہیں ۔

درسگاہ زندگی

منیزہ حبا بلو ایم ۔ اے

دنیا کا عظیم ترین و اعلیٰ ترین درسگاہ وہ مقام ہے جہاں ہمیں تلخ ترین تجربات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو کتب اس درسگاہ کی بنیادی نصاب ہیں ۔ ٹھوکریں" "لغزش" اور "چوٹیں" ہیں جن سے ہم کو قدم قدم پہ دو چار ہونا پڑتا ہے ۔ ہر ٹھوکر ہر لغزش ہر ضرب ہر چوٹ بذات خود ایک درس ہے ۔ جو دانشمند ہے وہ ان سے استفادہ کرتا ہے ۔ انہیں نشان راہ بناتا ہے ۔ انہیں شمع ہدایت تصور کرتا ہے ۔ کچھ فاصلے تک اسے راستہ صاف اور ہموار نظر آنے لگتا ہے اور وہ بڑی خوشی کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے چلا جاتا ہے لیکن راستہ کی یہ صفائی اور یہ ہمواری ہمیشہ اس کا ساتھ نہیں دیتی نہ جانے کوئی ٹھوکر آخری ٹھوکر یا کوئی لغزش آخری لغزش ہوتی ہے ۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ پھر ایک نئی ٹھوکر ایک نئی لغزش سے ہم آغوش ہوتا ہے یہ سلسلہ تا زیست جاری رہتا ہے اس کا نام زندگی ہے ۔ اور ان رکاوٹوں کو نشانِ راہ تصور کرنا مدارِ حیات سے ہم کنار ہوتا ہے ۔

دانشمند ہر ٹھوکر کے بعد سنبھلتا ہے ۔ نادان تا حیات ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے "

زندگی اپنی ہے مانند سپند جگہ یہاں
اس سے پہلے کہ اجل آئے مناسب ہے یہی

آکر اس عالم اسباب سے چل دیں اٹھ کے
آنے والوں کے لئے بزم کو خالی کر کے

بسمل

مسجد کے مینار اور مندر کے کلس

سعید انصاری

یہ مسجد کے اونچے اونچے مینار۔
اور یہ مندر کے جگمگاتے کلس۔
سورج کی لہراتی کرنوں نے ہر صبح دیکھا۔
وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔
چندا کی کرنوں نے ہر رات دیکھا کہ۔
وہ ایک دوسرے کو محبت بھری نظروں سے تک رہے ہیں۔
رات ہولناک سیاہیوں کو۔
جب اندھیرے بادل اور گہرا کر دیتے تو۔
مندر کے کلس جگمگا کر کہتے۔
دوست نہ گھبراؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔
اور مسجد کے مینار فخر سے اپنا سر اونچا کر کے کہتے۔
دوست۔ ہمیں تم پر اعتماد ہے۔
مگر یہ مینار اور کلس جتنے قریب تھے۔ پجاری
اور امام اتنے ہی دور تھے۔ آخر ایک دن:۔
سورج کی لہراتی کرنوں نے دیکھا کہ
مسجد کی زمین سرخ۔ سرخ جیتے جیتے خون سے تر بتر
ہو گئی۔ اور مندر لاشوں سے پٹ گیا۔

مگر کلس بدستور جگمگاتے رہے اور مینار اسی طرح سر اٹھائے کھڑے رہے۔
کلس کی جگمگاہٹ مسکرا پڑی۔
ہمدم۔ کتنے نادان یہ بستیوں کے مکیں۔
یہ چیونٹیوں ہی کی طرح پست۔ کم عقل۔
مسجد کے مینار ہنس پڑے۔
ہمدم۔ انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ وہ ایک ہی جگہ سے
آئے ہیں۔ اور ان سب کو ایک ہی جگہ جانا ہے۔
انسانیت کی گود میں انہوں نے جنم لیا ہے۔ اور
یہ سب انسان ہیں۔ بھائی بھائی۔
بھولے۔ نادان۔ اپنی ان نادانیوں پر بھی۔
دعویٰ کرتے ہیں اشرف المخلوقات ہونے کا۔
رات کی سیاہیوں نے بڑھ کر انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔
اندھیرے بادلوں نے سیاہیوں کو اور گہرا کر دیا۔
مسجد کے مینار چلائے۔
دوست۔ نہ گھبراؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔
مندر کے کلس جگمگائے۔
دوست۔ ہمیں تم پر اعتماد ہے۔

ہمارا نشان امتیاز

مرغوب ترین غذاؤں کا اعلی ترین مرکز

مسرت گاہ

اہل ذوق حضرات کے لئے ہر وقت نفیس ترین
غذائیں پیش کرتا ہے۔

جہاں

ہمہ اقسام کی غذائیں
از قسم
مرغ۔ تیتر۔ بٹیر۔ بریانی۔ اور دیگر لوازمات کے علاوہ عمدہ عمدہ میٹھے مہیا کئے جاتے ہیں آپ کی
پر سکون تفریح گاہ
مسرت گاہ افضل گنج حیدرآباد دکن۔ مالک مسرت گاہ محمد ضیاء الدین خان یوزئی

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپکر شہاب دیر لویہ شائع ہوا

رسالہ ۵ تاریخ تک نہ ملے تو مکرر طلب کریں اس کے بعد مجبوری ہے

جلد (۱۷) آذر سنہ ۱۳۵۸ فصلی م اکتوبر سنہ ۱۹۴۸ء نمبر ۱

مُرتبہ
محمد عبدالرزاق بسمل

چندہ سالانہ (۱ ے)

آغاز سنہ ۱۳۵۸ف

اوس نیرنگ کار ساز کا فضل و کرم ہے کہ جب کام کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو ہمارے پاس کیا تھا؟ یہ خوف کہ وہ پودہ جس نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہے زمانہ کے گرم و سرد ہواؤں سے مرجھا نہ جائے لیکن الحمدللہ جو تخم ۱۶ سال پہلے بویا گیا تھا آج ایک تناور درخت کی صورت میں آپ دیکھ رہے ہیں باوجود اس بے سر و سامانی اور ناسازگار ہواؤں کے یہ اوس کی نصرت بخشی ہے کہ شہاب نے اپنے ۱۶ سال ختم کئے ہیں اس عرصہ میں آپ اوسکی ادبی خدمات کی ستائش کرتے ہیں تو اوسکے اولین مستحق وہ ہمارے قلمی معاونین ہیں کہ جنکے زور قلم نے شہاب کو اس قابل بنایا ہے۔

ہماری حیثیت ایک باغبان کی سی ہے جس کا کام کیاریوں کو صاف و پاک کرنا خس و خاشاک کو چھانٹ کر کہیں سے پتی کہیں سے رنگ و بوئے کر آپ کے ذوق نظر کے لئے خوشنما گلدستہ پیش کرنا ہے جب آپ کا ذوق اوس کا ساتھ دے تو باغبان کی ہمت اور حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ نت نئے انداز میں گلدستوں کو تیار کر کے داد کا متمنی رہتا ہے۔

توقع ہے کہ نیا سال ہمارے ادبی خدمات میں اور اضافہ کرے گا۔

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرہ آفتاب تابانیم

اردو شاعری کی مختصر تاریخ

عبدالماجد بیگ بی۔اے عثمانیہ

حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کے عہد مبارک کی ایک زندہ یادگار شمالی ہند کی اردو شاعری ہے ورنہ اس سے قبل تمام شاعر، ادیب، منشی اور اہل قلم فارسی نظم و نثر لکھتے تھے۔

امن اور اتفاق عین انسانیت ہے

اردو کا اصلی وطن جنوبی ہند یعنی ملک دکن ہے یہیں اس کی نشو و نما تربیت و پرداخت امرا و سلاطین کی زیر نگرانی ہوتی تھی۔ اسلئے تمام ملک میں روزمرہ کی بولی چال پر قبضہ کرنیکے بعد سنہ ۹۴۱ھ میں جو ابراہیم شاہ اول کا سال جلوس ہے بیجاپور میں دفتری اور درباری زبان ہونے کا فخر حاصل کیا اور اسکا نام دکنی زبان مشہور ہوگیا۔ سلاطین قطب شاہی گولکنڈہ کے عہد میں اس زبان کا بول بالا یہانتک ہوا کہ فارسی شعراء بھی اس طبع آزمائی کرنے لگے۔ اب یہ دکنی زبان (اردو) عربی فارسی کے ناثر و ناظم اور علماء و شعراء کے سایہ میں پروان چڑھتے اور فارسی کے دوش بدوش چلنے لگی۔ ہر قسم کے خیالات اس میں ادا ہوئے۔ قلی قطب شاہ جو اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کی بجائے گولکنڈہ میں سنہ ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوئے پہلے شخص سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے اپنے اردو کلام کا مجموعہ ایک دیوان بلکہ کلیات کی صورت میں مرتب کیا۔ الفاظ و ترکیبات فارسی کا غلبہ دکنی اردو میں نمایاں ہے اور ملکی زبان

میں درجہ بدرجہ اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ ان کے حقیقی بھتیجے محمد قطب شاہ اپنے چچا کے داماد اور جانشین تھے۔ وہ بھی علاوہ فارسی کے دکنی زبان کے بڑے پرمغز شاعر تھے۔ دونوں بادشاہوں کے دیوان حیدرآباد میں موجود ہیں پہلے دیوان پر ایک تبصرہ انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا ان دیوانوں میں اصناف سخن سے قصیدہ، غزل، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی زبان میں اردو شاعری پایہ کمال پر پہونچی تھی اور شعراء عام طور پر اس زبان میں داد سخن دیتے تھے۔ قطب شاہی عہد کا کلام زبان کی متانت اور پختگی کے ساتھ بتاتا ہے کہ یہ ادبی زبان تھی اور شعراء دکن اس میں جوہر شاعری دکھاتے اور تفنن طبع سے رنگینیاں پیدا کرتے اس عہد میں اردو کا قدم کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ سلطان قلی قطب شاہ اردو میں معانی تخلص کرتے تھے انکا ایک شعر ہے۔

کرتے ہیں دعوی شعر کا سب اپنی طبع میں　　نجتا فصیح شعر معانی کے بین قدا

ان کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کہتے ہیں:۔

دو لب تیرے رنگیلے یاقوت کو دو رنگ　　لیے جھمک رنگ عقیقاں رنگین ہو کے ہیں

ان اشعار کا مقابلہ متاخرین میں ولی اور آبرو سے کیجیئے۔ بہت کم فرق نمایاں ہوگا حالانکہ بہ لحاظ زمانہ بہت فرق ہے۔

محمد قطب شاہ کے بیٹے عبد اللہ قطب شاہ جو سلسلہ قطب شاہی کے چھٹے بادشاہ تھے اپنے باپ اور نانا کی طرح فارسی اور اردو کے گرانمایہ شاعر گزرے ہیں وہ بھی قدردان علم و ہنر تھے۔ ان کا دربار بھی ایک علمی دربار تھا۔ ان کے فارسی اور اردو دونوں دیوان دستیاب ہوئے ہیں جو اصناف نظم کے جامع ہیں۔ زبان صاف و شیرین اور اشعار فصیح و دلکش ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب تیرا　　کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث

ایک اور شعر ہے:۔

جو کچھ راز پردے میں ہے غیب کے　　سو مخفی نہیں اس پہ ہے آشکار

ان کے درباری شاعر غواصی مشہور ہیں جنہوں نے دکنی زبان اردو میں

ایک مثنوی ۱۰۷۶ھ میں تصنیف کی ہے۔ ان سے پہلے عہد جہانگیری میں غواصی شاعر نے "طوطی نامہ" لکھا ہے۔ میر حسن دہلوی نے انکا ذکر اپنے تذکرہ میں بھی کیا ہے۔

ابو الحسن تانا شاہ گولکنڈہ کا آخری تاجدار عہد عالمگیری میں عبد اللہ قطب شاہ کا داماد تھا۔ اس کا دربار بھی علمی و ادبی قدر شناسی سے خالی نہ تھا۔ یہ بھی ایک اردو شاعر گذرا ہے تذکرہ گلشن ہند میں ایک شعر اسکے نام پر درج ہے۔

سرزمین دکن میں بیجاپور بھی زبان اردو کا گہوارہ تھا۔ وہاں عادل شاہیوں کے دور حکومت سے پہلے اردو زبان عام ہو گئی تھی اور سلاطین بہمنیہ عادل شاہی دفتر بھی اسی زبان میں منتقل کر دیا تھا۔ پھر ابراہیم عادل شاہ نے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اردو کو فروغ بخشا اور دفتر حکومت میں جگہ دی اس کے بعد کچھ دور وقفے پیش آئے یہانتک کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی عہد اکبری ۹۸۸ھ میں تخت نشین بیجاپور ہوا۔ جو علم موسیقی کا ماہر تھا۔ اسلئے ایک کتاب دکنی اردو میں لکھی۔ ملا ظہوری نے اس کے تین دیباچے فارسی میں تحریر کئے جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہیں۔ اس خاندان کے دامن دولت سے بھی اہل علم و ادب وابستہ رہے ہیں۔ اردو شاعری کا چرچا یہاں بھی گولکنڈہ سے کم نہ تھا شعراء اس زبان میں خوب طبع آزمائی کرتے تھے۔ دکنی تذکروں میں ان کے نام پائے جاتے ہیں اور بہت سے تذکرہ میر حسن میں بھی ملتے ہیں۔ سید میراں ہاشمی بیجاپوری صاحب دیوان شاعر تھے ۱۰۹۹ھ میں اردو مثنوی "یوسف زلیخا" تصنیف کی جس میں چھ ہزار ابیات ہیں دیوان اردو میں قصائد، غزلیات، مراثی، قطعات اور رباعیات ہیں۔ شاہ امین بیجاپور کے اولیائے کبار سے علی عادل شاہ کے زمانہ میں تھے۔ ۱۰۸۶ھ میں وفات پائی۔ یہ فصیح البیان درویش صوفی شاعر تھے اکثر استغراق کی کیفیت طاری رہتی اور اس حالت میں اشعار موزوں کرتے تھے۔ مریدوں نے ایک مجموعہ آپکے کلام کا جمع کر کے "جواہر الاسرار" کے نام سے مرتب کیا۔

اردو زبان۔ اردو شاعری کا گلزار سرزمین دکن میں صدیوں سے سرسبز و شاداب تھا لیکن شمالی ہند اس کی ترقیوں اور قدر افزائیوں سے لاعلم رہا۔ تمام تحریر دیں اور

دفتروں پر فارسی زبان قابض تھی۔ آخر عہد عالمگیری میں بھی ارباب فضل و ہنر کا مجمع اورنگ آباد میں ہوا اور تمام اہل علوم و فنون حیدرآباد و بیجاپور وغیرہ سے سمٹ کر وہاں آگئے۔ ہندوستان کے اطراف و دہلی سے امراء و علماء و مشائخ دکن پہنچے۔ شعراء اردو بانئے اردو زبان نظم و نثر میں اظہار کمال کرتے تھے۔ اس عہد کے بہت سے دکنی شاعر چمنستان شعراء (لچھمی نارائن شفیق)، بہار و خزاں میر بہاء الدین عروج۔ تحفۃ الشعراء۔ محمد افضل تذکرہ موسوی خان تذکرہ میر حسن میں مذکور ہیں۔ الغرض زبان اردو اور اس کی شاعری کی تربیت و نشوونما و ارتقاء و وسعت دکن کے سلاطین قطب شاہیہ و عادل شاہیہ کی توجہ اور ان کے عہد کی برکات کی مرہون منت ہیں۔

دکن کی طرح زبان اردو کا عام رواج شمالی ہند میں بھی قطب شاہی و عادل شاہی عہد سے ہوا۔ یہاں کی ریختہ اردو میں بھاشا زیادہ مخلوط تھی اور فارسی کا تسلط دونوں جگہ برابر تھا۔ عہد شاہجہانی میں یہ زبان عام بول چال میں مستعمل تھی لیکن اس کی وقعت و عزت روزمرہ ہی تک محدود تھی کسی نثر و نظم کا اس میں پتہ نہیں ہے عہد عالمگیری تک عام شعراء اور ادیبوں نے اسے جولانگاہ فکر نہیں بنایا۔ لوگ خال خال اس میں اشعار موزوں کرتے تھے۔ دفتری و درباری زبان فارسی تھی۔ ادبی و علمی و تاریخی تصانیف اور تمام نثر و نظم سب پر فارسی کا قبضہ تھا۔ اس مبارک عہد کے آخر میں ملک دکن کا ایک شاعر ولی تخلص اورنگ آباد سے دکن پہنچا۔ ان بزرگ صوفی کا نام شمس الدین تھا۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور اردو میں بھی شاعری ان کی طینت و سرشت کا جزو تھی۔ شاہ سعد اللہ گلشن کے معتقد اور شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد ولی ١١٣٢ھ میں محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت میں دوبارہ سید ابوالمعالی کے ساتھ دلی آئے اور اپنا اردو دیوان بھی ساتھ لائے جس کی نہایت قدر ہوئی۔ ہمعصر شعراء نے ان کی غزل وغیرہ کی گویا نقل شروع کی اور اس طرح اردو کو مستقل طور پر اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنالیا اور اردو شاعری زور و شور سے شروع ہوگئی۔ ولی نے اس دلچسپی کو اپنے انداز میں ظاہر کیا ہے۔

دل ولی کا لے لیا دکن نے چھین ؛ جا کہو کوئی محمد شاہ سوں ۔

ولی نے ۱۱۱۹ھ میں اپنے وطن اورنگ آباد واپس آئے اور آخر ۱۱۵۵ھ میں بمقام
احمد آباد گجرات وفات پائی۔

پروفیسر آزاد مرحوم نے اپنے تذکرہ "آب حیات" میں اردو شاعری کی [illegible]
زمانہ سے قائم کی ہے وہ دکن میں اس کی ترقی، رواج عام، تربیت، وسعت و ہمہ گیری سے بالکل
غافل تھے۔ انہوں نے ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا اور احمد آباد گجرات کا باشندہ
بتلایا۔ ان کے دیوان کو شعرا اردو کا پہلا دیوان خیال کیا۔ ایک مورخ کا فرض ہے کہ تاریخ
کی روشنی میں واقعات و آثار اور موجودات کا سراغ لگائے۔ ہر طرف نگاہ دوڑائے۔
اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ مورخ کی ذمہ داری نہایت اہم و نازک ہے۔ آزاد کا یہ قصور اگرچہ
محققین کی نظر میں بجائے خود خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ کتاب کا موضوع تاریخ زبان
اردو ہی ہے۔ لیکن وہ اپنے فن میں پہلی کتاب ہے جو اب سے تقریباً (۶۸) سال قبل
تصنیف ہوئی۔ اس نے آنے والوں کے لئے تحقیق و تفتیش کا دروازہ بند نہیں کیا۔ البتہ شعرا
کے حالات اور شخصی واقعات میں آزاد مرحوم نے سخت غلطیاں کی ہیں۔ بایں ہمہ وہ
مفید معلومات سے بھی خالی نہیں ہے۔

ولی کا دیوان قدیم اردو کا آئینہ ہے۔ مرہٹی، تلنگی زبانوں کے الفاظ جو یہاں
کی اردو میں مخلوط تھے اس میں موجود ہیں اس کے ساتھ ولی کی سادگی بھی نمایاں ہے۔ ان
کے ہمعصر ولی، مدراس کے نواح کے اردو شعرا جو فارسی اور اردو ادب کے مالک تھے۔
ولی کے انداز سخن کے فریفتہ تھے اور انکو ایک خاص وقعت کی نظر سے دیکھتے۔ ولی
کی صوفیت اور متصوفانہ کا اثر بھی معاصرین پر چھایا ہوا تھا۔ مسائل تصوف وحدت
الوجود کے معاملات سے اس عہد کی غزلیں مالامال ہیں مراعات لفظی کے نمونے بھی
کہیں پائے جاتے ہیں۔ بعض اشعار بالکل آجکل کی زبان میں ہیں مثلاً۔

شراب شوق سے سرشار ہیں ہم — کبھی بیہوش کبھی ہوشیار ہیں ہم

ولی کے معاصرین حاتم اور آبرو نے اردو شاعری میں کمال دکھایا۔ آبرو سے
کہیں زیادہ حاتم نے زبان کی صفائی اور شستگی کا خیال کیا۔ انتہا کے پر گو تھے عمر بھر کی

کمائی میں سے ایک دیوان سرمایہ شاعری ہے جسکو ارباب نظر کے آگے رکھا اور جو بیحد مقبول ہوا۔ ان کی زبان ولی سے زیادہ فصیح و شستہ ہے مضامین میں بلندی بھی ہے۔ انکی ولادت عہد جہانگیری میں ۱۱۱۱ھ اور وفات ۱۱۶۹ھ میں پائی۔ سوداؔ ان کے شاگرد تھے لیکن یہ کہنا کہ استاد کو شاگرد پر فخر تھا اس عہد کے لحاظ سے کچھ اصل نہیں رکھتا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

ایک اور شعر ہے:۔

اے خردمند و مبارک ہو تمہیں فرزانگی ہم ہوا و صحرا ہوا اور وحشت ہوا اور دیوانگی

طرز تغزل کی سنجیدگی داد طلب ہے ان کے بعد آبرو ہیں۔ یہ بھی عہد عالمگیری میں پیدا ہوئے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں استاد سخن تسلیم کئے گئے ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا اتباع ان کے مرکوز خاطر تھا۔ دونوں کے کلام میں باعتبار زبان الفاظ و محاورات اتحاد اور بہ لحاظ مضامین کھلا ہوا فرق ہے لیکن یہ سرسری نظر میں نہیں معلوم ہوتا۔ مضامین میں پستی زیادہ اور بلندی کمتر ہے۔ خیالات سادہ اور زبان ثقیل ہے مثلاً ملاحظہ ہو:۔

آج پھر ہم سے کر دیا ہے اداس ان رقیبوں کا جائے ستیاناس

ایک دوسرا شعر ہے۔

سر سے لگا کے پانو تک دل ہوا ہوں میں یاں لگ ہنر میں عشق کے کامل ہوا ہوں میں

اس عہد کے عام شعراء طرز ایہام گوئی پر زیادہ مائل تھے۔ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی جگہ اپنے اشعار کو اس صنعت سے زینت دیتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ کیفیتی قانون ہے کہ ہر قرن کے بعد سے مجدد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی اصلاح کرتا ہے۔ اس طرح اردو شاعری بھی اس کی محتاج تھی کہ اس کے گلزار پر بہار کو کریہہ نامانوس الفاظ اور بھدی ترکیبوں کے خس و خاشاک سے پاک و صاف کیا جائے۔ اور ایہام و تو ریہ کی پیچ در پیچ گھاٹیاں بھی سدراہ نہ ہوں۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہ

کی لطافت پسند طبیعت نے اس کی اصلاح کی جانب اپنی توجہ مبذول فرمائی اور اس ناہموار انداز بیان و طرز ایہام کو بیک قلم صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

خواجہ میر درد مرزا صاحب ممدوح کی طرح فارسی اور اردو شاعری میں کامل تھے انہوں نے تصوف کے حقائق و معارف کو اردو اشعار میں اس طرح ادا کیا ہے جو آجتک کسی سے نہ ہو سکا غزل کے قواعد اور رنگینی و تاثیر میں سابق الاقدام ہیں۔

میر و سودا اور سوز نے ان کے مضامین کی تقلید کی اور انکو شعر ریختہ کا رکن اعظم تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ میر حسن اپنے تذکرہ میں انکی بابتہ لکھتے ہیں۔ دیوانش اگرچہ مختصر لیکن مثل کلام حافظ سراپا انتخاب۔

مرزا رفیع سودا بھی آپکے مقابلہ میں آنا سوء ادب خیال کرتے ہیں۔ مختصر بحروں کی غزلیں دلکش اور اثر میں لاجواب ہیں آپ کی وفات ۶۲ سال کی عمر میں ہوئی۔ ان کے معاصروں میں مرزا سودا اور میر تقی میر تھے۔ سودا اردو شاعری میں مرتبہ عالی رکھتے تھے اور ان کے دم سے شعر و شاعری کا بازار دہلی تا لکھنو گرم تھا انواع شعر کے تمام مروجہ نمونے ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ فارسی دیوان بھی خوب ہے انہوں نے اردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ مشہور ہے کہ انکا قصیدہ غزل سے بہتر ہے۔ لیکن ارباب سخن کے نزدیک یہ لغو و مہمل فیصلہ ہے۔ ان کا قصیدہ اور انکی غزل دونوں بلند پایہ ہیں۔ لکھنو میں بعہد نواب آصف الدولہ انتقال کیا۔ ان کے بعد ۱۱۹۷ھ میں میر تقی میر لکھنو پہنچے یہ غزل گو شاعر اور استاد مسلم الثبوت ہیں۔ سوز و گداز اور عشقیہ راز و نیاز موثر انداز بیان ان کے اشعار کا جوہر ہیں اور یہی تغزل کی روح رواں ہے۔ قصائد اور مثنویاں قابل التفات نہیں ہیں عموماً ہر شاعر کے کلام میں رطب و یابس بلند و پست نظر آتا ہے اس سے بڑے بڑے اساتذہ کے دیوان خالی نہیں ہیں۔ خواجہ میر درد کو جانے دیجئے اور بقیہ تمام اردو کے دواوین پر نظر کیجئے۔ کوئی اس کلیہ سے مستثنی نہیں ہے۔

شعر

گر اعجاز نیاشد بے بلند و پست نیست
در ید بیضا ہمہ انگشتہا یک دست نیست

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میر صاحب کے بلند اشعار بہت کم ہیں۔ اردو میں آپکے چھ دیوان ہیں اور غالباً اس کثرت کلام کی وجہ سے ان کا تقدم تسلیم کیا جاتا ہے۔ بہت اشعار کی کثرت نے آپکے کلام کے بڑے حصہ کو "ردی" جیسا لقب دیا ہے آپکے صرف منتخب اشعار جو تذکروں میں درج ہو چکے ہیں واقعی لاجواب نیشترو نشتر ہیں باقی تمام کلام نہ دیکھنے سننے کے لایق نہ دکھانے سنانے کے قابل۔ بقول آزاد مرحوم میر صاحب کا تبرک ہے۔"

اس دور سے میر حسن اور میر سوز بھی اتصال رکھتے ہیں اور دونوں نے اردو زبان اور اردو شاعری کی ترقی و توسیع میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اس دور کے بعد دہلی سے اردو شاعری نے لکھنؤ کو رخصت سفر باندھا۔ ارباب کمال ایک ایک ترک وطن کر گئے دلی میں شاہی دربار سرد ہو گیا اور سلاطین مغلیہ کے شہزادے بھی آوارہ وطن ہو کر لکھنؤ وغیرہ چلدئے اور قدردانی بھی ان کے ساتھ رخصت ہوئی۔ میر و سودا لکھنؤ جاکر دنیا سے سفر کر چکے۔ ان کے بعد مصحفی، انشاء، جرأت اور میر حسن وغیرہ لکھنؤ گئے۔ شاعری کا چرچا عام ہوا قدرشناسی نے جوہر دکھائے امراء نے توجہ کی انشاء اور جرأت نے اپنا اپنا رنگ جما لیا۔ لیکن استادی کا سکہ صرف مصحفی کے نام سے چلا۔ ان کے فیض تربیت نے ناسخ، آتش، تنہا۔ بیمار اور اسیر پیدا کئے اور لکھنؤ شاعری کا مرجع بنگیا۔ یہاں آکر زبان اردو میں ایک خاص نزاکت و لطافت پیدا ہو گئی۔ ملکی نفاست نے بہت کچھ اصلاح کی۔ بھدے اور ثقیل الفاظ میں سے بہت کچھ خارج ہو گئے۔ نئے محاورات بھی داخل زبان ہوئے مصحفی، انشاء اور جرأت اپنی اپنی آن میں رہے لیکن ان کے بعد آنے والوں نے تکلفات کے دلچسپ مناظر دکھلائے۔ تلامذہ شیخ مصحفی نے لکھنؤ کی شاعری کا ایک نیا معیار قایم کر کے ایک زمانہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ناسخ اپنی روش کے استاد قرار پائے۔ زبان کی اصلاح کی۔ غزل کا رنگ پلٹ دیا۔ چونکہ شوکت الفاظ ان کی طبیعت کا خاصہ تھی غزل میں قصیدہ کی شان نظر آنے لگی مضامین حسن و عشق اور واردات حسن [illegible] کی جگہ غیر متعلق چیزوں کو

غزل کا جزو بنایا اور شعر کی تاثیر کو بالکل مٹا دیا۔

آتش کے کلام میں اکثر زبان کی سادگی کے ساتھ تغزل کا اصلی مقصد موجود ہے تاثیر کا رنگ جھلکتا ہے لیکن ناسخ کا زور کلام اور صفائی بندش بھی ایک خاص امتیازی حالت میں ہے۔ انہی کے عہد میں دہلی کے آخری ارباب کمال ذوق مومن اور غالب نے اردو شاعری کو از سر نو تازہ کیا اور محمد شاہی زمانہ کی یادگار آخری سلاطین تیموریہ ابوظفر بہادر شاہ کے دم سے قلعہ میں قائم ہوئی۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد بادشاہ خاقانی ہند کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ قصیدہ گوئی میں یکتائے زمانہ اور غزل میں خاص طرز کے مالک تھے۔ شائستہ مضامین کے ساتھ محاورات اور ضرب الامثال انکا مخصوص رنگ ہے۔ انہوں نے زبان اردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ قصائد میں سودا کے سوا ذوق کے مقابلہ میں کوئی پیش نہیں کیا جا سکتا۔

حکیم مومن خاں۔ مومن ایک معزز اور ذی علم خاندان کے نہایت غیور اور نازک خیال شاعر تھے۔ ذکاوت میں جوہر خداداد تھا قصائد اگرچہ امراء و سلاطین کی مدح میں نہیں کہے لیکن حمد و نعت میں نہایت بلند قصیدے لکھے جنکی شان سب سے جدا ہے۔ مدح میں بے حد زور اور جوش اخلاص کا رنگ ہے۔ غزل میں تغزل کا حق ادا کیا ہے اور نفسیاتی شاعری کے لئے مثالی نمونے دکھائے ہیں جس کو خالص غزل کہا جا سکتا ہے۔ معاملات حسن و عشق کو غزل میں محدود کر کے اس میں نازک خیالی کے معجزات دکھائے ہیں تغزل کے دائرہ کو انہوں نے دوسرے مضامین سے بالکل محفوظ رکھا ہے۔ یہاں تک کہ ساقی میکدہ شباب و ساغر کا بھولے سے بھی نام نہیں لئے پانچ مثنویاں بحر خمسہ میں نہایت زور دار لکھیں اور اس میں اپنی ہی وارفتگی کا رنگ دکھایا ہے۔ ۱۲۶۸ھ میں راہی دار البقاء ہوئے۔ ابتک ان کے طرز کی کوئی کامل تقلید نہ کر سکا۔

مرزا غالب تیغ اصفہانی کے گھائل تھے اور نظم و نثر اردو کو موجب کسر شان اور اردو شاعری کو ننگ و عار سمجھتے تھے۔ آخر زمانہ میں خطوط اردو میں لکھنے لگے اور پہلے جو ریختہ بہ رشک فارسی کہتے تھے اسکی جگہ چند غزلیں بہ اتباع میر لکھکر اردو شاعری میں بھی

مشہور ہوئے فارسی نظم و نثر میں مرزا کا پایہ بیدل اور ناصر علی کے بعد سب سے بلند ہے اور اکثر غزلیات و قصائد میں وہ عرفی و ظہوری کے ہم دوش نظر آتے ہیں۔ فارسی کا ذوق ان کی طبیعت کا خمیر تھا اور وہ اردو شعرا کی صف میں بیٹھنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک ریختہ گو حریف سے خود خطاب فرماتے ہیں ؏

انچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است۔

کسقدر حیرت انگیز واقعہ ہے کہ مرزا کے کمالات کا آئینہ اس دور جدید میں صرف اردو نظم ہے اور کل شہرت اس کی بدولت ظہور پذیر نظر آتی ہے۔ حالانکہ انہوں نے نہ کوئی معتد بہ خدمت زبان اردو کی انجام دی نہ اردو شاعری میں اظہار کمال کیا۔ وہ بہت قلیل سرمایہ کے مالک ہیں نثر اردو میں ان سے کہیں زیادہ سرسید مرحوم اور ڈپٹی مولوی نذیر احمد خاں مرحوم رہنمائی کر چکے ہیں اور مرزا کے مکتوبات کی عام اشاعت بہت بعد کو ہوئی ہے۔ انہوں نے غیر ضروری القاب و آداب کو خطوط میں حذف کر کے سہولت پیدا کی ہے اور مکاتبات میں مکالمات کی شان دکھائی ہے۔ آپکا سال رحلت ۱۲۸۵ھ ہے۔ لکھنؤ میں شاعری کی مقبولیت اور لوگوں کے تفنن طبع نے اردو شاعری کی ایک عجیب و غریب صنف پیدا کی ہے۔ جس کا نام مرثیہ ہے۔ ابتک واقعہ کربلا اور مصائب شہدا و تذکرہ نظم کر کے نوحہ و بکا کی ترغیب سامعین کو دیجاتی تھی طویل روایتیں اور مناظر بزم و رزم، قدرتی کیفیت وغیرہ کا ذکر بلکہ تلوار اور گھوڑے کے اوصاف بھی اس کے اجزاء میں داخل نہ تھے۔ اس کو مرثیہ کہتے ہیں۔ اس میں شاعری کا حصہ بہت کم ہوتا تھا۔ اودھ کی حکومت شیعہ تھی۔ مجلس۔ تعزیہ۔ علم۔ گریہ اور سینہ کوبی مذہبی مراسم تھے مجلسوں میں ذاکر۔ حدیث خوانی کرتے اور روایات جو کتابوں میں منقول ہیں سناتے اور روتے رلاتے تھے۔ انکی عزت و وقعت بہت کی جاتی تھی۔ جب میر انیس اور مرزا دبیر کا زمانہ آیا تو انہوں نے شاعری سے ذاکری کا بھی کام لیا اور مشاعرہ کی دلچسپی بھی مجالس میں پیدا کر دی اور مذہب کے پیرایہ میں شاعری کے غیر معمولی کمالات دکھائے انہوں نے ذاکروں سے منبر چھین لئے۔ مرثیہ کا قالب بدل دیا اور واقعات میں حسب

ضرورت ہوئی تو آنہ تبدیلیاں بھی کیں۔ اس سے مرثیہ اصناف سخن کا مجموعہ بن گیا۔ میرانیس اور مرزا دبیر نے اس فن میں کمالات دکھا کر مذہب اور شاعری کے دربار سے داد حاصل کی۔ لیکن یہ فن لکھنؤ میں محدود رہا۔ اور اب وہاں بھی ختم ہوگیا۔ مذہبی جوش میں ترقی ہے لیکن شاعری۔ قدر شناسی اور حوصلہ افزائی کی محتاج ہے ؎

پراگندہ روزی پراگندہ دل

زوال سلطنت کے بعد امراء بھی غیر مطمئن ہوئے۔ بغرض ثواب نوحہ وسلام اور ماتم اب بھی نظم کئے جاتے ہیں۔ مرثیہ کی بدولت شاعرانہ تخیل بھی داخل مذہب ہوگیا۔

قدیم شاعری کا آخری دور امیر۔ داغ۔ جلال۔ اور تسلیم پر ختم ہوتا ہے۔ ان حضرات نے صفائی زبان وشستگی بندش کو زیادہ ترقی دی۔ امیر مرحوم کسی طرز کے موجد نہ تھے لیکن شعر ایک تراشا ہوا نگینہ ہوتا ہے اور باعتبار مضامین لکھنؤ کے بگڑے ہوئے رنگ کا آئینہ ہے۔

مرزا داغ غزل گوئی میں استاد تھے اگرچہ کلام میں بلندی وپستی جمع ضدین کا منظر رکھتی ہے لیکن تغزل کا رنگ اور حسن کے ادا کرنے میں کمال حاصل تھا۔

جلال نے اپنے لکھنوئی انداز کو بدل کر دہلی کا اتباع کیا ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ تسلیم کے کلام میں خاندانِ مومن کی ترکیبیں مزہ دیجاتی ہیں لیکن مجموعہ کلام پھیکا اور سادہ ہے۔ قصیدہ غزل سے اچھا کہتے ہیں۔

اس عہد میں جدید شاعری دور کا آغاز ہوا اور ملک وقوم کی نگاہیں مولانا حالی۔ اکبر الہ آبادی۔ ڈاکٹر سر اقبال کی طرف اٹھنے لگیں حسن وعشق کے جذبات نے قومیات اور وطنیات کا جامہ پہنا۔ نظموں کی گرم بازاری ہوئی لیکن حق یہ ہے کہ اس ایجاد کا سہرا "مسدس حالی" کے سر ہے۔ وہ رہنمائے اول اور حالی کے کمال شاعری کا آئینہ ہے۔ حالی نے مسلمانوں کو جدید ترقی کی طرف بڑھایا اور قدیم غفلت سے متنبہ کرکے انکو تعلیم وتہذیب جدید کی روشنی کے فوائد بتلائے۔ قدیم طرز سخن کو ترک کردیا۔

اکبر نے مغربی تہذیب و تعلیم کے خراب نتائج قوم کے آگے پیش کئے۔ اور تقلید کو روکنے کی پر زور کوشش کی ظرافت سے زبان میں تاثیر کا رنگ پیدا کیا اور ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ اس رنگ میں کوئی انکا مقابلہ نہ کرسکا۔

اقبال نے اسلامی حقائق و معارف کے ساتھ فلسفیانہ رنگ میں قوم کی ہمت جراءت بڑھائی۔ شاعری سے قوم کے جذبات کو مشتعل کیا۔ فارسی زبان کا مذاق جو عموماً معدوم تھا، لوگوں کو اس کی جانب متوجہ کیا اور مردہ ذوق میں نئی روح پھونکی کلام کی تاثیر میں کلام نہیں ہوسکتا۔ افسوس یہ آخری صاحب کمال اقبال بھی آج مسلمانوں کے اقبال کی طرح قوم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔

ان حضرات کے بعد کوئی ہستی تاریخی حیثیت سے قابل ذکر نظر نہیں آتی۔

۱۔ جب دو محبت کرنے والوں میں شادی ہوجاتی ہے تو محبت ختم ہوجاتی ہے۔ محبت سے زیادہ دوستی پائدار رشتہ ہے اور محبت کرنے سے زیادہ مشکل چیز دوستی کرنا ہے۔

۲۔ عورتیں کانوں سے محبت کرتی ہیں اور مرد نظروں سے میرا مطلب یہ ہے عورتیں جو کچھ سنتی ہیں اس سے مسحور ہوجاتی ہیں، مرد جو کچھ دیکھتے ہیں اس سے

۳۔ عورتیں تصویر ہوتی ہیں اور مرد معمہ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ عورت کا واقعی کیا مطلب ہے تو اوس کی طرف دیکھو، اسکی سنو نہیں۔

عورتیں بغیر خوبصورت ہوئے بھی دلکش ہوسکتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کی مشہور ترین عورتوں میں کوئی نہ کوئی جسمانی نقص رہا ہے۔

۴۔ عورت کو اپنی مشوشیلی ادائیں دکھانے کا موقع جتنا خوش کرتا ہے زیادہ اتنا کوئی چیز اسے خوش نہیں کرتی۔ (آسکر وائلڈ)

غزل

جناب سکندر علی صاحب وجد ایچ سی ایس

دل حق نما حق نگر مل گیا
عجب سالک باخبر مل گیا

کسی خاص رخ اس کی منزل نہ تھی
جدھر دل نے ڈھونڈا ادھر مل گیا

دوا جب سے چھوڑی شفا ہو گئی
دعا ترک کر دی اثر مل گیا

توکل پہ تکیہ رہا عمر بھر
مقدر میں تھا جس قدر مل گیا

مزہ موت کا خوف سے بارہا
ہمیں وقت سے بیشتر مل گیا

اسے مل گئی دولت دو جہاں
جسے وجد سوز جگر مل گیا

غزل

سعید شہیدی سلمہ

(زیر ترتیب مجموعہ "برق و آشیاں" کا ایک ورق)

شام غم جب دربدر ہو جائے گی
وقت سے پہلے سحر ہو جائیگی

جب نشیمن میں بھی جی لگتا نہ تھا
اب قفس میں بھی بسر ہو جائیگی

دل کی دھڑکن کا سہارا چاہیے
آج پابند اثر ہو جائیگی

ڈال دی جس دن نشیمن کی بناء
بجلیوں کو خود خبر ہو جائیگی

اپنی آہوں پر بھروسہ ہے مجھے
جب میں چاہونگا سحر ہو جائیگی

داستاں کا مختصر ہونا بھی کیا
مسکرادو مختصر ہو جائیگی

رحم آ ہی جائے گا ان کو سعید
شام غم کی بھی سحر ہو جائیگی

اخبارات میں آجکل "مولیمین" کا ذکر آرہا ہے ذیل کے مضمون دلچسپی کا باعث ہوگا۔

۱۔ رنگوں کی بوقلمونیوں سے اکتا کر اپنے بھیا کے اصرار پر "مولیمین" تک تقریباً (۱۸۰) میل کے طے سفر پر با دل ناخواستہ آمادہ ہو گئی۔

یہ سفر صبح کے ۸ بجے شروع ہوا تمام دن شدت کی دھوپ۔ پیاس کی تڑپ ملٹری وہیکل کے ہلکوروں نے میری اعضا کی نصف طاقت سلب کر لی۔ تھکاوٹ سے چور بمشکل شام کے ۵ بجے تھاٹون میں قافلے نے لنگر گرا دیا۔

رات کے کھانے کے بعد بستر پر گھنٹوں کروٹیں لیتی رہی۔ باوجود کوشش کے نیند کافور تھی۔ رہ رہ کر واقعات کا ایک بے پناہ ہجوم دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔

کتنا دلفریب نظارہ تھا جب ہماری لاری ریلوے اسٹیشن "واو" میں لاکر شارٹ گیج ریلوے کے ڈبوں میں حفاظت سے زنجیروں میں جکڑ دی گئی۔ پاؤ گھنٹہ تک یہ گاڑی ایک دبلے اور خستہ حال کولو انجن کی ہمت کے بھروسے زنگ آلود پٹری پر پھسلتی رہی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کسی ظالم شوہر کے تعاقب میں اوس کی بیوی دوڑی چلی جارہی ہے باوجود سانس پھولنے پر وہ رکنا بھی چاہتی ہے مگر نئی نویلی دلہن کی شرم وحیا کی طرح اٹھتے قدم کسی غیر معلوم طاقت کے زیر اثر خود بخود اٹھ رہے تھے۔ دائیں بائیں۔ لمبے قد و قامت کے درخت تماش بین کی طرح کھل کھلا کر جھوم رہے تھے۔ اور شرابیوں کی مانند مست تھے اور بیچاری پٹری گردن جھکائے ہزار بل کھاتی سیاہ لکیر سی ڈالے جا رہی تھی۔ اور مسافر انہیں دو لکیروں کے درمیان اپنے منزل مقصود کی تلاش میں مصروف تھے۔

اس منظر میں زیادہ تر انڈین آرمی کور کے آراکین تھے۔ بیچاروں کو دیکھ دیکھ کر ترس آتا تھا

اگرچہ بظاہر چہروں پر رونق تھی مگر پس پردہ ان کی پیشانیوں پہ تیوڑی سے بانکے بل پھیکی پھیکی مسکراہٹ میں پوشیدہ تھے ان حضرات کے مزاج کا جائزہ لینا جنرل ممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا اور ایک نامعلوم حکم کی طرف ضابطے کے تحت بڑھے جا رہے تھے انکی حرکات میں بجلی کی سرعت اور رعد کی گرج پوشیدہ تھی۔ دریائے رسٹیانگ) پر سب سے پہلے ہماری گاڑی اتاری گئی پھر ہم ایک چھوٹی کشتی فیری) کے ذریعہ دوسرے کنارے پہونچائے گئے اور یہاں سے پھر سڑک کا سفر شروع ہوا۔ اور یہ (۶۶) میل کا سفر دوپہر شام تک جاری رہا۔ اس سڑک پہ قدم قدم پر گڑھے تھے جنکی وجہ سے موٹر کے ہچکولوں نے آنتوں میں ایک زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ ہمارے ساتھ والی گاڑی گرد و غبار کے دھوئیں اپنے پیچھے چھوڑتی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ راستہ کے دونوں جانب بید کے درخت ہم سے کہہ رہے تھے کہ تمہیں اپنے سفر کا عادی ہونا چاہیے۔ یاد رکھو کہ اس خستہ راہ سے زیادہ تمہیں۔ ایک تلخ اور ہموار آزادی سے گذرتا ہے وہ تمہارے نہ ختم ہونے والی زندگی کا سفر ہے۔

گاڑی کے شور و شغب کی آواز سے جنگلی کوے پھڑپھڑا کر اڑ جاتے۔ اس اثنا میں سڑک کے دائیں پہلو سے ایک گولی ہوا میں سرسراتی کانوں کے قریب سے فضا میں تحلیل ہو گئی۔ اور اسکے ساتھ ہی پورا قافلہ رک گیا اور آن کی آن میں سڑک کے دونوں جانب سے فائر ہونے لگے۔ مسافر بیچارے سہمے ہوئے گرتے پڑتے کیچڑ میں لت پت بھاگ رہے تھے جہاں تھوڑی سی آڑ میسر ہوئی۔ دیوی دیوتاؤں کو یاد کرکے چلا رہے تھے۔ ایک سناٹا تھا اور یہ سب اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے کہ اس اثنا میں ایک مسلح ملٹری گاڑی آ پہونچی یہ سپاہی سناٹا کی تیزی کے ساتھ گولیوں کے مینہ، جانب لپکے جن کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے اور یہ سب زمین پر کہنیوں کے بل آگے بڑھ رہے تھے گویا آج وہ موت کو بھی شاید نابود کر دینگے دوسرے گولی آتی اور قدموں تک پہونچکر گر جاتی۔ یہ کشمکش کوئی آدھ گھنٹہ جاری رہی۔ اب زہریوں کا حملہ سست پڑ چکا تھا گارڈ کے بہادر سپاہیوں نے تمام مسافروں کو اکٹھا کیا اور اپنی حفاظت میں انہیں ریلیف کیمپ پہونچا دیا۔

یہاں سے آگے کا راستہ خطرناک حملوں اور دھوپ کی شدت سے محفوظ تھا۔ اور پہاڑوں کی چوٹیوں قبضہ کانگپوکپی از) کے کلس دکھائی دے رہے تھے ذرا آگے بڑھتے ہی سڑک خم کھاتے پہ آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ (ڈاون) سے آگے یہ منظر (سینک سین) میں بدل ہو کر رہ گیا زمین کا چپہ چپہ

۱۹۳۹ سے اگست ۱۹۴۵ء تک کے حالات اپنے پہلو میں لئے پڑا تھا۔

ہم نے نو بجے اپنا سفر شروع کیا اور گنگا کی وادی سے ہوتے ہوئے سالوین ریور (دریا) کے مغربی کنارہ پر پڑاؤ ڈالا گیا یہاں سے ۱۲ بجے (فیری) کے ذریعہ اس پار پہنچا تھا۔ یہیں تو (موہنین) ہے۔

اس شہر کے فلک بوس مندروں کی چوٹیاں دھوپ سے تیز دھوپ میں چمک رہی تھیں یہی ہماری منزل مقصود تھا جس کے لئے ہمارا سفر شروع ہوا تھا۔ ہم کو خود خبر نہیں کہ اس پر فریب نظارہ شہر کے دیکھنے کے کیوں خواہشمند تھے۔ تاریخی نکتۂ نگاہ سے ہم بالکل بے خبر نہیں اس کی اہمیت کچھ بھی مگر اتنا ضرور جانتے تھے کہ زمانہ قدیم میں انگریزی راج سے پیشتر جبکہ یہ ہمارا دیس ہندوستان سے ملحق تھا یہ اس کی سرحد کا آخری مقام تھا۔ بعد میں ان تعلقات کو اور بھی مستحکم کرنے کے لئے مہاتما بدھ کے اپدیشکوں نے جس سرگرمی سے کارگذاریاں عمل میں لائیں رعایا چین کے اہل مہر ہند کے مابین اقتصادی طور پر روابط قائم کئے چین کے ایک ادیب خاندان (کشک) کے مہاراجہ (ہونگ لیانگ میان) نے اپنے فتوحات کے زمانہ میں عمر کے آخری حصہ میں اس دریا کے کنارے رہائش اختیار کی اور اسی کی مناسبت سے اس شہر کا نام (ہونگ لاین) مشہور ہو گیا اور پھر امتداد زمانہ سے یہ چلتا چلاتا موہنین ہو گیا۔

ہندوستان کے تعلقات زیادہ تر مہاتما بدھ کے فلسفہ کے ہم جا منحصر تھے راجہ ہونگ لیان مین" نے اپنی عقیدت کے پھول مہاتما کی خدمت میں پیش کئے اور بدھ مت کی اشاعت میں تبلیغ کی۔

اس وقت یہ شہر سالوین دریا کے کنارے سے ۸ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف ہندوستانی آباد ہیں اور دوسرے جانب اہل چین۔ اور بدھ کے باشندے باقی حصہ میں اقامت پذیر ہیں چینی زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں اس کے سوا بڑی بڑی جاگیروں کے مالک ہیں۔ بازار کھلے۔ سڑکیں پختہ۔ دکانوں میں زیادہ تر عورتیں ہاتھ بٹاتی ہیں۔

یہاں کا فیشن بلحاظ اور ممالک کے فیشن کے زیادہ ارزاں ہے۔ مرد عورت سادے چند گز کپڑے سے بہ آسانی اپنا جسم ڈھانک سکتے ہیں۔ خوراک میں بھی انہیں خاص نفیس چیزیں نہیں چاہئیں۔ دریا کی مچھلی جھیل تالاب کے کیکڑے ان کی من بھاتی غذا ہے۔

موجودہ جنگ عظیم کے افسانے سے پیشتر یہی سنگاپور کی کنجی تھی۔ بعد ازاں جاپانیوں کا یہ مرکز بنا رہا۔ ۱۹۴۲ء میں یہ شہر آگ کی لپٹوں میں گھرا رہا۔ مرطبان جو اس کے کنارے آباد تھا قطعاً نابود ہو چکا ہے مگر آثار ظاہر ہیں (جیٹی) کی تباہ کن حالت انقلاب زمانہ کی یاد دلا رہی ہے کشتیوں کے بادبان دریا کی لہروں سے ہچکولے کھاتے اکتا کر ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔

وہ دیکھو سامنے آبی کشتی سرعت کے ساتھ پانی کی لہروں کو چیرتی آگے بڑھ رہی ہے۔ اسکے اونچے اونچے ستون اگن بوٹوں کا دھوکا دے رہے ہیں۔

ہم اسی بوٹ پر پاؤ گھنٹہ بعد اسپار جا اترے اور شہر میں داخل ہوئے اور ایک خستہ حال مقام میں مقیم ہوئے یوں تو مکان اجڑ چکا ہے لیکن اس کا جنوبی حصہ قابل رہائش ہے اڑوس پڑوس کے رنگ سے قیاس ہوتا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے یہ بہرکیف شہر ہوگا۔ شکستہ حالت فلک بوس عمارتوں کی دیوار پر کارگروں کے نقش کا پتہ دیتی ہیں۔ لیکن آج اجڑے دیار کے سوا کوئی نہیں۔

مندر کے سنگوں کلس کی گھنٹیاں اب بھی گذشتہ باتوں کی تائید کرتی ہیں۔ دریا میں مدخبر اکے پانی کی اٹھتی موجوں سے سرسر کرتی ہوئی ہوا شامیں شامیں کی آواز گھنٹیوں کے پرترنم گیت میں کھو جاتی ہے میں تمام دن مکان کو سنوارنے میں صرف ہو گیا تھا اور میں سونا چاہتی تھی مگر ابتدا سے انتہا تک میرے دماغ میں اس شہر کی بھاگتی تصویریں اپنا نقش بنا رہی ہیں۔

نیم خمار آنکھیں بند ہو رہی تھیں ایک تیز ہوا کا جھونکا سنسناتا ہوا میرے قریب سے گذر گیا اور سرہانے کی شمع کانپنے لگی میں نے اپنے دونوں ہاتھ شمع کے گرد کر دئے اور سوچ رہی تھی کہ ہنوز شمع کو جلنا چاہئے۔ آزادی کے پروانے اڑ اڑ کر قربان ہو رہے تھے کہ شمع کبھی نہ بجھے میں اپنے تخیلات میں جس چھت کے نیچے دراز تھی اندھیرے گوشے سے مردہ روحیں انواع واقسام کی ہیبتناک صورت بنائے آگے بڑھ کر مجھے حیات جاوید کے پیچیدہ مسئلے پر سبق دے رہی تھیں آخر کب تک؟ نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

(۲) دو دن تک مولیمین میں قیام رہا۔ انہیں دنوں میں یہاں کے باشندوں سے ملنا

پانی کا تہوار منایا کچھ عجیب سی دلچسپ رسم ہے۔
ہم لوگ ایک کشادہ سڑک سے جارہے تھے دیکھا لوگ زرق برق لباس پہنے ہجوم کی شکل اختیار کئے ہمارے طرف بڑھ رہے ہیں ہمارے قدم خود بخود رک گئے چاروں طرف سے بارش کی بوچھار ہونے لگی اور ہمارے کپڑے تر بتر ہوگئے اور جسم سے بچا کھچا بھی کچھ شرم ساگئے اس طوفان سے نکل کر چند فرلانگ چلے تھے کہ کسی نے کہا ذرا اپنے تو حضرت نظر اوٹھا کر دیکھا تو پندرہ بیس حسین و جمیل عورتیں پانی کے گھڑے تھامے ہمارے طرف بے تحاشا لپکی چلی آرہی ہیں باوجود اعتذار کے اونہوں نے ایک نہ سنی اور پانی اونڈیلنا شروع کیا۔ یہ تہوار کچھ اس قسم کا ہے کہ مرد اور عورت کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ ہر مرد ہر عورت۔ بچے۔ بوڑھے آزادانہ اس میں شریک رہتے ہیں اگر اس میں کوئی شرکت نہ کرے تو نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اونہوں نے ہم سے بھی درخواست کی اون پر پانی ڈالا جائے چونکہ اس تمام میں سب ہی تر تھے ہم نے بھی اون پر پانی ڈالا پھر کچھ وقفہ کے بعد ہم لوگ ان کے مہمان تھے جہاں کا یہ رسم ہے دس پانچ عورتیں اور اتنے ہی مرد پانی انڈیلتے ہیں اور جب یہ کھیل ختم ہوتا ہے اور تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے اجنبیوں کو اپنے یہاں چاء وغیرہ سے مدارات کرکے رخصت کر دیتے ہیں۔
مجھے اس ملک کا یہ رواج دیکھکر آج ہندوستان کے وہ دن یاد آتے ہیں جہاں ما روشنی کے دہندلے دہندلے سایہ میں ہمارے ہاں ہولی کا تہوار منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کے اختتام پر ایک نمایاں بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ یہاں ایک حسین و جمیل نوجوان بچاری بچہ کو گھوڑے پر بٹھا کر شہر میں گھومایا جاتا ہے اور شب میں مرد اور عورتیں اکٹھا ہوکر گاتے ہیں اور رقص کرتے ہیں یہ رقص اور یہ نغمہ تہوار کی خوشی میں ہوتا ہے کہ تہوار کے دیوتاؤں نے ان کی زندگیوں کی نگہبانی کی ہے۔ (اس رسم کی وجہ تسمیہ آئندہ پڑھیے

برق بہانی بجست باد بہاری تجات طاقت مجنون برفت خیمہ لیلی اگجا ست

صیاد نے کس وقت چمن سے کیا آزاد
شکوہ تھا ہمیں جبکہ لیے بال دپری کا

خیالی جنت

سردار عبدالحمید سالک مقیم کوہاٹ

زندگی کا ناچ بعض مرتبہ کس قدر بھیانک جھنکاریں پیدا کرتا ہے۔ ان کی جھنکار سے امید کی جڑیں ہل جاتی ہیں۔ ان کی جھنکاروں میں آہ و نالے گم ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی انسان چاہتا ہے کہ ناچ کبھی نہ ختم ہونے پائے وہ جانتا ہے کہ۔

زندگی انسان کی اب دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے دم کے سوا کچھ بھی نہیں۔

پھر بھی وہ زندگی کی پیچدار پگڈنڈیوں پر تصور و امید کی دنیا بسائے غم و نا امیدی سے ٹکریں کھاتا گزرنا پسند کرتا ہے۔ جنت کی خوش رنگیاں اس کو ہر شے پر نہیں ملتیں۔ وہ اس فانی دنیا میں اپنی جنت علیحدہ بنانا چاہتا ہے۔ روئے زمین پر چند ہستیاں ایسی بھی نظر آتی ہیں جنکا وجود انسان تو انسان زمین پر بھی گراں گذرتا ہے۔ جن کے ارمان کچلے جاتے ہیں۔ جن کی آرزوئیں رہ ہی جاتی ہیں۔ بھوک مفلسی [illegible] گھیرے تو تبسم ان کے چہروں پر تقسیم کر دیتی ہے۔ لیکن لیکن۔ ان کی آنکھیں پکار پکار کر کہتی ہیں۔

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے۔

انسان فطرت کی بھول بھلیوں میں غلطاں رہتا ہے وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کی جدوجہد اس وقت بھی کرتا ہے جبکہ وہ دنیا کی نیرنگیوں سے گھبرا کر سمندر کی تہہ میں پناہ

لینا چاہتا ہو۔

کہتے ہیں کہ جب انسان ڈوبنے لگتا ہے تو کچھ سہارا نہ پاکر پانی ہی کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ اپنی مٹھیاں بھینچ کر خود اپنی ہی گرفت میں پانی کو پکڑ لیتا ہے۔

یوں تو دنیا کی تمام الجھنوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اس کا دل دنیاوی خیالات کا آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی اس کے فانی ہونے کا خیال کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے انسان عالم جاودانی کے تصور میں گم ہو جاتا ہے فطرت انسانی ہے کہ انسان اپنے ہمیشہ اچھی چیز کا متلاشی رہتا ہے۔ دوزخ کے خیال سے تھوڑی دیر کے لے دل کانپ جاتا ہے پھر "رحمت یہ تیری میرے گناہوں کو ناز ہے" خیال کرکے جنت کا خواستگار ہوتا ہے غالب کہتا ہے کہ:۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

ٹھیک ہی تو کہا ہے غالب۔ کیا فرض ہے کہ خدا تعالیٰ ہر ایک کو ایک ہی سا جواب دے یا ہر ایک کو ایک ہی قسم کی جنت دے۔ کیوں نہ ہم اپنی پسند کی جنت مانگیں۔ اس کا دست کرم تو بہت وسیع ہے۔ مجھے منہ مانگی جنت ملے تو میں ایسی جنت چاہونگی جو عابد و زاہد کی جنت سے مختلف ہوگی۔ ان کی جنت میں ہے ہی کیا۔ مروارید کے محل جو اس نے خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں جسکی زندگی مٹی کے گھروندوں میں گذری ہو اس کو ان محلوں میں کیا آرام میسر آسکتا ہے حقیقی آرام تو اس وقت نصیب ہوتا ہے جبکہ مانوس چیزیں ہوں۔ دودھ کی نہریں چھلکتے طیور۔ شفاف جھیلیں۔ حور غلمان بسلسل سکون۔ ہمیشہ آرام نہ دکھ نہ درد نہ تکلیف تیے زیادہ مٹھاس کڑوا مزہ پیدا کرتی ہے۔ خوشی و رنج کے مدوجزر نہ ہوں تو خود پیدا ہوتا ہے خوشی غم کے بعد بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آرام کا احساس تکلیف کے بعد ہی ہوتا ہے اگر جنت میں غم و تکلیف کی علاوہ خوشی کے ساتھ نہ ہو تو وہ خوشی ہی کیونکر محسوس ہو سکتی ہے مجھے جو جنت ملے اس میں سکھ کے ساتھ دکھ خوشی کے ساتھ غم کی حلاوت رہے تاکہ میں سچی خوشی محسوس کرسکوں مجھے ایسی جنت ملے۔ جس میں داخل ہوتے ہی وہاں کی معطر ہواؤں کے جھونکے میرے دل کو

بغض حسد کے جذبہ سے بالکل پاک کر دیں اگر کوئی جذبہ میرے دل میں موجزن ہو تو وہ جذبہ انسانیت ہو۔ اور یہ جذبہ میرے دل میں برقرار رہے۔ ماں سے بیدار ہے۔ اب میرے دل میں جب بھی جذبہ انسانیت پیدا ہوتا ہے تو بغض حسد کا جذبہ اس پر غالب آجاتا ہے۔ لیکن اس میں میرا قصور نہیں جب میں محض انسانیت کے جذبہ سے متاثر ہوتی ہوں تو اخبار کی سرخیاں مجھے یہ کبھی محسوس ہوتی ہیں کہ انسانیت ہے کہاں دنیا میں۔ پھر میری آنکھوں میں ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد کے واقعات پھرنے لگتے ہیں۔

دنیا بیشک مکر و فریب کی جگہ ہے۔ جہاں امیر و غریب کا امتیاز بدرجہ اتم موجود ہے۔ جہاں دن رات بیکسوں کے دل دبائے جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اسی دنیا سے محبت ہے کیونکہ ہماری تمام یادیں اسی سے وابستہ رہتی ہیں۔ جنت میں یہ بھی یہ خواہش پوری ہو کہ جب میں چاہوں اس جگہ کو دیکھ سکوں جہاں میں نے اپنی زندگی کی گھڑیاں بتائی ہیں۔ میری خواہش ہوگی کہ میں ان لوگوں کو بھی دیکھ سکوں جو میرے دکھ درد کے ساتھی تھے اور ان کو بھی دیکھ سکوں جو میرے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے مجھے ان سب کے دلوں کا حال معلوم ہو جائے کہ حقیقت میں میرا دوست کون تھا۔

جنت میں میری کتابیں ضرور ہوں اسکے علاوہ اور بہترین پڑھنے کو ملیں۔ میں آرام سے پڑھ سکوں۔ سمجھ سکوں، کہ گاندھی جی عدم تشدد کا پیغام دیتے ہوئے تشدد کا نشانہ کیوں بنے اقبال۔ محمد علی۔ کرشن چندر۔ جوش۔ ٹیگور نے انسانیت کا جو پیغام دیا اس کا انسانیت پر کیا اثر ہوا۔ ۔

۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاش یہ مجھے میری سمجھ میں آجائیں جنکو حل کرنے سے بڑی بڑی ہستیاں ناکام رہیں۔ غالب نے کہا تھا کہ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے۔ مجھے بھی جنت کی معصوم فضاؤں کے تلے دنیا کی جھلک نظر آتی رہے۔ میری جنت کا وہ حصہ جہاں میں رہوں الگ تھلگ نہ ہو بلکہ ایسی جگہ ہو جہاں پر ہر مذہب کے لوگوں سے مل سکوں کبھی کبھار دنیا کی باتیں کر سکوں۔ لیکن اس جگہ وہ لوگ داخل نہ ہو سکیں جو طعن کا

چھوٹا سا نشتر لیکن زہر میں بجھا ہوا چبھنے سے دل میں چھوڑ دیتے ہیں۔ جس کی کسک۔ جذبہ انتقام کو
ابھارتی ہے۔ میری جنت حسین حوروں سے معمور رہے۔ طیور اپنے راگ سنائیں لیکن ہمیشہ نہیں
حوریں میرا کام انجام دیں۔ لیکن کبھی کبھی تو تغافل سے بھی کام لیں کہ مجھے بھی اپنا کام کرنا پڑے۔ سنتے
ہیں کہ جنت میں درختوں سے میوے لدے رہینگے لیکن خواہش نہ ہوگی۔ ہر قسم کے آرام و آسائش
کی چیزیں ہونگی لیکن رغبت نہ ہوگی لیکن میرے دل میں ان کے کھانے کی خواہش رہے آرام
و آسائش کی چیزوں سے میں لطف اندوز ہو سکوں۔ میرے کان میٹھے میٹھے راگ سنتے
ہوئے کبھی غم کی صدا بھی سن سکیں تاکہ خوشی کے راگ سننے کا جذبہ بھڑک اُٹھے۔

دنیا میں جب تک رہتے ہیں رسم و رواج کی بندشوں میں جکڑے رہتے آزادی کا
نعرہ صرف ہوا میں ایک لہر پیدا کر دیتا ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اپنی خوشی آزادی سے
ایک کام بھی انجام نہیں دے۔ وہی کرتے ہیں جو دوسروں کے اشارے کے مطابق ہوتا ہے۔
جب ہمارے ہر فعل پر کسی نہ کسی کی آنکھ لگی رہتی ہے جنت میں میرا کوئی نگراں نہ ہو۔ میں جو چاہوں وہ
کرسکوں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہاں بھی شاید آزادی نہ ملے۔ کیونکہ وہاں بھی تو جناب رضوان
موجود ہیں۔ رضوان کی ضرورت ہی کیا ہے آخر۔ کیا عالم بالا پر بھی انسان کسی نگران کا مطیع
رہے مجھے رضوان کی ضرورت نہیں۔ نہ میری جنت کا دروازہ رہے نہ رضوان اس
کی نگرانی کرے۔ بلکہ جو چاہے آکر میری جنت کو بلا روک ٹوک دیکھ سکتے ہیں آزادی
آزادی سے آجا سکوں۔ اگر ایسی جنت میں جائے تو شاید عالم بالا پر بھی لوگ
میری قسمت پر رشک کریں۔

امن و آشتی سے رہنا ہمارا اولین فرض ہے

منیرہ بانو کاؤس جی - ایم - اے

انسان غلطیوں - کمزوریوں اور لغزشوں کا مجموعہ ہے - ہر گھڑی ہر لمحہ اس سے غلطی کمزوری کا ارتکاب ہو سکتا ہے - لیکن صانع قدرت نے جہاں اس کو کمزوریوں اور غلطیوں کا حامل بنایا ہے وہاں اُسے فہم و ادراک بھی ارزانی فرمایا ہے کہ ایک دفعہ غلطی کا مرتکب ہونے کا بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور جونہی یہ احساس پیدا ہوتا ہے وہ اصلاح و ترمیم کی طرف گامزن نظر آتا ہے ایسی غلطی نظر انداز کی جا سکتی ہے .... قابل معافی ہوتی ہے -

لیکن قابل افسوس نکتہ یہ ہے کہ ہر انسان اس احساس لطیف سے نوازا نہیں گیا ہے ایسی صورت میں اُسے تنبیہ کی ضرورت ہوتی ہے - اور جب وہ ہر وقت متنبہ نہیں کیا جاتا بلکہ کسی وجہ سے اس کی غلطیوں پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے تو اُسے اپنے مصائب بھی محاسن نظر آنے لگتے ہیں اور انجام کار وہ ان غلطیوں اور لغزشوں کا اسقدر عادی ہو جاتا ہے کہ غلطی کا احساس جو ہر وقت تنبیہ سے بیدار کیا جا سکتا ہے - اُٹھ جاتا ہے .... جب انسان اس قابل لغزش منزل میں قدم رکھتا ہے تو وہ اپنے لئے باعث ذلت اوروں کے لئے وبال جان بلکہ زمین کی پیٹھ کا بار بن جاتا ہے ....

اور ... اگر سوء اتفاق سے اُسے کوئی بڑا عہدہ نصیب ہو جاتا ہے تو وہ اپنے غیر مناسب حرکات سے سینکڑوں کو نقصان پہنچاتا ہے - ہزاروں کی دل آزاری کرتا ہے لاکھوں کا کے لئے سنگ راہ بن جاتا ہے - غلطیوں کے احساس کے ساتھ اس کے نفس کی

آواز بھی مفقود ہو جاتی ہے۔

غلطی کے ارتکاب کے بعد احساسِ غلطی کی بیداری انسان کو ایک بلند مرتبہ پہ پہنچاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غلطی کے بعد احساسِ غلطی کا فقدان انسان کو قعرِ مذلت میں جھونک دیتا [illegible]

اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان اپنی [illegible]ت کی جانچ آپ نہیں کر سکتا وہ کم سن ہے، کم سمجھ ہے، نا قابل ہے، اس میں صلاحیت نہیں، اس میں سلیقہ نہیں، اس میں ذمہ داری کا احساس نہیں، لیکن چاہتا ہے کہ کرسیٔ صدارت پر بیٹھ جائے، کچھ خوبیٔ قسمت، کچھ جد و جہد، کچھ چکنی چپڑی باتیں، کچھ خاندانی تعلقات، کچھ سفارشیں، کچھ تصدیق نامے، کچھ صداقت نامے ۔ ۔ ۔ بس یہی ایسے ایک اونچی جگہ پر پہنچا دیتے ہیں، اور پہنچتے ہی وہ سمجھنے لگتا ہے کہ جسقدر بڑی میری جگہ ہے، میری کرسی ہے، اسیقدر بڑا میں ہوں، نظر بس آگے کی طرف رکھتا ہے کہ اس سے بھی بہتر کرسی، اعلیٰ مقام، مل جائے تو بیٹھ جائے صرف بیٹھ جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ کسقدر بڑی غلطی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ناانصافی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جرم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بھلا اونچی جگہ پر بیٹھنے سے بھی کہیں انسان بڑا ہو سکتا ہے !! لیکن ۔ ۔ ۔ چونکہ مقام ہے، اعلیٰ، کرسی ہے دہشت خیز، کوئی اللہ کا بندہ اسے یہ کہنے کی جراءت نہیں کرتا کہ بابا! تو بڑا نہیں، تیری کرسی بڑی ہے، تو اس کرسی کے لئے زیبا نہیں، تیرا حال ویسا ہی ہے کہ ایک نادان، معصوم بچہ، جس نے ابھی ابھی چلنا سیکھا ہو، اپنے باپ کا جوتا کہیں پڑا پاتا ہے اور اپنا پیر اس میں ڈال دیتا ہے اس کے لبوں پر فاتحانہ تبسم جھلکتا ہوا نظر آتا ہے، اور پرمسرت لہجہ میں باپ سے مخاطب ہوتا ہے، "ابا دیکھئے، میرا ۔ ۔ پیر ۔ آ ۔ گیا ۔ جوتا ۔ چلا گیا، میں بھی آپ ۔ ۔ ۔ جیسا ۔ ۔ ۔ ۔ بہت بڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو گیا" ۔ ۔

لیکن باپ آخر باپ ہی ہے، ماتحت، غریب، ماتحت، انہیں اپنے برخوردار
کہتا ہے، پیر تو تمہارا میرے جوتے میں چلا گیا لیکن پیچھے مڑ کر تو دیکھو،
جو جگہ باقی رہ گئی ہے، اس کا کیا حساب ؟ بچہ پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے تو
اُسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور پیر، بلکہ اس سے بھی زیادہ، جگہ خالی ہے
مسکراتا ہے۔ لیکن گرتا پڑتا چلنا شروع کرتا ہے اور سب کی ہنسی کا
نشانہ بن جاتا ہے، باپ اس خیال سے کہ بچہ کہیں گر نہ پڑے کہتا ہے:
بیٹیا! ہم یہ جوتا آپ کے لئے اٹھا رکھیں گے، آپ اپنے پیر کو بڑا ہونے کا
موقع دو، تب پہننا۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت تمہیں جوتا تلاش کرنے کی بھی
ضرورت نہ ہوگی، جوتا خود تمہیں تلاش کرتا ہوا آئیگا!!۔
خوش قسمتی۔۔۔۔۔۔ حسن اتفاق۔۔۔۔۔۔ اگر ہمیں ایک
بلند مقام پر پہنچا دیں تو ہم بڑے نہیں کہلا سکتے۔۔۔۔۔ بلند مقام پر
پہنچنے سے قبل ہم کو چاہیئے کہ ہم اپنے آپ کو اس کے قابل بنا لیں، اور پھر
وہاں تک پہنچنے کی کوشش کریں، اگر ماحول قدر شناس ہے، تو جدوجہد
کی بھی ضرورت نہیں، مقام خود تمہیں چیخ چیخ کر بلائے گا، دعوت دیگا۔
۔۔۔۔۔ لیکن جب کوئی خوش قسمت صاحب اپنا پُر آب و تاب مقدمہ
لئے وہاں پہنچ چکے ہیں تو پھر آپ کی محنت رائیگاں، اور آپ کی قابلیت
بلائے جان!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

زمانہ قدیم کے علماء اور پیشوایان دین اپنی چند سالہ خدمت مخلوق کی
کی تیاری کے لئے، برسہا برس کی ریاضت میں مستغرق و منہمک رہے
اس کے بعد جو مثال انہوں نے دنیا کے سامنے پیش کی وہ زندہ جاوید ہے۔
کسی نے ان کی سفارش نہیں کی تھی، اُن کے پاس صداقت نامے نہیں
تھے،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صداقت نامہ تو ایک بولتا کاغذ کا ٹکڑا ہے،
جو آپ نہیں کر سکتے۔ نہیں کہہ سکتے، وہ کرتا بھی ہے، کہتا بھی ہے، اور

پھر خاموش بھی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ سفارشیں یہ صداقت نامے جو انسان کو مقام اعلیٰ پر پہنچا دیتے ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی ہم سے بیزار ہے، پنڈ چھڑانا چاہتا ہے، اور چکنی چپڑی باتوں سے اپنی بلا کسی کے سر تھوپ دیتا ہے ؟

انسان کو اس کے اعمال بڑا بناتے ہیں، مقام اعلیٰ پر ایک نااہل کی نشست، ہزار ہا برائیوں، ہزار ہا کمزوریوں کی جڑ ہوتی ہے، زینہ پر چڑھنے سے پہلے دیکھ لو آیا آپ کے پیر اس قدر مضبوط، اس قدر مستحکم ہیں کہ آخر سیڑھی تک پہنچ سکو گے !!!۔

سوز و ساز

عائشہ نکہت ایم بی سی۔ آفریدی

سوز غم سے ہو رہا ہے دل مرا پھر داغدار
اے صیاد جو تو بھی آئی غم کا اک پہلو سنوار
ڈھونڈ کر ہر طرف خاموش ہیں آنکھیں مری
کیوں نہ ملجائے مجھے قلب حزیں اے سازگار
منتظر یہ بات ہی ہے پیش نظر چاروں طرف
جا بجا کر یہی ہے تجسس الفت سے گذر۔ سے خار دار
زندگی ہے موت کی سی ہچکیاں پیدا ہوئیں
پھول میں کیسے مہکتے دیکھکر یہ انتشار
غیر کے آگے کہوں کیا ہم تو بے جاں جال ل
قصہ اپنا مختصر ہے طول ہے لیل و نہار
ہے چمن میں پھر وہی سبزہ و شادابیاں
پھر نہیں ہے وہ سکون نکہت گل بے قرار

حیاتِ جاوید

راشدہ نصیر شبیر فاطمہ

جگہ جی لینے کی دنیا نہیں ہے۔
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

دنیا کا تخیل ہر دماغ میں ایک نرالا نظر آتا ہے کسی کی دنیا حسرتوں کی تکمیل اور کسی کی دنیا توقعات اور امیدوں کی تعمیر پر موقوف ہے کسی کے جذبات کا دریا چڑھاؤ اور اوس کی رو میں موج زن ہے اُس کی دنیا کی تعمیر پر ترتیب ہوتی ہے اسیطرح ہر شخص کی دنیا اس کے خیالات کے لحاظ سے رنگین بھی ہے اور تاریک بھی بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی دنیا کا آپ معمار ہے۔

لیکن فکر و عمل سے کام لینے کے بعد تصورات کی دنیا سے عملی دنیا میں قدم رکھا جاتا ہے بیان کردہ دنیا کے تصورات سے ہم ایک ایسی دنیا کی تعمیر کو نہ صرف اپنے لئے بلکہ نوع انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ جس میں انسانی صلاح و فلاح کی غالب پہلو موجود رہے۔ یہیں سے دنیا کی تعمیر شروع ہوتی ہے۔ جو کسی فرد واحد کے معدوم ہونے سے متزلزل نہیں ہوتی اور یہ وہ دنیا نہیں جو کسی معمولی دماغ کے انسان کی پیداوار کا نتیجہ ہو۔ جن لوگوں نے ایسی دنیا کی تعمیر کی ہے وہ تو چل بسے مگر وہ دنیا اینک آباد ہے اور اپنی کوشش سے اس دنیا کے باغ سدا بہار کو خزاں رسیدگی سے نقصان پہونچا نہیں سکتے مثال کے طور پر سنا ہیں قدم کی بسائی ہوئی دنیا ابدالآباد تک آباد رہتی ہے جو تنکا کی مدد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔

رجسٹرڈ آصفیہ (۲۲۲)
۳۴
ہمارا نشان امتیاز
فون ۲۸۷۲
مرغوب ترین غذاؤں کا اعلیٰ ترین مرکز
مسرت گاہ
اہل ذوق حضرات کے لیے ہر وقت نفیس ترین غذائیں پیش کرتا ہے
جہاں
ہمہ اقسام کی غذائیں از قسم
مرغ۔ تیتر۔ بریانی۔ اور دیگر لوازمات کے علاوہ عمدہ سے عمدہ میٹھے مہیا کیے جاتے ہیں آئیے یہ بہترین تفریح گاہ
مسرت گاہ (افضل گنج حیدرآباد دکن)
مالک مسرت گاہ۔ محمد ضیاء الدین خاں